نازیہ کنول نازی

# خواب نگر کی مسافتیں



# محبت کی دیوی نازیہ کنول نازی

ادبی دنیا میں نازیہ کنول نازی کا بنیادی موضوع "محبت" ہے۔ شاعری کی دنیا ہو یا ناول نگاری کا میدان وہ اپنی ہر ہر تحریر میں ہر بار محبت کا ایک نیاء انداز متعارف کروانے میں مصروف دیکھائی دیتی ہے۔ چھوٹی سی عمر میں نازیہ کنول نازی نے درد کے ایسے ایسے پہلوؤں کی باریک بینی سے نقاب کشائی کی ہے کہ عقل وجدان اس کی ذہانت اور مشاہدے کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ظاہری اور باطنی حسن میں اپنا کوئی ثانی نہ رکھنے والی نازیہ کنول نازی اسی معاشرے میں بکھرے ان گنت گھمبیر مسائل پر اتنی خوبصورتی سے گرفت پا کر انہیں احاطہ تحریر میں لاتی ہے کہ پڑھنے والا اس کے الفاظ کی خوبصورتی میں گم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بہت عرصے سے میری خواہش تھی کہ کاش مجھے اس احساس شاعرہ اور قلمکارہ کے طرز تحریر پر اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملے۔ تو میں وہ ساری سوچ صفحہ قرطاس پر بکھیروں جو اس کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے میرے ذہن میں پرورش پاتی ہے اور آج نازیہ کی محبت نے مجھے وہ موقع دیا ہے تو میں اس کی تحریریں پڑھنے والے قارئین سے اپنی وہ سوچ شیئر کرنے میں گہری طمانیت محسوس کر رہا ہوں۔

"تو بھی غبارہ راہ تھا" نازیہ کنول نازی کی روائیتی کہانیوں میں اپنا ایک منفرد انداز چھلکاتا وہ خوبصورت ناول ہے کہ جس کا اختتام یقیناً اس کے پڑھنے والوں کا دل اپنی گرفت میں جکڑے گا۔ محبت کے حقیقی رنگوں کی عکاسی کرتا یہ ناول اس قابل ہے اس کی دل کھول کر جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

اسی ناول کا ایک حصہ "محبت اِک سلگتی شام" کے عنوان سے متعدد بار پاکستان اور

ہمسایہ ملک بھارت میں شائع ہونے کے باوجود تا حال اپنی عہد ساز خوبصورتی اور دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ سیدھی سادھی محبت کے خاص رنگوں کو جس معصومیت اور باریک بینی کے ساتھ قلم بند کیا ہے وہ اسی کا خاصا ہے۔ اس ناول میں آپ کو محبت کے دو پہلے حسین خوابوں کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اس کے روایتی دکھ دینے والے انجام کا احوال بھی پڑھنے کو ملے گا۔ میرا یہی کہنا ہے کہ محبت کرنے والوں کے لیے نازیہ کنول نازی کا یہ ناول کسی تحفے سے کم نہیں۔

محبت میں عاجزی چلتی ہے مگر سچی محبت کا دعویٰ کرنے والے جان بوجھ کر غلط راستے پر بھٹک جائیں تو محبت ان پر اپنے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیتی ہے اور پھر دل کبھی نہ ختم ہونے والی کسک میں کیسے جکڑتے ہیں اس کا احوال ''خواب نگر کی مسافتیں'' تک پہنچ کر آپ جان پائیں گے۔

قصہ مختصر کہ نازیہ کنول نازی جسے شاعرۂ درد اور شاعرۂ محبت کے لقب سے لکھا اور پکارہ جاتا ہے۔ اپنی اس تخلیق میں جسے اس نے ''خواب نگر کی مسافتیں'' کا عنوان دیا ہے۔ محبت کے مختلف اور منفرد رنگوں کو بڑے احسن انداز میں اپنے قارئین سے شیئر کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ یقیناً یہ کتاب اس کے عروج میں مزید اضافے کا باعث بنے گی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد نا صرف نازیہ کے پڑھنے والوں میں اس کی مقبولیت کا گراف بلند ہوگا بلکہ ادبی اداروں میں بھی اس کے نام و کلام اور مقام کی مانگ بڑھے گی۔ (انشاءاللہ)

**محمد ندیم عابد**
ہارون آباد



# اظہارِ رائے

نازیہ کنول نازی ایک جواں سال، متحرک اور پُر اُمید لکھاری ہے۔ اُس کی تحریریں نوجوان ذہنوں کو خوش اُمیدی کی پُر اُمنگ پرواز دیتی ہیں تو دوسری طرف حقائق زندگانی سے بھی آگاہ کرتی ہیں۔

اُس کی تحریروں میں کہیں کہیں تخیلات کی پرواز اتنی اُونچی ہو جاتی ہے کہ قاری ایک سحر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور وہ غیر ارادی طور پر ''بال و پر'' حاصل کرنے کی خواہش کرنے لگتا ہے۔

مگر دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نازیہ کے قلم سے نکلی تحریریں محض سرسری بھی معلوم دیتی ہیں بالخصوص اُن قارئین کے لیے جو افسانوی طرز تحریر کی نفی کرتے ہیں۔ نازیہ کا موجودہ ناول اس کے مزاج کے اسی اُتار چڑھاؤ کا آئینہ دار ہے۔ اگر ایک طرف نوجوان دلوں کی من موہنی خلوص بھری محبت دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف اسی معاشرے میں بسنے والے ''چالاک و ہوشیار'' ذہنوں کی نشاندہی بھی ہے۔

نازیہ کنول نازی کا آغازِ سفر بہت روشن تھا، روشن تر ہے اور انشاءاللہ اسی کی محنت، لگن، خلوص اور قدر دانوں کی پذیرائی سے روشن ترین ہو جائے گا۔

آخر میں ان صفحات کے توسط سے دیگر قارئین سے بھی یہی کہوں گی کہ پڑھنے

پڑھانے اور لکھنے لکھانے کی ترویج و پذیرائی میں برابر کے حصہ دار بنے رہنے.....تفریحی، علمی، ادبی اور اصلاحی مواد کو فروغ دینے میں اپنا کردار ادا کیجیے۔ اس معاشرے کو بلاشبہ عمدہ قلمکار کے ساتھ ساتھ عمدہ اور باذوق قارئین کی ازحد ضرورت ہے۔

نیک تمناؤں اور ڈھیروں دُعاؤں کے ساتھ.....

نزہت اصغر

(مدیرہ، دلکش)



# خواب نگر کی مسافتیں

ہر بات جانتے ہوئے دل مانتا نہ تھا
ہم جانے اعتبار کے کس مرحلے میں تھے
ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

شام خاصی گہری ہو چکی تھی جب اس نے تھکے تھکے سے قدم گھر کی دہلیز پر رکھے تھے۔ سامنے وسیع لاؤنج، کچن اور اس کا بیڈ روم خالی پڑا تھا۔ وہ سست روی سے چلتا کچن میں آیا تو صبح کا بکھرا ہوا سامان جوں کا توں پڑا دکھائی دیا۔ صبح جس کپ میں اس نے چائے پی تھی وہ کپ بھی اسی حال میں ٹیبل پر پڑا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

پچھلے دو روز سے اس نے اخبار میں گھریلو ملازمہ کے لیے اشتہار دیا ہوا تھا اور اس سلسلے میں کئی خواتین نے اس سے رابطہ بھی کیا تھا مگر.....اب تک کوئی بھی اس کی نگاہ میں جچ نہیں سکی تھی۔ شاید اسی وجہ سے وہ جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔

''جاہل! ضدی عورت خود کو پتہ نہیں کیا سمجھتی ہے؟ میں جیسے جی نہیں سکوں گا اس کے بغیر.....'' کپ اٹھا کر زور سے دیوار پر مارتے ہوئے وہ بڑبڑایا تھا۔

صبح سے اس نے چائے کا صرف ایک کپ پی رکھا تھا۔ آفس میں بھی کچھ کھانے کو دل نہیں چاہا تھا۔ سر درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ لہٰذا اس نے ایک کپ چائے پھر سے

اپنے لیے تیار کی اور لاؤنج میں ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا۔ جانے کون سا چینل لگا تھا۔ اس کی نگاہیں ضرور ٹی وی اسکرین پر تھیں مگر ذہن بھٹک رہا تھا۔

''ٹرن' ٹرن' ٹرن......'' فون کی تیز بجتی ہوئی بیل نے اس کا انہماک توڑا تو وہ فوراً چونکتے ہوئے فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک لمحے میں دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی تھیں مگر سی۔ ایل۔ آئی پر نمبر دیکھنے کے بعد وہ مایوس ہو گیا تھا۔ فون بڑی آپا کے گھر سے تھا۔

''ہیلو......'' قدرے بوجھل آواز میں کال ریسیو کرتے ہوئے اس نے کہا تو بڑی آپا حلاوت سے گویا ہوئیں۔

''اذان سو گیا ہے عازی! اس کی طرف سے پریشان مت ہونا اور اپنا خیال رکھنا۔ او کے۔''

''تھینک یو بڑی آپا! صبح آفس سے فارغ ہو کر اسے ساتھ گھر لے آؤں گا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔ منزہ کا پتہ کرتے رہنا۔''

''جی......'' فرماں برداری سے کہنے کے ساتھ ہی اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہ لاؤنج سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم کی طرف آیا تو اس کا حال لاؤنج سے بھی ابتر ملا۔ بیڈ پر صبح والے میلے کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ الماری میں رکھی تمام چیزیں بے ترتیب پڑی منہ چڑا رہی تھیں۔ استعمال شدہ گیلا تولیہ جسے وہ صبح لیٹ بیدار ہونے کے باعث افراتفری میں یوں ہی صوفے پر پھینک گیا تھا۔ وہیں پڑا اپنی بے قدری پر احتجاج کر رہا تھا۔ پورے کمرے میں بکھری بے ترتیب چیزوں کا تماشہ دیکھنے والا تھا۔ وہ چونکہ اعصابی طور پر تھکا ہوا تھا لہٰذا یوں ہی ہر چیز سے نگاہیں چرائے بیڈ پر ڈھے گیا۔

''نہیں آتی تو نہ آئے۔ مجھے کوئی کمی نہیں ہے لڑکیوں کی۔ ایک سے بڑھ کر ایک مل جائے گی۔ دوسری شادی کر لوں گا تو پتہ چلے گا محترمہ کو ساری اکڑ ناک کے بل نہ نکل جائے تو میرا نام بھی عضنان احمد نہیں......''

شدید منفی سوچ کا شکار ہو کر اس نے جیسے اپنے اندر جلتی آگ پر پانی ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر دل اور بھی بے چین ہو گیا تھا۔ کسی کروٹ قرار نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ منزہ افتخار کے ساتھ اس کی لو میرج ہوئی تھی۔ یونیورسٹی پیریڈ میں ہی دونوں کا افیئر چلا اور عضنان نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے پرپوز کیا تاہم منزہ کے گھر والوں نے یہ کہہ کر کہ ان کے



ہاں خاندان سے باہر شادی نہیں کی جاتی اس کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔

عضنان کو یوں اپنے رشتے سے انکار اپنی توہین لگا تھا۔ لہٰذا اس نے منزہ سے شادی کو اپنی ضد بناتے ہوئے اسے جذباتی بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔ منزہ خود بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی لہٰذا ایک روز شدید جذباتیت کا شکار ہوتے ہوئے اس نے والدین کی عزت کو محبوب کی محبت پر قربان کر دیا اور عضنان کا ہاتھ تھام کر ہمیشہ کے لیے اپنے بابل کی دہلیز کو پار کر آئی۔

عضنان نے بھی ایسے ہی کیا تھا۔ اپنی ضد بھری محبت کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے اسے بھی اپنے باپ کے گھر سے دربدر ہونا پڑا تھا۔ تاہم اس کے باوجود دونوں خوش اور مطمئن تھے۔ شادی کے ابتدائی دن جیسے کسی خواب کی سی کیفیت میں بسر ہوئے تھے۔ بے شک عضنان بے حد محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ منزہ اس کی رفاقت میں بے حد خوش تھی۔

اس نے بھی خود کو ایک ذمہ دار اور سگھڑ بیوی ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں اولاد جیسی نعمت بھی عطا کر دی تھی۔ اذان کی پیدائش کے بعد عضنان کی وارفتگیوں میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ وہ جب تک گھر میں رہتا منزہ کو نگاہوں کے سامنے رکھتا اور گھر سے باہر ہوتا تو بار بار کال کر کے اس کا حال دریافت کرتا رہتا۔ اس کی یہ دیوانہ وار محبت تھی۔ جس میں کھو کر وہ والدین سے جدائی کے غم کو ہمت سے پی گئی تھی۔

منزہ کا مزاج تھوڑا مذہبی تھا۔ تاہم عضنان کا نماز روزے سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اس کا تعلق بھی ان ہی لوگوں میں سے تھا جو صرف نام کے مسلمان ہوتے ہیں۔ رات کو دیر تک جاگنا اور صبح آفس ٹائم سے آدھا گھنٹہ پہلے اس نے اپنا معمول بنا رکھا۔ منزہ نے اسے راہِ راست پر لانے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ اس کی ہدایتوں اور نصیحتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتا تھا۔

دونوں میاں بیوی کے درمیان پہلا جھگڑا اذان کی سالگرہ کے روز ہوا تھا۔ بات بے حد معمولی تھی مگر بڑھ کر لمبی ہو گئی تھی۔

عضنان اپنے بیٹے کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنے تمام دوستوں کے ساتھ ساتھ آفس کے اسٹاف کو بھی بلانا چاہتا تھا جب کہ منزہ چاہتی تھی کہ اس پہلی تقریب میں اس کے صرف چند خاص خاص دوست ہی اپنی بیگمات کے ساتھ شامل ہو جائیں کیونکہ عضنان کا ہاتھ تنگ تھا اور وہ کسی قسم کا قرض لینے کا متحمل نہیں تھی۔ اسی بات پر دونوں کے بیچ جھگڑا ہوا۔ جس

کا اختتام اس نتیجے پر ہوا کہ عضنان نے اس کی طرف سے مکمل لاتعلقی اختیار کر لی تھی۔ منزہ کے ساتھ بیڈ روم میں سونے کی بجائے اس نے سائیڈ روم میں اپنا بستر لگا لیا تھا۔ اذان کی سالگرہ دونوں کے اسی فضول جھگڑے کی نذر ہو کر بنا منائے ہی گزر گئی۔ پورے تین روز تک دنوں نے ایک دوسرے سے بات چیت بھی بند کیے رکھی۔

اس نام نہاد جنگ کا اختتام بالآخر منزہ کی ہار پر ہی ہوا تھا کیونکہ وہ عضنان سے زیادہ دن ناراض نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے سوا زندگی میں اب اور کوئی رشتہ بھی تو نہیں رہا تھا۔ ادھر خود عضنان کی بھی بس ہو چکی تھی مگر مرد ہونے کے زعم میں جھکنا گوارا نہیں کیا۔ اس پہلی صلح میں منزہ نے روتے ہوئے اپنا گال عضنان کے پاؤں پر دھر کر سوری کی تھی اور وہ اس کے اس انداز پر جی جان سے فدا ہو کر رہ گیا تھا۔ منزہ سے یہ دکھ برداشت ہی نہیں ہو رہا تھا جس کے لیے وہ اپنا سب کچھ ختم کر آئی تھی اسے اس کی پرواہ ہی نہیں۔ اس کے معصوم دل سے زیادہ اپنی اناء عزیز ہے۔ تاہم بعد میں بے تاب عضنان نے جو اس پر اپنی بے تحاشہ محبت کی برسات کی تو اس برسات میں پور پور بھیگنے کے بعد اس کا دل یوں دھل کر صاف ہو گیا کہ ہر خطاء اپنی ہی نظر آنے لگی۔ من میں عضنان کے لیے کوئی گلہ کوئی رنجش باقی نہ رہی۔

اگلے دو تین ماہ پھر بڑے پُرسحر ماحول میں بسر ہوئے۔

عضنان سرِ شام ہی آفس سے نکل کر سیدھا گھر کی راہ لیتا تو آگے منزہ سجی سنوری اس کے استقبال کو موجود ہوتی۔ وہ جیسے ہی گھر کی دہلیز پر قدم رکھتا منزہ لپک کر اس کے ہاتھ سے بریف کیس لیتی پھر اس کا کوٹ اتار کر ہینگر کرتی۔ عضنان اس کی پیشانی پر مہرِ محبت ثبت کرتا تو اس کے اندر ایک نئی توانائی دوڑ جاتی۔ جب تک وہ فریش ہو کر واش روم سے باہر آتا وہ گرما گرم چائے کے دو کپ تیار کر کے لے آتی اور یوں دونوں مل کر ایک دوسرے کے ساتھ چائے پیتے۔ کبھی عضنان زبردستی اس کا کپ چھین کر اس کی جوٹھی چائے پی لیتا تو کبھی منزہ یہی عمل دہراتی۔ اردگرد رہنے والے لوگ ان کی محبت پر رشک کرتے تھے۔

منزہ کا شمار ان بیویوں میں کیا جا سکتا تھا جو اپنے دم سے گھر جنت بنا دیا کرتی ہیں۔ اس کی طبیعت میں بے حد نفاست تھی۔ عضنان جتنا لاپرواہ تھا وہ اتنی ہی ذمہ دار تھی۔ ہر چیز کو اس کے ٹھکانے پر رکھتی۔ پورا گھر شیشے کی مانند جگمگاتا دکھائی دیتا تھا۔ اکثر اسے چڑانے کے لیے عضنان گیلا تولیہ بیڈ یا صوفے پر پھینک دیتا، اپنے جوتے اور موزے پاؤں کی قید سے



آزاد کر کے اردگرد قالین پر ڈال دیتا، چائے کا خالی کپ یا خالی پلیٹ جہاں بیٹھ کر کھا رہا ہوتا وہیں رکھ کر چلا جاتا۔

منزہ اس کی ان لاپروائیوں پر شدید کڑھتے ہوئے اس سے الجھ پڑتی تھی۔ کبھی وہ کچن میں مصروف ہوتی اور عضنان کو آفس سے دیر ہو رہی ہوتی تو وہ وارڈ روب کھول کر اپنی مطلوبہ شرٹ کی تلاش میں سارے کپڑے اتھل پتھل کر کے رکھ دیتا، کبھی اپنی مطلوبہ کتاب نہ ملنے پر ساری کتابیں ٹیبل پر بکھیر دیتا۔ اکثر وہ روہانسی ہو کر سچ مچ رو پڑتی تو عضنان فوراً مسکرا کر سوری کر لیتا اور وہ دل کی ایسی سادہ تھی کہ سب کچھ بھلا کر اسی لمحے اسے معاف کر دیتی۔

دونوں کی خوشگوار زندگی میں دوسرے بڑے جھگڑے کا آغاز پہلے جھگڑے سے ٹھیک چار ماہ کے بعد ہوا تھا۔ اس بار اگر بات معمولی نہیں تھی تو زیادہ غیر معمولی بھی نہیں تھی۔ اس روز بارش ہوئی تھی۔ اذان منزہ سے آنکھ بچا کر بہت دیر تک صحن میں بیٹھا پانی سے کھیلتا رہا تھا۔ اسے غصہ تو بہت آیا تھا مگر اتنے چھوٹے بچے کو ڈانٹنا بھی گوارا نہ ہوا۔ لہٰذا اسے صاف پانی سے نہلا کر کپڑے بدلوانے کے بعد دودھ پلا کر سلا دیا۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں بارش میں بھیگنا اذان کو تیز بخار میں مبتلا کر دے گا۔ شام تک وہ سویا رہا اور منزہ اس کی طرف سے بے فکر ہو کر اپنے کاموں میں جتی رہی۔ شام کے بعد موسم کے تیور مزید جارحانہ ہو گئے تو لائٹ بھی چلی گئی۔ وہ ہمیشہ سے طوفانی موسم سے خوف زدہ رہی تھی۔ چمکتی گرجتی بجلی اس کے حواس معطل کر کے رکھ دیتی تھی۔

اس وقت بھی سہم کر وہ اپنے بیڈ روم میں آئی تو اذان تیز بخار میں جل رہا تھا۔ عضنان عموماً اس ٹائم تک گھر آ جایا کرتا تھا۔ ایک تو خراب موسم اوپر سے اذان کے تیز بخار کے باعث اُس نے عضنان کے سیل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار آف ملا۔ اذان نیند سے بیدار ہو کر رونا شروع ہوا تو پھر کسی طور سے چپ ہونے کا نام نہ لیا۔ آس پڑوس سے اس کی شناسائی نہیں تھی۔ ہوتی بھی تو اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ کمرے سے باہر نکل جاتی۔

ایک ایک لمحہ جیسے اس پر عذاب بن کر اتر رہا تھا۔ بے بسی کے شدید احساس سے مغلوب ہو کر وہ رو پڑی تھی۔ عضنان اس رات بہت لیٹ گھر آیا تھا۔ تب تک موسم نارمل ہو چکا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو منزہ شدید غصے میں اس سے الجھے بغیر نہ رہ سکی۔

''کہاں تھے تم اب تک؟ یہ کوئی وقت ہے گھر آنے کا؟''

وہ اس کی ناراضگی کی توقع کر رہا تھا۔ تب ہی مسکرا کر بولا۔

''سوری یار! ایک آفس کولیگ کو ڈراپ کرنے کی ذمہ داری باس نے میرے سر ڈال دی تو نہ چاہتے ہوئے بھی آفس کے بعد یہ فریضہ سرانجام دینا پڑا۔

کولیگ کے گھر ہی تھا جب بارش شروع ہو گئی لہٰذا اس کے گھر والوں نے اٹھنے ہی نہیں دیا۔ سیل میں چارج نہیں تھی لہٰذا تمہیں فون بھی نہیں کر سکتا تھا چلو اب غصہ تھوک دو۔'' دوستانہ انداز میں وضاحت پیش کر کے جونہی وہ اس کے قریب ہوا منزہ نے تنفر سے اسے پرے دھکیل دیا۔

''دور ہو جائیے مجھ سے۔ میرا بچہ اس وقت تیز بخار میں جل رہا ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' محبتوں کے معاملے میں وہ از حد جذباتی تھی۔ عضنان اس کے اس اجنبی انداز سے شدید ہرٹ ہوا تھا۔ تاہم اسے کچھ کہے بغیر اگلے ہی لمحے وہ بچے کو لے کر گھر سے باہر نکل گیا تھا۔

اذان کے بخار میں قدرے کمی آ گئی تھی مگر وہ دونوں ایک دوسرے سے روٹھے رہے۔ عضنان اس زعم میں منہ پھلائے پھرتا رہا کہ اس نے بدتمیزی کی ہے۔ لہٰذا وہ معافی مانگ کر پہلے بات کرے جب کہ منزہ اس خیال میں گھری رہی کہ عضنان کی وجہ سے وہ کس درجہ ذہنی تکلیف کا شکار ہوئی تھی لہٰذا وہ اس سے ایکسکیوز کر کے دوبارہ ایسی لاپروائی نہ برتنے کا عہد کرے۔ دن یوں ہی گزرتے جا رہے تھے۔ نہ وہ جھک رہی تھی نہ عضنان۔

اذان اب بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ منزہ معمول کی طرح صبح سویرے اٹھتی۔ نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرتی پھر کچن میں گھسی جاتی اور مقررہ وقت سے پہلے ہی ناشتہ تیار کر لیتی مگر اس پر جان نچھاور کرنے والا عضنان ناراضگی کے اظہار کے طور پر بنا ناشتہ کیے ہی آفس سدھار جاتا اور پیچھے وہ اس کے بھوکے رہ جانے کے خیال سے کڑھتی سلگتی خود بھی صرف چائے کے آدھے کپ پر گزارا کر لیتی۔

دوپہر میں لنچ کے لیے آنا بھی اس نے چھوڑ دیا تھا۔ عضنان کے ذہن میں یہ فتور سمایا تھا کہ وہ چونکہ اس کے لیے سب کچھ چھوڑ چکی تھی لہٰذا اب اس کی قدر بھی کرتی۔ خواہ وہ غلط کرے تب بھی اس سے منہ نہ بنائے کیونکہ اس کے سوا اب اس کا اور تھا ہی کون جو اسے پناہ دیتا یا اس کی ذمہ داری اٹھاتا جب کہ منزہ کا خیال تھا کہ عضنان کو اس کی بے لوث محبت کی قدر کرنی چاہیے جس کے لیے اس نے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا اگر وہی اس کی فکر اور پروا نہ کرتا تو کتنا دکھ کا مقام تھا۔



دونوں اپنی اپنی جگہ پر خود کو درست سمجھ رہے تھے۔ منزہ دل بہلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ خود کو گھر کے کاموں میں مصروف رکھتی تو عضنان نے آفس میں نئی ''دل چسپی'' ڈھونڈ لی۔

اس کی آفس کولیگ مس حمنیٰ عباسی جس کی وجہ سے ان دونوں کے بیچ جھگڑے نے جنم لیا تھا اس پر پوری طرح فدا ہونے کو بے تاب تھی۔ عضنان چونکہ ذہنی طور پر ڈسٹرب تھا لہٰذا فوری جزباتی سہارے کے لیے اس نے مس حمنیٰ عباسی کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں آفس میں رہ کر بھی ایک دوسرے کی قربت کے بہانے تلاشتے اور آفس ٹائم آف ہونے کے بعد تو گویا ان کے عیش تھے۔

حمنیٰ کبھی اسے اپنے گھر لے جاتی، کبھی دونوں ساحل سمندر کی طرف نکل آتے تو کبھی کسی شاندار سے ہوٹل یا ریسٹوران میں شام مناتے۔ پہلے جو محبتیں، وارفتگیاں اور تحائف منزہ کے حصے میں آتے تھے۔ اب حمنیٰ عباسی کے نصیب کا حصہ بننے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کا افیئر آفس میں مشہور ہو گیا مگر عضنان کو پروا نہیں تھی۔ جذباتی سہارے کے لیے تھاما جانے والا ہاتھ اب اسے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ہاتھ سے چھوٹنا گوارا نہیں تھا۔

حمنیٰ تقریباً ہر دوسرے روز اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی اور مزے مزے کے کھانے بنا کر کھلاتی۔ اس کے ہاتھ کے ذائقے کے سامنے عضنان کو اب منزہ کے ہاتھ کا بنا کھانا جس کا کبھی وہ بے حد معترف ہوا کرتا تھا بے مزہ محسوس ہونے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مکمل طور پر گھر میں کھانا کھانا چھوڑ دیا۔ اب رات میں بھی وہ لیٹ ہی آتا تھا۔ منزہ کے جذبات و احساسات کی جیسے کوئی پروا ہی نہیں رہی تھی اسے' اور اس چیز کا اسے کتنا دکھ پہنچ رہا تھا یہ صرف وہی جانتی تھی۔

اس روز آفس ٹائم کے بعد وہ پھر حمنیٰ کے ساتھ اس کے گھر آیا تھا۔ ایک بات جو اس نے خاص طور پر محسوس کی تھی وہ حمنیٰ کے گھر کا سناٹا تھا۔ اس کی ماں اکثر دوا کھا کر اپنے کمرے میں سوئی ہوئی ملتی تھی۔ باپ ملک سے باہر تھا۔ ایک بھائی تھا جس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دوبئی میں مقیم ہو چکا تھا۔ عید بقر عید پر آتا تھا تو گھر میں رونق ہو جاتی تھی وگرنہ سناٹے گونجتے رہتے۔

موسم اس دن بھی سرد تھا۔ عضنان کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد وہ کچھ ہی دیر میں گرما گرم چائے کے دو کپ بنا کر لے آئی تھی۔

''عازی! ایک بات کہوں وعدہ کرو مائنڈ نہیں کرو گے.....'' آج اس کے انداز ہی

دیکھنے والے تھے۔ بلیک پرنٹڈ سوٹ میں ملبوس اس کا گورا بدن نمایاں ہو رہا تھا۔ اوپر سے کپڑے ایسے اسٹائلش تھے کہ نہ چاہنے کے باوجود بھی اس کی نگاہ بار بار بھٹک کر اس کے دوپٹے سے بے نیاز گریبان پر پڑتی تھی۔ شعوری کوشش کے تحت وہ بھی اس کے بے حد قریب عین سامنے آ کر بیٹھی تھی۔

''بولو..... کیا بات ہے؟'' وہ اپنے بہک جانے سے خوف زدہ تھا اور یہی چیز حمنیٰ کو حوصلہ دے رہی تھی۔

''عازی! پتہ نہیں کیسے اور کیوں مجھے تم اچھے لگنے لگے ہو۔ میں اب تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ مجھ سے وعدہ کرو تم کبھی اپنا تعلق مجھ سے ختم نہیں کرو گے.....'' قدرے لجاجت سے کہتے ہوئے اس نے عضنان کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اس اچانک حملے پر قدرے بوکھلا گیا تھا۔

''یہ..... یہ کیا کہہ رہی ہو تم.....؟ ہم صرف اچھے دوست ہیں حمنیٰ اس سے زیادہ کچھ نہیں.....''

''نہیں عازی! خدا کے لیے ایسا مت کہو۔ دیکھو کس چیز کی کمی ہے مجھ میں۔ نظر اٹھاؤں تو ہزاروں فدا ہو سکتے ہیں مگر میرا دل صرف تمہاری قربت اور محبت کے لیے بے قرار ہوا ہے۔ پچھلے کئی دنوں سے اظہار کے لیے تڑپ رہی ہوں مگر یہ سوچ کر کہ کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ لب سی رکھے ہیں۔ عازی! مجھ پر رحم کرو۔ میں بہت تکلیف میں ہوں.....'' شفاف گالوں پر آنسو بکھراتے ہوئے وہ عضنان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر سسک اٹھی تو اس کا دل جیسے مچل کر رہ گیا۔ اس لمحے اسے یوں لگا جیسے زندگی اس کے زانو پر سر رکھے رو رہی ہے۔

منزہ کی پرچھائی اور اس کی پاکیزہ محبت، حمنیٰ عباسی کے آنسوؤں کی دھند میں کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ دھڑکتے مچلتے دل سے قطعی بے بس ہو کر اس نے جوں ہی اپنا ہاتھ حمنیٰ عباسی کے کندھے پر دھرا وہ جذباتی ہو کر اس کے مزید قریب ہو گئی۔

عضنان نے بہت کوشش کی کہ اس کے قدم نہ ڈگمگائیں مگر حمنیٰ عباسی کے طوفان خیز جذبات کا ریلا اس کے بچاؤ کی تمام تر کوشش کو بہا کر لے گیا اور جب جذبات کا یہ طوفان تھما تو وہ خود اپنے آپ سے نگاہیں ملانے کے قابل نہ رہا تھا۔

اس کے برعکس حمنیٰ بہت مسرور تھی۔ محبت کی پذیرائی پر اس نے عضنان کا شکریہ ادا



کیا تھا مگر اسے فی الحال اس کا چہرہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سو اپنے گناہ گار بدن کو گھسیٹتا وہاں سے سیدھا گھر چلا آیا۔ رات خاصی گہری ہو گئی تھی۔ وہ بیڈ روم میں داخل ہوا تو منزہ حسب معمول رخ پھیرے بیڈ پر دراز تھی۔ تب شاور لینے کے بعد وہ اس کے پہلو میں آ کر لیٹا تو اس کی گھٹی گھٹی سی سسکیوں کی آواز دل کاٹ گئی۔ صرف ایک لمحہ لگا تھا اُسے ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنی تحویل میں لینے میں۔

''مون! آئی ایم سوری یار..... رو کیوں رہی ہو.....؟'' اس وقت اس کا اپنا دل بھی رونے کو چاہ رہا تھا۔ اپنی پاک باز بیوی کے حق میں خیانت اسے ندامت سے غرق کر رہی تھی۔ منزہ کے آنسو اسے اپنے گناہ کا باعث لگ رہے تھے۔ تب ہی وہ ساری خودداری وانا بھول کر جھک گیا تھا۔ منزہ اس کی غیر متوقع التفات پر جو بلک بلک کر رونا شروع ہوئی تو پھر عضنان کے لیے اسے چپ کرانا مشکل ہو گیا۔

''مون! اگر تم نے اپنے آنسو نہ روکے تو میں بھی رونا شروع ہو جاؤں گا۔'' اس کی آواز سچ مچ بھرا گئی تھی تب ہی منزہ نے اپنے آنسوؤں سے لبریز چہرہ اوپر اٹھایا تھا۔

''بکواس کرتے ہو تم۔ کوئی پیار نہیں ہے تمہیں مجھ سے۔ پیار ہوتا تو اتنے دن بے گانے بن کر نہ رہتے۔ جن سے پیار کیا جاتا ہے ان سے ایک لمحے کی دوری برداشت نہیں ہوتی اور تم..... تم نے پورے پانچ روز سے مجھے سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ فریبی ہو تم..... غلطی ہم لڑکیوں کی ہی ہوتی ہے جو تم مردوں کی جادوئی باتوں میں آ کر خود کو روگ لگا لیتی ہیں۔ تم لوگ اس قابل ہو ہی نہیں کہ کوئی اچھی شریف لڑکی تمہیں دل سے سچا پیار کرے۔ تمہارے لیے تو بازاری عورتیں ہی ٹھیک رہتی ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر اپنا مطلب نکالنے والی۔'' وہ رو بھی رہی تھی اور تیز تیز بول بھی رہی تھی۔

عضنان کی سانس جیسے سینے میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

''نہیں رہنا مجھے تمہارے ساتھ۔ کل ہی اپنا بے کار وجود لے کر کہیں چلی جاؤں گی میں پھر کرنا اپنی مرضی سے زندگی بسر..... کوئی تمہیں روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوگا کوئی جھگڑا بھی نہیں کرے گا تم سے.....'' کتنا غبار جمع کر رکھا تھا اس نے اپنے اندر عضنان کی جان حقیقی معنوں میں لبوں پر آ گئی تھی۔

''کہاں چلی جاؤ گی مجھے چھوڑ کر؟'' بوجھل لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔ جواب میں

وہ سسکی بھرتے ہوئے بولی۔

''تمہیں اس سے کیا؟ کہیں بھی چلی جاؤں گی خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔''

''تنہا جی لوگی میرے بغیر......؟'' جانے کس امید کے تحت اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ چیختے ہوئے بولی۔

''جو چیز میری ہے ہی نہیں اس کے ساتھ رہ کر بھی تو تنہا ہی ہوں۔''

''تمہاری نہیں تو اور کسی کی ہے......؟'' کتنا اچھا لگ رہا تھا منزہ کا بھیگا بھیگا سا سرخ چہرہ۔ وہ ایک لمحے میں اپنا گناہ بھول بیٹھا تھا۔

''مجھے نہیں پتا میرا دل تمہاری طرف سے خراب ہو رہا ہے۔'' آنسوؤں کی آمیزش کی وجہ سے اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔

''سوری بول دیا ناں جان! آئندہ ایسا کچھ نہیں کروں گا جس سے تمہیں تکلیف پہنچے۔ پلیز مجھے معاف کر دو......'' اس کے لہجے میں لجاجت تھی۔ تب ہی منزہ نے گھور کر اس کی طرف خفگی سے دیکھتے ہوئے آنسو پونچھ لیے تھے۔

''مجھے تو تمہارے وعدوں پر بھی اعتبار نہیں رہا۔ تمہاری صنف اعتبار کے قابل ہی نہیں۔''

''اچھا یار! اب بس بھی کرو بلکہ یوں کرو کہ مجھے اپنے پلو سے باندھ کر رکھ لو نہ آزاد ہوں گا نہ تمہیں شکایت کا موقع ملے گا......''

منزہ کا دل ایک مرتبہ پھر اس کی طرف سے صاف ہو گیا تھا۔

''کھانا کھایا ہے شام میں......؟'' اس پر اپنا پیار لٹاتے ہوئے اس نے پوچھا تو عضنان اثبات میں سر ہلاتے ہلاتے رہ گیا۔

''نہیں......''

''کیوں......؟'' قدرے چونک کر پوچھا تھا۔ جواب میں وہ براہ راست اس کی خوب صورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیونکہ شہر کے کسی بھی ہوٹل میں تمہارے ہاتھ جیسا ذائقہ نہیں ہے مون۔'' یہ جملہ کہتے ہوئے اسے یاد بھی نہیں رہا تھا کہ آج ہی حمنیٰ عباسی کے ہاتھ سے بنے تمام کھانے کھاتے ہوئے اسے منزہ کے ہاتھ سے بنے کھانے بدمزہ محسوس ہوئے تھے۔ مردوں کو کچھ بھی بھول جانے کی بڑی بری بیماری ہوتی ہے۔ وہ سحر انگیز الفاظ جن کی خوشبو سے عورت کی زندگی تا عمر



مہکتی رہتی ہے۔ اکثر مردوں کو ان الفاظ کی ادائیگی کی وجہ بھی یاد نہیں رہتی۔

منزہ اس رات بہت دنوں کے بعد پر سکون نیند سوئی تھی۔ تاہم عضنان ساری رات جاگتا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اگلے روز وہ آفس بھی نہ جا سکا تھا۔ عجیب سستی سی چھائی رہی تھی۔

تقریباً دس گیارہ بجے وہ نیند سے بیدار ہوا تو منزہ صبح کا سارا کام نمٹا چکی تھی۔ اذان لاؤنج میں کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ شاور لینے کے بعد وہ سیدھا لاؤنج میں ہی چلا آیا تھا۔

''اٹھ گئے جناب! آج آفس سے کس خوشی میں چھٹی کی ہے......؟'' بہت دنوں کے بعد اس کا لہجہ پھر فریش ہوا تھا۔ عضنان نے کھل کر مسکراتے ہوئے ننھے اذان کو بانہوں میں سمیٹ لیا۔

''بیوی سے صلح کی خوشی میں......''

رات والی ساری بے کلی مفقود ہو چکی تھی۔ منزہ کے لبوں پر بھی دھیمی دھیمی سی مسکان بکھر کر رہ گئی اس روز کئی دنوں کے بعد دونوں نے مل کر ساتھ' خوب اچھی طرح ناشتہ کیا تھا۔ شام میں عضنان نے آؤٹنگ کا پروگرام بنایا تھا جس پر منزہ کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔

اپنی من پسند ڈھیر ساری شاپنگ کرنے کے بعد عضنان کے ساتھ ہی اس نے ڈنر بھی کیا تھا پھر ساحل سمندر پر دو تین گھنٹے گزارنے کے بعد رات میں بہت لیٹ ان کی واپسی ہوئی تھی۔ اس ایک دن میں پچھلے ایک ہفتے کی اذیت کا ازالہ ہو گیا تھا۔

اگلے روز پھر اس کا چھٹی کرنے کا ارادہ تھا مگر منزہ نے زبردستی اسے ناشتہ کروا کر آفس روانہ کر دیا۔ گھر سے آفس آتے ہوئے اس نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ وہ آئندہ حمنیٰ عباسی کے دام میں نہیں آئے گا، نہ ہی کسی بھی صورت اس کے گھر جائے گا مگر...... آفس میں لنچ ٹائم کے دوران جیسے ہی وہ اس کے مقابل آ کر بیٹھی۔ عضنان کو اپنے تمام ارادے کمزور پڑتے محسوس ہوئے۔

''عازی! کیا تم مجھ سے ناراض ہو......؟'' گہرے پرپل کلر کے نہایت اسٹائلش سوٹ میں ملبوس وہ اس کے مقابل بیٹھی پوچھ رہی تھی۔ جب وہ بے ساختہ اس کے دلکش سراپے سے نگاہ چرائے ہوئے بولا۔

''نہیں......ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''ایسی بات نہیں تو کل آفس کیوں نہیں آئے تم؟

سیل بھی سارا دن آف رکھا تھا۔ آئی ایم سوری عازی اگر میری کوئی بھی حرکت تمہیں ناگوار گزری ہے تو میں دل سے معافی کی طلب گار ہوں پلیز مجھ سے رخ نہ پھیرو۔ میں

کسی بھی صورت تمہاری ناراضگی برداشت نہیں کرسکتی......'' اس کی ہر ادا' ہر لفظ جادوئی تھا۔

عضنان ایک مرتبہ پھر ہزار کوشش کے باوجود خود کو اس کے سامنے کمزور پا رہا تھا۔

''میں سمجھ گئی۔ تم شاید اپنی بیوی سے ڈرتے ہو......'' اسے خاموش پا کر وہ لپ اسٹک سے سجے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکان بکھیرتے ہوئے پھر بولی تھی۔ تاہم عضنان اب بھی خاموش رہا تھا۔

''عازی! تم کیا سمجھتے ہو میں اگر تمہارے ناز اٹھاتی ہوں تو میری کوئی عزت نہیں۔ یہ پورا آفس اسٹاف میرے ساتھ فقط ایک کپ چائے پینے کو ترستا ہے مگر میں کسی کی طرف نہیں دیکھتی۔ یہ محبتوں کے معاملے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ نظر ایک مرتبہ کسی پر ٹھہر جائے تو پھر کوئی اور نظارہ خواہ وہ کتنا ہی دل کش کیوں نہ ہو دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔ مجھے تم سے سوائے محبت کے چند بولوں کے اور کچھ بھی نہیں چاہیے......''

اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آئی تھی۔ عضنان اس بار خاموش نہیں رہ سکا تھا۔

''میں اپنی بیوی سے ڈرتا نہیں۔ اس سے بے تحاشا پیار کرتا ہوں اسی لیے اس سے بے وفائی نہیں کرنا چاہتا۔''

''کیسی بے وفائی عازی! تمہاری جو محبت' جو وقت اور جذبے اس کے لیے ہیں۔ میں وہ نہیں مانگتی۔ میں تو اپنے حصے کا تھوڑا سا پیار مانگ رہی ہوں۔ گھر سے باہر تم جو وقت گزارتے ہوئے اس کا تھوڑا سا حصہ اگر وہ بھی تم مجھے نہیں دے سکتے تو کوئی بات نہیں میں زبردستی محبت کی قائل نہیں ویسے بھی تم سے محبت میرا مسئلہ ہے تمہارا نہیں۔ لہٰذا سزا بھی مجھے ہی ملنی چاہیے۔'' قدرے نم لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی وہ اس کے قریب سے اٹھ گئی تو عضنان نے جانے کیا سوچتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''یہ سچ ہے کہ میں اپنی بیوی سے بہت پیار کرتا ہوں مگر......تم بھی مجھے بری نہیں لگتیں حمنیٰ! میں کسی کی دل شکنی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ویسے بھی آج کا دور بہت جدید ہو چکا ہے۔ اب کسی مرد کا ایک ہی عورت پر اکتفا کر کے جینا بہت مشکل ہے۔'' وہ ایک مرتبہ پھر بھول گیا کہ کل رات ہی اس نے اپنی بیوی کو کبھی ہرٹ نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ حمنیٰ اس کے الفاظ پر دھیمے سے مسکرائی تھی۔

''اچھی لگ رہی ہو آج۔ پرپل کلر زیادہ سوٹ کرتا ہے تم پر......'' ایک ہاتھ سے



اس کی کلائی تھامے وہ دوسرا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے بولا تھا۔ جواب میں حمنیٰ عباسی کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

شام میں آفس ٹائم ختم ہوا تو اس کا دل پھر سے حمنیٰ عباسی کی قربت کے لیے مچل اٹھا۔ تب ہی وہ اپنے کیبن سے نکل کر اس کی میز کی طرف آیا تھا۔

''آفس ٹائم تو ختم ہوگیا۔ گھر چلیں......؟''

''بالکل......میں بھی بس اٹھ رہی تھی۔''

''میں تمہارے ساتھ گھر چلنے کی بات کر رہا ہوں......''

حمنیٰ نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک بھانپ لی تھی۔ تب ہی پرس کندھے پر ڈالتے ہوئے بولی۔

''موسٹ ویلکم! میں نے کب انکار کیا ہے......؟''

اس کی مسکراہٹ غضب کی تھی۔ عضنان اپنے اندر مچلتے جذبوں کے طوفان کو دبا کر رہ گیا۔

وہ لوگ گھر پہنچے تو شام کے دھندلکے خاصے گہرے ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی منزہ نے اسے کال کی تھی اور اس نے کمال ہوشیاری سے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے اسے بتا دیا تھا کہ آج کل آفس میں نئے پروجیکٹ پر کام شروع ہوگیا ہے لہٰذا اب وہ روز نہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ گھر واپس آیا کرے گا۔ اپنے اس بہانے پر اس نے خود کو داد بھی دی تھی۔ احتجاج اٹھاتے ضمیر کو یہ کہہ کر سلا دیا تھا کہ آج کل ہر مرد ایسی ہی سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ لہٰذا وہ بھی اگر تھوڑا سا وقت کہیں انجوائے کرے گا تو کوئی پہاڑ نہیں ٹوٹ پڑے گا۔

حمنیٰ اپنے دل کش سراپے کے ساتھ کسی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کے صبر کا امتحان لیتی۔ اس کے ساتھ ہی صوفے پر چپک کر بیٹھی تھی اور وہ باتیں کرتے ہوئے چھوٹی موٹی شرارتیں بھی کر رہا تھا۔ باتوں کے دوران اچانک بے اختیار ہوتے ہوئے۔ اس نے کہا تو وہ کھل کر ہنس پڑی۔

اس روز دیر سے گھر واپس لوٹا تو ایک عجیب سی سرشاری اس کی رگ و پے میں دوڑ رہی تھی۔ بات بے بات کھلکھلاتا لہجہ' منزہ کو چونکا گیا۔

''خیریت......؟ آج بڑے خوش دکھائی دے رہے ہو......'' وہ اس کی آفس ٹائمنگ

بڑھ جانے کا سن کر قدرے ناراض ہوئی بیٹھی تھی مگر عضنان کو اس کا احساس تک نہیں ہوا تھا تب ہی وہ کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا تھا۔

''اچھا......تمہیں لگتا ہوگا۔ میں تو کل بھی اتنا ہی خوش تھا جتنا آج ہوں اور وجہ تم بخوبی جانتی ہو۔''

''مجھے کچھ نہیں پتا تم پکے بے ایمان ہو' تمہاری کسی بات کا کوئی اعتبار نہیں ......'' روٹی بیلتے ہوئے وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی تھی۔ جب عضنان پھر سے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''تمہارا شک کبھی ختم نہیں ہوگا۔ میری جان چلی جائے گی۔'' اس کے پاس ہی دیوار سے ٹیک لگا کر وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ہوئے بولا منزہ نے ہاتھ میں پکڑا بیلن غصے سے چڑ کر اس کے مضبوط بازو پر رسید کر دیا۔

''فضول بکواس کرنی بہت آتی ہے تمہیں۔''

''تم سے ہی سیکھی ہے۔ آخر کو تمہاری صحبت میں جو رہتا ہوں۔'' مسکرا کر بازو سہلاتے ہوئے اس نے دوبدو جواب دیا تھا۔ جواب میں وہ محض اسے گھور کر رہ گئی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد عضنان اذان کو لے کر بیڈ روم میں چلا گیا تھا جب کہ وہ بہت دیر تک کچن کو سمیٹنے کے بعد نماز اور نوافل میں لگی رہی۔

تقریباً بارہ بجے کے قریب تسبیح وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ کمرے میں آئی تو عضنان کمپیوٹر پر کوئی انگلش موی دیکھ رہا تھا۔ تب اس کا پارا ایک دم ہائی ہو گیا اور اس نے آگے بڑھ کر ماؤس اپنے کنٹرول میں لے لیا۔

''شرم کرو کچھ۔ میں باہر نماز پڑھ رہی تھی اور اندر یہاں تم نے فحاشی کا اڈا کھول رکھا ہے۔ گھر میں تصویر ہو تو رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ ان بے حیا انسانوں کی فلم چلتے دیکھ کر تو وہ لعنت بھیجتے ہوں گے ہمارے گھر پر۔ تمہیں نماز کی توفیق نہیں ہوتی تو یہ اخلاق سوز گھٹیا فلمیں تو نہ دیکھا کرو۔'' اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا تھا۔ غضنان ہمیشہ کی طرح کان کھجا کر رہ گیا۔

''سوری یار! فارغ بیٹھا بور ہو رہا تھا تو سوچا کمپیوٹر ہی آن کر لوں۔ ویسے آج کل گھر گھر ایسی ہی فلمیں چل رہی ہیں۔ میں اگر کبھی کبھار دیکھ لیتا ہوں تو کون سا پہاڑ گر پڑا......''

''پہاڑ بھی جلد ہی گرنے لگیں گے یہ گندی اور گھٹیا فلمیں ہی ہیں جن کی وجہ سے



ہماری نئی نسل تیزی سے بربادی کے طوفان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ استغفر اللہ بجائے اس کے کہ دوسروں کو بھی سمجھائیں۔ یہاں ہر کوئی یہی سوچ کر خود کو تسلی دے رہا ہے کہ باقی سب کر رہے ہیں تو میں کیوں نہ کروں میرا کیا بگڑتا ہے۔'' اسے غصہ بہت کم آتا تھا مگر جب آتا تھا تو ساری اگلی پچھلی کسریں نکل جاتی تھیں۔ عضنان کو اس لمحے اس سے اپنی جان چھڑانی مشکل ہو گئی تھی۔

''منزہ! زیادہ ٹیمپر لوز کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو' جیسی تم صاف ستھری ہو ویسی ہی باقی کی دنیا کو بھی ہونا چاہیے ہرگز نہیں یہاں ہر بندے کا اپنا مزاج اور اپنی ترجیحات ہیں۔ تمہیں یہ سب پسند نہیں نہ سہی مگر دوسروں کو تم زبردستی اپنی پسند کے راستے پر چلنے پر مجبور نہیں کر سکتیں آج کی دنیا بہت ایڈوانس ہو گئی ہے۔ اسے پتا ہے کہ زندگی کس طریقے سے گزارنی چاہیے۔''

''مجھے دنیا کی نہیں' صرف تمہاری پروا ہے عضنان! وہ راستہ جو دشمنوں نے اس قوم کی ذہنی وجسمانی' روحانی واخلاقی تباہی کے لیے چنا ہے میں تمہیں اسی راستے پر بھٹکنے نہیں دوں گی۔'' اس کے غصے کی جگہ اس کے لہجے میں نمی اتر آئی تھی۔ تب ہی وہ بھی نرم پڑ گیا تھا۔

''سوری۔ آئندہ نماز کے وقت ایسا کچھ بھی نہیں دیکھوں گا۔''

منزہ جواب میں خاموش ہی رہی تھی۔ عضنان کمپیوٹر آف کرنے کے بعد بستر پر آیا تو وہ روزانہ کی طرح جانے کیا کیا پڑھ کر دیر تک اس پر پھونکتی رہی۔

''مون! تمہیں زندگی کی ہر خوشی اور راحت تو حاصل ہے پھر اب اتنی لمبی لمبی نمازوں میں خدا سے کیا مانگتی رہتی ہو......؟'' بستر میں اس کے برابر لیٹے لیٹے یوں ہی اس نے پوچھ لیا۔ جواب میں اس کے شفاف چہرے پر بکھرا نور مزید دو چند ہوا تھا۔ کتنا سکون تھا اس کے چہرے پر۔ عضنان بس دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

''اپنے ایمان کی سلامتی کیونکہ آج کل سب سے زیادہ قیمتی یہی دعا ہے۔''

''تمہارا ایمان نہیں جاتا کہیں' لکھوا کر رکھ لو مجھ سے......'' وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا تھا۔ جب منزہ پھر خفگی سے اسے گھور کر رہ گئی۔

''سو جاؤ چپ چاپ۔''

قدرے جل کر وہ رخ پھیر گیا تھا۔ منزہ کو بے ساختہ اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

''تم بہت پیارے ہو عضنان! اس دنیا میں باقی تمام مردوں سے قطعی مختلف۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے تم جیسے خالص انسان سے محبت کر کے اپنے پاکیزہ جذبات کو پامال نہیں

ہونے دیا۔ پتہ ہے کبھی کبھی تم مجھے بہت چھوٹے سے معصوم بچے لگتے ہو۔ اسی لیے میں تمہیں ڈانٹ پلا دیتی ہوں مگر ہمیشہ تمہاری بھلائی کے لیے کیونکہ میں نہیں چاہتی میرے عضنان پر زمانے کی منافقت کا کوئی رنگ چڑھے یا وہ کوئی غلط قدم اٹھا کر پچھتاؤں کی نذر ہو۔ سچی عضنان میں تمہیں، صرف تمہیں ساری دنیا سے منفرد دیکھنا چاہتی ہوں۔'' نہایت محبت سے اس کا رخ اپنی طرف پھیر کر وہ اس کے بازو پر اپنا سر ٹکاتے ہوئے بولی تو عضنان کے چہرے کا رنگ یک دم پھیکا پڑ گیا۔ کتنا فرق تھا منزہ کی اور اس کی محبت میں۔ اس رات وہ پھر دیر تک جاگا تھا۔

اگلی صبح پھر اس نے دل میں ارادہ کیا تھا کہ وہ اب کسی گناہ کی طرف قدم نہیں بڑھائے گا۔ صرف اپنی محبت' اپنی بیوی کا وفادار رہے گا مگر یہ ارادہ...... صرف اسی وقت تک مضبوط رہا تھا جب تک حمنیٰ عباسی نگاہوں کے سامنے نہیں آئی تھی۔ حسب معمول لنچ ٹائم کے قریب بڑے پراعتماد انداز میں مکمل بلیک شیفون کے سوٹ میں ملبوس خاصی نفاست سے کیے گئے میک اپ کے ساتھ وہ پھر اس کی دھڑکنوں کو بے قرار کر گئی تھی۔

''عازی! آج لنچ نہیں کرنا......'' کمال بے نیازی سے اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے وہ اس کی ٹیبل پر پڑے پیپر ویٹ کو گھماتے ہوئے بولی تھی۔ تاہم اس سے پہلے کہ عضنان اسے کوئی جواب دیتا اس کے سیل پر منزہ کی رنگ آ گئی۔ وہ اس وقت حمنیٰ کے سامنے اس کی کال نہیں ریسیو کرنا چاہتا تھا مگر جانے کیا سوچ کر یس پریس کر دیا۔

''ہاں بولو مون' کیا بات ہے......؟''

''کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کا لنچ ٹائم ہو گیا ہے اور میں نے گھر میں آج آپ کا فیورٹ بھنڈی گوشت بنایا ہے لہٰذا جلدی سے آجاؤ مجھے بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔'' دوسری طرف سے وہ خاصے مان بھرے انداز میں عجلت سے بولی تھی۔

ایک طرف منزہ کی خوشی تھی اور دوسری طرف اس کے دل کی طلب۔ وہ صرف ایک لمحے کے لیے الجھا تھا کہ کیا کرے؟ تاہم اگلے ہی لمحے دل کی طلب منزہ کی خوشی سے جیت گئی تھی اور وہ بڑی سہولت سے اسے مایوس کرتے ہوئے بولا تھا۔

''سوری مون! آج میں بہت مصروف ہوں بہت زیادہ کام بکھرا پڑا ہے یہاں۔ تم کھانا کھالو میں شام میں کھالوں گا۔''



اس کے الفاظ حمنیٰ عباسی کو ایک عجیب سے احساس تفاخر میں مبتلا کر گئے تھے۔

منزہ کو خدا حافظ بول کر وہ مسکراتے ہوئے حمنیٰ عباسی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''بہت بری چیز ہو تم۔ قسم سے صرف تمہارے لیے آج کل بہت زیادہ جھوٹ بولنا پڑ رہے ہیں مجھے......''

حمنیٰ پھر کھلکھلائی تھی اور اگلے ہی لمحوں میں وہ بڑے مزے کے ساتھ اس کے برابر بیٹھا لنچ کر رہا تھا۔

تازہ تازہ عشق کی جنوں خیزیاں جیسے جیسے بڑھ رہی تھیں وہ اپنے گھر' اپنے بچے اور اپنی بیوی کی طرف سے غافل ہوتا جا رہا تھا۔ اب اسے نہ گھریلو استعمال کی اشیاء کی خریداری کا یاد رہتا تھا نہ اپنے بچے کے لیے کوئی چیز خرید کر اسے کھلانے سے دلچسپی رہتی تھی۔ صبح ناشتے کے بعد وہ سیدھا آفس آنے کی بجائے اب حمنیٰ کی طرف جانا شروع ہو گیا تھا۔ دونوں اپنی مرضی سے تیار ہو کر اکٹھے آفس آتے تھے اور پھر لنچ ٹائم کے وقت ان کا رخ کسی نہ کسی شاندار ریسٹوران کی طرف ہوتا تھا۔ شام میں وہ جلد ہی اپنے اپنے کام سے فارغ ہو کر آفس سے نکل آتے تھے اور پھر...... وہ دونوں ہوتے تھے اور ان کی خواہشات......

منزہ کبھی اس کے بغیر کھانا کھا لیتی۔ کبھی یوں ہی بھوکی بیٹھی رہتی۔ اذان سرِ شام ہی دودھ پی کر سو جاتا تھا۔ لہٰذا وہ اسے بیڈ روم میں سلا کر خود اکیلی بہت دیر تک جاگ کر اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ ٹی وی میں اب کی دلچسپی نہیں تھی اور کتابوں میں دل نہیں لگتا تھا۔ اسے یہ سوچ کر بڑی حیرانگی ہوتی تھی کہ جتنا پیار وہ عضنان سے کرتی ہے' کیا اتنا ہی پیار وہ بھی تو اس سے کرتا ہے۔ شادی کے ابتدائی دنوں کی اس کی والہانہ ادائیں اور دیوانگی آسانی سے بھلائے جانے کے قابل تو نہیں تھی۔ پھر جب وہ اس سے دوری پر مغموم رہنے لگی تھی تو عضنان ہر روز کیسے کھلکھلاتا ہوا ملتا تھا۔ اس سے دوری کا اثر اس کے چہرے پر چھلکتا دکھائی کیوں نہیں دیتا تھا؟

دوسری بہت سی عورتوں کی طرح وہ بے وقوف نہیں۔ سمجھتی تھی کہ مرد رنگ رنگ کی تتلیوں کا شیدائی ہوتا ہے۔ ہر تتلی اس کے لیے صرف اسی وقت تک دلچسپی کا باعث رہتی ہے جب تک وہ اس کی مٹھی میں نہیں رہتی۔ جیسے ہی تتلی اس کے ہاتھ آجاتی ہے وہ فوراً اسے مسل کر اس کے دل کش رنگ اپنی مٹھی میں جذب کر لیتا ہے پھر تتلی اڑے یا مر جائے اسے دل

چسپی نہیں رہتی۔ رنگوں کے بغیر وہ دل چسپی کا باعث رہتی بھی نہیں۔ اس کے سارے رنگ بھی عضنان کی مٹھی میں جذب ہو کر رہ گئے تھے۔ لہٰذا اب وہ اس کی طرف سے غافل ایک نئی تتلی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ وہ مزید کوئی جھگڑا پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی مگر روز بروز عضنان کی بڑھتی ہوئی بے نیازی اسے اذیت کے نشتر چبھوتی رہتی تھی۔ اب اس کی خاموشی، گریز اور رنجیدگی کا بھی عضنان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ تندرست رہتی یا بیمار اسے پرواہ ہی نہیں ہوتی تھی۔

منزہ کے لیے یہ سب برداشت کرنا آسان نہیں رہا تھا۔ عضنان کی محبتوں اور وارفتگیوں کے سہانے موسم دیکھنے کے بعد اب اس کی بے نیازی و اجنبیت کا درد سہنا اسے زخم زخم کر رہا تھا مگر وہ خاموش تھی۔

عضنان سے بار بار اس کی لاپروائی و بدلتے رویے پر گلے شکوے کر کے اپنی انا خودداری کا خون کرنا بھی اب اسے گوارا نہیں رہا تھا۔ سو چپ چاپ اندر ہی اندر گھلنے لگی تھی۔ طرح طرح کے دل شکن خیالات الگ جان پر بنائے رکھتے تھے۔ اس کی بے وفائی کا تصور ہی جسم سے سارا خون نچوڑ کر رکھ دیتا تھا۔ وہ ایمان دار تھی۔ اس نے اپنا جسم، اپنی روح اور اپنے خیالات و جذبات صرف ایک ہی شخص سے وابستہ رکھے تھے۔ جسے چاہا تھا اسی کے نام کی ردا اوڑھی تھی۔ لہٰذا جواب میں اسے اپنے ہم سفر کی مکمل ایمانداری بھی مطلوب تھی۔ وہ اس کے ساتھ دکھ اور آزمائش کے ہر موسم کا سامنا مسکرا کر بہادری سے کر سکتی تھی۔ اس کی تمام مجبوریاں اور تکلیفیں اپنے دامن میں سمیٹ سکتی تھی مگر اس کی بے وفائی پر سمجھوتا کرنا اسے کسی طور گوارا نہیں تھا۔ لہٰذا ایسا سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اس روز ان کی شادی کی تیسری سالگرہ کا دن تھا۔ منزہ کو قوی یقین تھا کہ وہ اپنی لاکھ مصروفیات و بے نیازی کے باوجود اس اہم موقع کی اہمیت کو قطعی فراموش نہیں کر سکے گا۔ لہٰذا اس نے دل کے ہر غبار اور بدگمانی کو تھپک کر سلاتے ہوئے صبح نہایت پیار سے اسے بیدار کیا۔ پھر اسے واش روم کی راہ دکھا کر وہ کچن کی طرف چلی آئی تا کہ خاص دن پر ناشتہ بھی اس کے لیے اس کی پسند کا تیار کر سکے۔ اس بار اس کا ارادہ اپنی شادی کی سالگرہ منانے کا تھا۔ اسی لیے دو روز قبل ہی گھر کی صفائی ستھرائی شروع کر دی تھی۔ اس خاص موقع کے لیے اس نے اپنا اور عضنان کا سوٹ بھی بڑی چاہ سے خرید رکھا۔ پچھلے پندرہ بیس روز سے اسے عضنان کے ساتھ کھل کر بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا۔ وہ گھر پر ٹکتا ہی نہیں تھا۔ رات میں جان



بوجھ کر لیٹ گھر آتا تھا اور آتے ہی دو چار ادھر ادھر کی باتیں کر کے بستر پر ڈھے جاتا تھا۔

پہلے وہ اس کی قربت حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتا تھا۔ اسے منانے کے لیے منتوں پر بھی اتر آتا تھا اور منزہ تب بھی نخرے دکھاتی رہتی تھی۔ اب پچھلے پندرہ بیس روز سے، اسے جیسے اس کی قربت کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ دو دن بھی اس کے بغیر نہ رہنے والا عضنان احمد اب پچھلے بیس روز سے اس کی ہر ادا کو یکسر نظر انداز کیے کتنے سکون سے اس کے بغیر رہ رہا تھا۔

مردوں کے لیے یہ چیز بہت آسان ہوتی ہے مگر عورت کو یہی بے وجہ نظر اندازی اندر سے مار کر رکھ دیتی ہے۔ وہ بھی بے قصور نظر انداز ہو کر دھیرے دھیرے اندر سے مر رہی تھی۔

امید کے ٹمٹماتے آخری مدھم دیئے کے سہارے اس نے انگلیوں پر گن گن کر اپنی شادی کی سالگرہ کے دن کا انتظار کیا تھا' تا کہ عضنان کی قربت حاصل کر کے اس کے اندر چھپی تمام شکایتوں کا گلا گھونٹ سکے مگر...... اس کی خوش فہم امید کا یہ آخری دیا بھی اس وقت بجھ کر رہ گیا جب عضنان اس کی کسی بھی تبدیلی کو نوٹ کیے بغیر بڑے آرام سے ناشتہ کر کے تھوڑی دیر اذان کے ساتھ کھیلنے کے بعد آفس کے لیے تیار ہونے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

منزہ کے اندر پھر سے کسی گہری ٹیس نے سر اٹھایا تھا مگر وہ ضبط کے پل صراط سے گزرتی اس کے پیچھے ہی کمرے میں چلی آئی تھی۔

''عضنان! کیا تم مجھ سے ناراض ہو......؟''

وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا جب اس کے سوال پر چونکتے ہوئے پیچھے پلٹا۔ بالکل رف سادہ سے حلئے میں ملبوس مکمل طور پر گھر گرہستی میں ڈھلی وہ اس نخریلی منزہ سے کتنی مختلف دکھائی دے رہی تھی جو اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی اور کسی شاندار سے شاندار لڑکے کی طرف بھی نگاہ اٹھا کر دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی۔ ہر روز ایک سے بڑھ کر ایک نیا لباس سجا ہوتا تھا اس کے جسم پر مگر اب...... فقط تین سال کے بعد کتنی زیادہ بدل کر رہ گئی تھی وہ۔

عضنان نے بہت دنوں کے بعد اسے فرصت سے دیکھا تھا۔ وہ کافی کمزور لگ رہی تھی۔ تب ہی وہ حیران حیران سا چلتا اس کے قریب آیا تھا اور پھر اپنے ہاتھوں کے پیالے میں اس کا معصوم سا چہرہ اٹھاتے ہوئے بولا تھا۔

''نہیں...... یہ گندی چڑیل لڑکی کہاں ناراض ہونے کا کوئی موقع دیتی ہے مجھے......؟''

''ناراض نہیں تو بے نیاز کیوں ہو؟ کیا تمہیں نہیں لگتا کہ تم بے قصور مجھے نظر انداز کر رہے ہو......'' اس کے اپنائیت بھرے لہجے پر وہ پھر اپنا ضبط کھونے لگی تھی۔ تب ہی عضنان نے کھلکھلا کر اس کے نازک سے وجود کو اپنی بانہوں میں چھپایا تھا۔

''تم نظر انداز کیے جانے کے قابل ہو......؟''

اس کا لہجہ مخمور ہوا تھا۔ جواب میں منزہ نے شکایتی انداز سے اس کی طرف دیکھا۔

''پہلے نہیں تھی اب ہوگئی ہوں۔ شاید اب تمہارا دل میری طرف سے بھر گیا ہے۔''

''جسٹ شٹ اپ مون! پتا نہیں کیوں تمہیں ہر وقت روتے رہنے کی عادت ہوگئی ہے۔ تم پہلے تو ایسی نہیں تھیں......''

''پہلے تم بھی تو ایسے نہیں تھے عضنان۔''

''کیوں ...... مجھے کیا ہوگیا ہے؟ ہاتھ پاؤں نہیں رہے یا سینگ نکل آئے ہیں......؟'' پیار بھرے لہجے کو روکھا بنتے چند لمحے بھی نہیں لگے تھے۔ منزہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

''کچھ نہیں ہوا تمہیں۔ شاید میرا ہی دماغ خراب ہوگیا ہے۔'' دھیمے مگر شکستہ لہجے میں کہتی وہ کمرے سے باہر نکل آئی تھی جب کہ عضنان اسے پکارتا رہ گیا تھا۔ اس روز وہ بہت روئی تھی۔ پہلی بار اسے اپنے والدین اور بہن بھائی شدت سے یاد آئے تھے۔

خوب اچھی طرح رونے کے بعد دل کا غبار صاف ہوا تو عضنان ایک مرتبہ پھر بے قصور دکھائی دینے لگا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ ''ہاں میں ہی غلط ہوں وہ اتنا مصروف رہتا ہے۔ میرے اور میرے بچے کے لیے جان کھپاتا ہے اور میں...... میں تنگ ذہن، شکی عورت بجائے اسے سکون فراہم کرنے کے، مزید پریشان کر کے رکھ دیتی ہوں۔ اگر میں نے اس کے لیے اپنے والدین چھوڑے ہیں تو وہ بھی میرے لیے سب کچھ چھوڑ بیٹھا ہے۔ پھر میں صرف خود ہی کو درست کیوں سمجھتی ہوں۔''

ذہن میں جوں ہی یہ سوچ آئی۔ اس کے لب تصور میں عضنان کو دیکھ کر مسکرا اٹھے۔

''بے وفا' دھوکے باز۔ جان بوجھ کر تنگ کرتا ہے مجھے......''

اپنے ہی آپ سے کہتے ہوئے اس نے اپنا پرسنل سیل اٹھایا اور بڑے پیار سے اس کا سیل نمبر پریس کر دیا مگر دوسری جانب وہ بزی تھا۔ اس کی کال ویٹنگ پر جا رہی تھی۔ ایک



دوبار ٹرائی کرنے کے بعد اس نے پھر سے مایوس ہوتے ہوئے اپنا سیل آف کر دیا۔

''دفع ہو کہیں جا کر۔ مجھ سے زیادہ کسی اور کی کال اہم ہے اس کے لیے۔ میں بھی نہیں بولوں گی اب جب تک ہاتھ جوڑ کر معافی نہیں مانگے گا۔ میں بات ہی نہیں کروں گی اس سے......''

اس کی طرف سے کال ریسیو نہ ہونے پر بچوں کی طرح روٹھتے ہوئے اس نے پھر اپنے آپ کو سنایا تھا مگر یہ ارادہ بھی بس تھوڑی دیر تک ہی مضبوط رہا تھا۔ جیسے ہی شام ہوئی وہ ہلکا پھلکا تیار ہو کر مارکیٹ چلی آئی۔ ننھے اذان کو اس نے ساتھ والی ہمسائی کے سپرد کیا تھا۔ عضنان کو خوشبو بہت پسند تھی اور اس کا ارادہ اس بار اسے پھولوں کے بوکے کے ساتھ اس کا پسندیدہ پرفیوم گفٹ کرنے کا تھا۔

اگر اسے اپنی مصروفیت کے باعث اس خوب صورت موقع کی اہمیت کا احساس نہیں رہا تھا وہ کیوں جان بوجھ کر اسے فراموش کر دیتی۔ خود کو عضنان سے زیادہ باوفا ثابت کرنے کا یہ بہترین موقع تھا اور وہ اسے گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا اس موقع کے لیے اب تک جتنے بھی پیسے اس نے جمع کیے تھے ان کا بڑا حصہ صرف عضنان کی شاپنگ پر ہی خرچ کر ڈالا تھا۔

نہایت محبت سے اس کے لیے ایک بڑا سا سرپرائزنگ گفٹ پیک کرانے کے بعد وہ دکان سے نکل ہی رہی تھی جب اچانک عضنان کے آفس کولیگ مسٹر ہمدانی کی بیوی نے اسے دیکھ کر آواز دے ڈالی۔

''السّلام علیکم۔''

منزہ اسے جانتی تھی کئی بار عضنان کے ساتھ مسٹر ہمدانی کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی نگاہ مسز ہمدانی کے دلکش سراپے پر پڑی وہ پلٹ کر اُسے دیکھتے ہوئے شائستگی سے مسکرادی۔

''وعلیکم السلام۔ کہاں گم رہتی ہو آج کل؟ حال احوال کی خبر ہی نہیں ہے کوئی......''

اس کے پاس پہنچ کر مسز ہمدانی نے گلہ کیا تھا۔ جواب میں وہ کھل کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''کہاں ہونا ہے مجھے۔ گھریلو کاموں سے ہی فرصت نہیں ملتی......'' دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے شاپ سے باہر نکل آئی تھیں۔ جب مسز ہمدانی نے کہا۔

''فرصت رکھا کرو بھئی شادی شدہ عورت کا گزارہ نہیں ہوتا بے خبری میں......''

''کیوں...... کیا ہوا......؟'' اس کا دل یکلخت ہی دھڑکا تھا۔

''ہوا تو کچھ نہیں لیکن ہو سکتا ہے......''

''کیا ہو سکتا ہے؟''

''کچھ بھی ...... جس کی شاید تمہیں توقع بھی نہ ہو......''

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں پلیز کھل کر کہیں ناں ......؟'' چہرے کے اڑے اڑے سے رنگ کے ساتھ بمشکل وہ بول پائی تھی جب مسز ہمدانی بولیں۔

''یہاں بات کرنا مناسب نہیں۔ میرے ساتھ گھر چلو۔ وہیں بیٹھ کر تفصیلی بات کرتے ہیں۔''

منزہ کا دل کسی بھی انہونی کے ڈر سے بہت بری طرح دھڑک رہا تھا۔ بازار سے مسز ہمدانی کے گھر تک کا فاصلہ جس بے چینی و بے قراری کے ساتھ اس نے طے کیا تھا محض وہی جانتی تھی۔

گھر پہنچ کر مسز ہمدانی نے سب سے پہلے چائے سے اس کی تواضع کی تھی مگر ایک ایک گھونٹ اس کے حلق سے جیسے کڑوا سیال قہوہ بن کر اتر رہا تھا۔ چائے کا کپ ابھی خالی بھی نہیں ہوا تھا جب وہ بے قراری سے اپنے مقابل بیٹھی مسز ہمدانی سے پوچھ بیٹھی۔

''پلیز! بتایئے ناں مسز ہمدانی! آپ مجھے باخبر رہنے کے لیے کیوں کہہ رہی تھیں......؟''

''مسز ہمدانی اس کے سوال پر چند لمحوں کے لیے خاموش رہی تھیں پھر گلا صاف کرتے ہوئے قدرے بردبار لہجے میں بولیں۔

''اللہ معاف کرے منزہ! میں کسی کی کردار کشی کو معیوب سمجھتی ہوں مگر جو بات میں اس وقت تمہیں بتانا چاہتی ہوں وہ بہتان ہرگز نہیں ہے۔ ہمدانی کئی بار اس بات کا تذکرہ مجھ سے کر چکے ہیں......''

''کون سی بات......؟'' اس کی بے تابی گزرتے ہر لمحے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔

''بات بظاہر خطرناک نہیں ہے مگر ہو سکتی ہے۔

ہمدانی بتا رہے تھے کہ آج کل عضنان اپنے آفس کی ایک لڑکی حمنی عباسی کے ساتھ بہت دیکھا جا رہا ہے دونوں سرِ شام ہی آفس سے نکل جاتے ہیں اور پھر مختلف ہوٹلوں اور پارکوں میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ دیکھو منزہ مرد خواہ کتنا بھی قابلِ اعتبار کیوں نہ ہو اس کی طرف سے مکمل طور پر بے خبر ہونا کبھی کبھی عورت کو بڑے نقصان سے ہمکنار کر جاتا ہے۔



عورت مرد کے لیے سب کچھ چھوڑ سکتی ہے۔ مگر مرد عورت کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑتا۔ خدا جانتا ہے تم مجھے بے حد عزیز ہو اسی لیے ایک بڑی بہن کی حیثیت سے نصیحت کر رہی ہوں کہ اس کی موجودہ مصروفیات پر نگاہ رکھو ورنہ سر پکڑ کر روتی پھرو گی اور وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

وہ انہونی جس کے خوف سے اس کا دل لرز رہا تھا بالآخر رونما ہو کر اس کے اندر سناٹا پھیلا گئی تھی۔ مسز ہمدانی کے خاموش ہو جانے کے بعد عجب کھوئے کھوئے سے لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔

''اگر اس کا دل میری طرف سے پھر گیا ہے تو کیا...... میں زبردستی اسے خود سے محبت کرنے پر مجبور کر سکتی ہوں؟ کیا محبت کو زبردستی کسی دل میں روکا جا سکتا ہے مسز ہمدانی......؟ کیا وہ دل غبار سے پھٹ نہیں جاتے جہاں زبردستی محبت کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے......؟''

اس نے کوشش کی تھی کہ اس کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش نہ ہو مگر اس کے باوجود مسز ہمدانی کو اس کا لہجہ بھیگا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''بے وقوف مت بنو منزہ! زندگی میں کبھی کبھار ایسے مسائل آ ہی جایا کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر دل نہیں چھوڑتے بلکہ عقل و ہمت سے کام لے کر ان مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔'' وہ اسے سمجھا رہی تھیں اور منزہ اندر ہی تھکتے ہوئے خود سے کہہ رہی تھی۔

''میں سمجھوتے کے کندھے پر سر رکھ کر زندگی گزارنے والی دانش مند خواتین میں سے نہیں ہوں مسز ہمدانی میں تو بہت پاگل لڑکی ہوں۔ ہر فیصلہ دل سے کرنے والی۔ آر یا پار کی بنیاد پر جینے والی۔

مجھے بھیک میں مانگی ہوئی محبت نہیں چاہیے۔''

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے سوچا تھا اور پھر اگلے کچھ ہی لمحوں میں وہ مسز ہمدانی سے اجازت لے کر اس کے گھر سے باہر نکل آئی تھی۔

پورا جسم ایک دم سے تھکن کا شکار ہو گیا تھا۔ سوچ سوچ کر بھی اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی محبت و فرماں برداری میں کہاں کوئی کمی رہ گئی کہ عضنان نے دل بہلانے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔

وہ جتنا سوچتی تھی اتنی ہی الجھتی جا رہی تھی۔

سرِ شام آفس سے نکل جانے والا عضنان پچھلے بیس روز سے ہر رات گیارہ ساڑھے

گیارہ بجے کے قریب گھر کی راہ لیتا تھا اور ایسا کیوں ہو رہا تھا وہ جان گئی تھی۔ اس کی بے نیازی، بات بے بات کھلکھلاہٹ، مصروفیت اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر تپ کر الجھنے کی ہر گرہ کھل گئی تھی۔

تھکے تھکے قدم سے بجائے گھر کی طرف اٹھنے کے کہیں اور ہی بھٹک رہے تھے۔

جانے کیا سوچ کر اس نے پرس سے اپنا سیل نکالا تھا۔ جو تا حال آف تھا۔ سیل آن کر کے کپکپاتی انگلیوں سے عضنان کا موبائل نمبر پریس کرتے وقت اس وقت اس کا دل بری طرح رو دیا تھا۔

"ہیلو......" چوتھی یا پانچویں بیل پر اس کی کال پک ہوئی تھی اور دوسری طرف عضنان قدرے بیزار سے انداز میں بولا تھا۔ منزہ کو سمجھ نہیں آ رہی کہ اس وقت وہ اس سے کیا کہے؟ سو وہ خاموش رہی۔ دوسری طرف عضنان نے دو تین بار "ہیلو ہیلو" کرنے کے بعد لائن کاٹ دی۔ تب اس نے دوبارہ رابطہ کیا تو اس بار پہلی ہی بیل پر اس کی کال ریسیو کرنے کے بعد وہ خاصی خفگی سے گرجا تھا۔

"کیا مصیبت ہے مون! کیوں بار بار تنگ کر رہی ہو۔ دیکھو ابھی میں بہت مصروف ہوں۔ آج بہت کام ہے آفس میں۔ جیسے ہی فرصت ملی تمہیں کال بیک کر لوں گا۔ اوکے......" اپنی بپتا سنا کر صرف ایک منٹ کے لیے اس نے منزہ کے جواب کا انتظار کیا تھا پھر اس نے خاموشی سے لائن کاٹ دینے پر اس نے اپنا سیل ہی آف کر دیا۔

منزہ نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ آٹھ بجے کا ٹائم ہو رہا تھا اور یقیناً اس وقت تک اس کی آفس سے چھٹی ہو جایا کرتی تھی۔ اس کا دل اس وقت گھر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا سو تھکے تھکے سے قدموں کو گھسیٹتی اس راستے کی طرف گامزن ہو گئی جو حمنیٰ عباسی کے گھر کی طرف جاتا تھا۔

آج سے تین چار ماہ قبل جب وہ عضنان کے ساتھ تھی تو عضنان نے ازراہ ہمدردی حمنیٰ کو راستے میں پک کر کے اس کے گھر کے عین سامنے ڈراپ کیا تھا۔ بے شک وہ حسین ساحرہ تھی مگر منزہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے عضنان کو بہکا کر اپنے قابو میں بھی کر سکتی ہے۔ مسز ہمدانی کے گھر سے اس کا گھر بہت قریب پڑتا تھا۔ منزہ کا ارادہ تھا کہ وہ ان دونوں کی غیر موجودگی میں گھر کے لان میں ہی بیٹھ جائے گی اور جیسے ہی عضنان حمنیٰ کو ڈراپ کرنے آئے گا وہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑ کر شرمندہ کرے گی۔

مگر...... ہمیشہ انسان جیسا سوچتا ہے ویسا ہی نہیں ہوتا۔



وہ اس کے گھر کے سامنے پہنچی تو ایک ادھیڑ عمر بزرگ چوکیدار گیٹ پر مستعد ڈیوٹی کے فرائض انجام دیتے پایا۔

"السلام علیکم۔ میں مسز منزہ عضنان ہوں۔ حمنیٰ عباسی صاحبہ سے ملنے آئی ہوں۔ کیا ملاقات ہو سکتی ہے......؟"

چوکیدار نے قدرے چونک کر شفقت بھری نگاہ اس کے سادہ سے سراپے پر ڈالی پھر اس کے ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں بیٹی! چلی جاؤ اندر۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ لوگ باہر سے آئے ہیں۔"

"کون لوگ......؟" وہ جان گئی تھی مگر پھر بھی پوچھ لیا تھا۔

"حمنیٰ بیگم اور آپ کے شوہر نامدار...... جاؤ بیٹی جا کر دیکھ لو یہاں ہر روز کون سا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔"

چوکیدار کا لہجہ ایسا ہی تھا جیسا کسی باپ کا اپنی بیٹی کے لیے ہو سکتا ہے۔

وہ مزید حیران ہوئی تھی۔ بابا "کس کھیل" کی طرف اشارہ کر رہے ہیں......؟

قدرے الجھتے ہوئے وہ لان عبور کر کے لاؤنج میں آئی تو وہاں مکمل سناٹا تھا۔ دائیں ہاتھ کی طرف بنی سیڑھیوں کے ساتھ والا کمرہ روشن تھا مگر وہاں بھی جامد روشنی تھی۔ بائیں ہاتھ کی طرف جو کمرہ بنا تھا وہاں اگر روشنی نہیں تھی تو اندھیرا بھی نہیں تھا۔ کمرے کی واحد کھڑکی میں مدہم سی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ اسی کمرے سے ہلکی ہلکی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

منزہ اپنے بے جان وجود کو بمشکل گھسیٹتی خشک ہونٹوں کو زبان پر پھیر کر تر کرتے ہوئے اسی کمرے کی طرف بڑھ آئی۔

اس کا پورا وجود اس لمحے کپکپا رہا تھا۔ اعصاب یوں سن ہو کر رہ گئے تھے۔ کہ اسے ہاتھ میں پکڑے بھاری بھرکم شاپنگ بیگ کو بھی کسی جگہ پر رکھ دینے کا خیال نہیں رہا تھا۔ دھڑکنیں اعتدال پر رہنا بھول گئی تھیں۔

دروازے کے عین قریب پہنچ کر جانے کس سوچ کے تحت اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تھا اور فل زور لگا کر دروازہ آگے کی طرف دھکیلا تو وہ اس کی توقع کے خلاف کھلتا چلا گیا اور منزہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔ ابھی خود کو سنبھال کر اپنے حواس بحال بھی نہ کر پائی تھی کہ نگاہوں کے

سامنے شرم ناک نظارنے ایک لمحے میں اس کے وجود سے نوچ کر روح نکال لی۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کس درجہ بے یقینی کے ساتھ عضنان اور حمنیٰ کو ایک دوسرے میں گم ہوا دیکھا تھا۔

اس کا دل ٹوٹا تھا اور لمحے میں بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

ہاتھ میں پکڑا وہ خوب صورت قیمتی گفٹ، جس میں نجانے اس کی بے لوث محبت کے کتنے ہی رنگ پیک ہوئے تھے۔ اچانک ہاتھ سے چھوٹا تھا اور زمین پر کرچی کرچی ہو گیا تھا۔

سانس اس کے سینے کے اندر ہی کہیں اٹک کر رہ گئی تھی۔

عضنان اور حمنیٰ اس قطعی غیر متوقع صورت حال پر بوکھلا اٹھے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں۔

دروازے کے ہینڈل پر جما اس کا ہاتھ پھسل گیا تھا۔ ٹانگیں جیسے اس کا مزید بوجھ سہارنے کے قابل ہی نہیں رہی تھیں۔ تب دروازے کا سہارا لے کر وہ وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔ عضنان نے فوراً اپنی پوزیشن سنبھالتے ہوئے اس کی طرف پیش قدمی کی تھی۔

''مون! اٹھو یہاں سے چلو گھر......''

وہ چہرہ جو کچھ ہی دیر پہلے شرمندگی سے زرد پڑ گیا تھا۔ اب اسی چہرے پر غصہ چھلک رہا تھا۔ تاہم منزہ کی سماعتیں جیسے کام ہی نہیں کر رہی تھیں۔ اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔ آنکھیں جیسے کچھ بھی دیکھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھیں۔ اسے اپنے محبوب شوہر پر اعتبار نہیں، اندھا اعتبار تھا اور اندھے اعتبار کی دھجیاں جب بکھرتی ہیں تو حواس یوں ہی ساتھ چھوڑ جایا کرتے ہیں۔

وہ بلک بلک کر رونا چاہتی تھی مگر آنکھ سے ایک آنسو نکل نہیں رہا تھا۔

''منزہ! اٹھو اور میرے ساتھ گھر چلو......'' اس بار عضنان نے گرجتے ہوئے اس کا بازو دبوچ لیا تھا۔ سامنے بیڈ پر بیٹھی حمنیٰ عباسی اب بھی خاصی خفگی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کس کے گھر......؟ میرا تو کوئی گھر ہی نہیں ہے......'' بہت مدھم لہجے میں کہتے ہوئے وہ بڑبڑائی تھی جواب میں عضنان نے زبردستی اس کا بازو کھینچتے ہوئے اسے کھڑا کر لیا۔

''ایکسکیوزمی حمنیٰ! میں گھر پہنچ کر کال کرتا ہوں۔'' اب بھی اسے صرف اسی عورت کی پرواتھی جس سے اس کا رشتہ ناجائز تھا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہ منزہ کو لے کر گھر پہنچا تو ذہن اچھا خاصا تپ چکا تھا۔



اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے منزہ کو زور سے بیڈ پر لا کر پٹخا تھا۔

''کیوں آئی تھیں تم وہاں؟ میری جاسوسی کرنے......؟ کیا جاننا چاہتی ہو تم کہ میرا اور حمنیٰ کا رشتہ کیا ہے؟ یہی جاننا چاہتی ہوناں تم تو سنو...... ہم دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ نہیں رہ سکتا میں اب اس کے بغیر لہٰذا...... تمہیں اگر میری زندگی میں رہنا ہے تو اس کا وجود برداشت کرنا ہوگا۔ بصورت دیگر تم جو چاہو کر سکتی ہو......؟''

کیسا عیار اور سفاک شخص تھا وہ اس کے پاؤں کاٹ کر چھوڑ جانے کی اجازت دے رہا تھا۔

منزہ کے اندر اسی لمحے بہت کچھ ٹوٹا تھا۔

مدت سے اس کا دل چاہا کہ وہ اس کا گریبان پکڑ کر پوچھے کہ تین سال پہلے جس جنوں خیز محبت کا دعویٰ اس نے اس کے ساتھ کیا تھا وہ کیا تھی؟

یہ مرد کی محبت، ہر نئے موڑ پر رنگ کیوں بدل لیتی ہے؟ مگر...... اس کے لب اب بھی ساکت رہے۔ عضنان اور بھی جانے کیا کچھ کہہ گیا تھا مگر وہ بے حس سی بستر پر اوندھے منہ پڑی رہ گئی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر چلا گیا تو اس کے حلق سے ہلکی سی سسکاری نکلی تھی۔

''مما......''

''بالکل کسی چھوٹے سے معصوم بچے کی مانند اپنی مما کو پکارتے ہوئے بالآخر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ اس لمحے اسے کسی چیز کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اپنے چھوٹے سے معصوم بچے کا بھی نہیں جو پچھلے تین چار گھنٹوں سے اس سے دور تھا۔

عضنان کو گمان ہی نہیں سو فیصد یقین تھا کہ اس کی ذات کا اتنا گھٹیا روپ دیکھنے کے بعد بھی دنیا کی ستر فیصد عورتوں کی طرح وہ بھی رو دھو کر صبر کرے گی اپنے والدین کو وہ اس کے لیے تین سال پہلے ہی چھوڑ چکی تھی۔ سسرال کی سپورٹ اسے ویسے ہی میسر نہیں تھی۔ بھرے شہر میں نہ کوئی عزیز دوست تھی نہ رشتہ دار' لہٰذا وہ مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر تھی اور اسی چیز نے اسے مزید شیر کیا تھا۔

مگر...... اسے معلوم نہیں تھا جو اپنے آپ سے بڑھ کر کسی کو چاہنا اور پھر اس کی چاہت میں مٹ جانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنا اعتبار ٹوٹنے، پر چاہت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جانے پر' انتہائی حد تک پاگل ثابت ہوتے ہیں۔

رات بھر وہ روتی رہی تھی جب کہ عضنان ننھے اذان کو سنبھالتا لاؤنج میں ہی صوفے پر سو گیا تھا۔ اسے اپنے کسی بھی فعل پر کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو پیدا ہی صرف راج کرنے کے لیے کیا ہے۔ بیک وقت چار شادیوں کی اجازت دے کر اس کی خوشی اور راحت کا کتنا خیال رکھا ہے۔

اتفاق سے اس روز سنڈے تھا۔ لہٰذا صبح ہوتے ہی بیدار ہو کر پہلے اس نے اذان کے لیے فیڈر بنایا۔ پھر ایک کپ چائے اپنے لیے بنا کر ٹی وی آن کر لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ منزہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنے کے بعد اب اس کے ساتھ کس طرح کا رویہ اپنائے گی اور ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے کمرے سے نکل کر تھکے تھکے سے قدم اٹھاتی اس کے قریب چلی آئی۔

عضنان نے دیکھا۔ وہ پھول کی مانند خوشنما سی لڑکی فقط اک رات میں ہی مسمار ہو کر رہ گئی تھی۔ اس لمحے اس کے دل کو کچھ ہوا تھا مگر وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جس کی خوب صورت آنکھوں کے گوشے اس وقت بھی نم ہو رہے تھے۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس نے سر اٹھا کر اپنے بچے کی طرف نگاہ کی تھی۔ پھر براہ راست عضنان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں اور مجھے خود پر بھی بے حد افسوس ہے کہ میں نے محبت جیسے مقدس اور بے لوث جذبے کے لیے تم جیسے شخص کا انتخاب کیا۔ جسے سچے جذبوں کی حرمت کا احساس بھی نہیں ہے۔''

'' تم جیسے نفس کے غلام لوگ اس قابل ہی نہیں ہوتے کہ کسی کی سچی اور پرخلوص رفاقت تمہیں نصیب ہو۔ بہر حال ہر انسان اپنی مرضی کی من پسند زندگی گزارنے کا حق دار ہے۔ سو آج کے بعد میرا وجود تمہاری کسی آرزو کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ میں آج ابھی اور اسی وقت بقائمی ہوش وحواس تم سے ڈائیورس طلب کرتی ہوں پلیز مجھے آزاد کر دو......''

''کیا......؟'' اس کے کپ سے چائے چھلک کر کپڑوں پر گر گئی تھی مگر اسے احساس تک نہ ہوا۔ ایک جھٹکے سے اپنی نشست چھوڑ کر منزہ کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے اس نے کس درجہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا کچھ پتہ بھی ہے تمہیں کہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''مجھے طلاق چاہیے عضنان ابھی اور اسی وقت۔'' اس کا انداز وہی تھا......''

''شٹ اپ تم شاید بھول رہی ہو کہ ہمارا ایک چھوٹا سا بیٹا بھی ہے۔ جسے ہم دونوں



کے پیار کی یکساں ضرورت ہے۔''

''نہیں۔ میرے بیٹے کو تمہارے پیار کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے معصوم بیٹے پر تم جیسے گھٹیا شخص کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی لہٰذا ابھی اور اسی وقت تمہارا گھر چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے جا رہی ہوں۔ ابھی اور اسی وقت مجھے آزاد کر دو پلیز......''

وہ جس قدر سراپا محبت تھی اسی قدر ضدی بھی تھی اور اس بات کا اندازہ عضنان کو اس وقت بخوبی ہو رہا تھا۔ وہ اس کے کہے پر اسی وقت آزاد کر سکتا تھا کیونکہ آج کل دل و دماغ پر حمنیٰ عباسی کی سحر انگیز محبت و قربت میں جکڑ کر مفلوج ہو گئے تھے۔ اب منزہ سے محبت اس کا مسئلہ نہیں تھی مگر...... اس وقت درمیان میں انا گڑھ گئی تھی۔ اس کی ڈیمانڈ فوری پوری کرنا عضنان کو اپنی عزت نفس اور مردانی کی توہین محسوس ہو رہی تھی۔ لہٰذا بے گانگی سے رخ پھیرتے ہوئے بولا۔

''سوری۔ ڈرائیورس تو میں تمہیں نہیں دوگاں گا کر لو جو کرنا ہے۔''

منزہ کا دل پھر دکھا تھا تاہم ساتھ ہی یہ سوچ کر آنکھوں میں آنسو بھر لائی تھی کہ وہ اس کے بغیر جینے کا حوصلہ نہیں رکھتا تب ہی اسے خود سے الگ نہیں کر رہا۔ اندر کہیں وہ خود یہی چاہتی تھی کہ ان کا تعلق نہ ٹوٹے اور بے شک عضنان نے اس کا مان رکھ لیا تھا۔ اس کے لفظوں کو کسی خاطر میں لاتے ہوئے وہ وہی کر رہا تھا جو اس کا اپنا دل چاہ رہا تھا مگر......

خوش فہمی کے یہ چراغ بہت تھوڑی دیر کے لیے جلے تھے۔ وہ ابھی سرخرو بھی نہ ہو پائی تھی کہ اسی سنگ دل نے اس کا آخری بھرم بھی توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔

رخ پھیرے پھیرے ہی وہ ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنساتے ہوئے بولا تھا۔

''یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے بغیر نہیں سکتا یا اپنی کسی دلی کمزوری کی وجہ سے ایسا کہہ رہا ہوں۔ میرا اپنا دل بھی تمہاری طرف سے بھر گیا ہے۔ روز روز کے جھگڑوں، پابندیوں اور سوالوں جوابوں سے تنگ آ چکا ہوں میں لہٰذا تمہیں جہاں جانا ہے جاؤ۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔''

یہ لفظ جو اس نے ادا کیے تھے۔ ان لفظوں کی ادائیگی کے لیے اس کے دل نے اسے کوئی اجازت نہیں دی تھی مگر پھر بھی محض اپنی انا کا پرچم بلند رکھنے کے لیے اس نے وہ سب کہہ دیا تھا جو شاید منزہ کبھی کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اس لمحے اسے ایک اور دھچکا لگا تھا۔ آخری سانس لیتے دل سے درد کی ایک اور ٹیس اٹھی تھی اور وہ بناء اس کی طرف دیکھے نہایت شکستہ انداز میں چپ چاپ اپنے بیٹے کی طرف

بڑھ آئی تھی جو سامنے ہی صوفے پر لیٹا دودھ پی رہا تھا۔ منزہ نے آگے بڑھ کر جوں ہی اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا۔ عضنان نے لپک کر اذان کو اس کے ہاتھوں سے چھین لیا۔

"تم شاید بھول رہی ہو محترمہ! کہ اولاد پر اس کے باپ کا حق ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ گھر چھوڑنا ہے تو میرے ساتھ ساتھ میرے بیٹے کو بھی چھوڑنا ہوگا۔"

اسے انا کے پرچم کا سرنگوں ہونا بھی گوارا نہیں تھا اور منزہ کا اپنی زندگی سے چلے جانا بھی، تب ہی ایسے اوچھے ہتھکنڈے اپنا رہا تھا۔

منزہ کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔ کتنی ہی دیر وہ اپنا سرد ہاتھ صوفے کے بازو پر جمائے اپنے بیٹے کی معصوم صورت کو دیکھتی رہی پھر تھکے تھکے سے قدم باہر لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھا دیے۔ عضنان کا دل پھر سے مچلا تھا۔

وہ خالی ہاتھ اس کی دہلیز سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہی تھی تب ہی وہ چلایا تھا۔

"تم پچھتاؤ گی منزہ اس چھوٹی سی بات کو ایشو بنا کر تم اتنا بڑا قدم اٹھا رہی ہو۔ اسے نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے میں جانتا ہوں تمہیں میرے بغیر کہیں سکون نہیں ملے گا ابھی بھی وقت ہے رک جاؤ۔"

مگر اس کے قدم نہیں رکے تھے۔ وہ مچلتا' چلاتا وہیں کھڑا رہ گیا تھا اور محبت اس کی زندگی سے رخصت ہو گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ منزہ نے جذبات میں آ کر جو بڑا قدم اٹھایا ہے اس پر جلدی پچھتا کر شام کو گھر واپس لوٹ آئے گی مگر وہ لوٹ کر گھر واپس نہیں آئی تھی۔

بھرے شہر میں سوائے مسز ہمدانی کے گھر کے اس کی اور کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ سو تھکے تھکے شکستہ قدموں کو گھسیٹتی وہ ان ہی کے پاس چلی آئی تھی۔ اس وقت مسٹر ہمدانی بھی گھر پر تھے۔ منزہ نے عضنان کے متعلق کچھ بھی چھپانا گوارا نہیں کیا تھا۔ مسٹر ہمدانی خود بھی اس کی غلط حرکتوں سے باخبر تھے مگر وہ اس درجہ گرا ہوا ہوگا اس بات کا انہیں گمان نہیں تھا۔ بڑے بھائیوں کی طرح انہوں نے منزہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے ڈھیروں تسلی دی تھی۔

مسز ہمدانی نے بھی اس موقع پر بڑی بہنوں سا کردار ادا کیا تھا۔ وہ بہت دیر تک ان کے گلے لگ کر روتی رہی تھی۔ مسٹر ہمدانی کے آفس جانے کے بعد انہوں نے منزہ کو ناشتہ کراتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"یہ سب کچھ جو تمہارے ساتھ ہوا نہایت افسوس ناک ہے منزہ! مگر بدقسمتی سے



ہمارے معاشرے کی تقریباً ساٹھ فیصد عورتیں اس وقت اسی افسوس ناک المیے سے دوچار ہیں۔ مردوں کی بے راہ روی کی کوئی حد نہیں اور اس کا باعث خود عورت ذات ہی بن رہی ہے ڈیئر خیر اب آگے کے لیے کیا سوچا ہے تم نے.....؟"

"پتہ نہیں۔ میرا دماغ مفلوج ہو کر رہ گیا ہے مسز ہمدانی! کچھ سمجھ نہیں لگ رہی کیا کیا کروں؟" اس کا حال واقعی افسوس ناک تھا۔ مسز ہمدانی نے بڑے تحمل سے اس کا جواب سنا تھا۔

"او کے فی الحال آرام کرو پھر بعد میں اس موضوع پر کوئی بات کریں گے۔" اسے اپنے کمرے کے ساتھ ہی ایک نفیس کمرے میں بٹھا کر وہ آرام کی تلقین کرتی باہر نکل گئیں تو منزہ پھر سے سوچوں کے عذاب میں الجھ کر رہ گئی۔

ادھر عضنان اس کے انتہائی فیصلے پر غصے سے کڑھ رہا تھا۔ ننھے اذان کو سنبھالنا کسی مشقت سے کم نہیں تھا اوپر سے گھر کے ابتر حال نے اسے اور بھی پریشان کر ڈالا۔

حمنیٰ نے اس تمام واقعے کے لیے اس سے ایکسکیوز کیا تھا۔ ساتھ ہی چوکیدار کو بھی سخت ڈانٹتے ہوئے نوکری سے برخاست کر دیا کہ اس نے منزہ کو اس گھر کے اندر کیوں داخل ہونے دیا؟

وہ دن بہت مشکل سے کٹا تھا اس کا اور رات اس سے بھی زیادہ کٹھن ثابت ہوئی۔

ہر کروٹ پر منزہ کے آنسو اس کی باتیں اس کا دل جلا رہی تھیں۔

وہ پاس تھی تو کبھی اس کی اہمیت کا احساس نہ ہو سکا تھا اور آج تین سال کے بعد پہلی بار نگاہ سے دور ہوئی تھی تو اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔ ہر وقت مما...... مما کا راگ الاپتا اذان اسے مزید ڈسٹرب کر رہا تھا۔ تنگ آ کر اس نے کراچی میں ہی مقیم اپنی بڑی آپا سے رابطہ کیا تھا۔ جنہوں نے اس کی تمام بپتا سن کر اس مشکل وقت میں اس کا بڑا ساتھ دیا تھا۔ اذان کو صبح آفس جاتے ہوئے وہ ان کے سپرد کر جاتا تھا پھر شام میں تھکا ہوا نہ ہوتا تو جا کر اپنے ساتھ واپس لے آتا۔

فقط ایک ہفتے میں ہی اس کی ہمت ٹوٹ گئی تھی۔ اب وہ حمنیٰ کے ساتھ اس کے گھر نہیں جاتا تھا بلکہ حمنیٰ اس کے ساتھ اس کے گھر آ جاتی تھی۔ جانے کیا بات تھی کہ اذان اسے دیکھتے ہی چلا چلا کر رونا شروع کر دیتا تھا۔ فقط چند ہی ہفتوں میں وہ بے حد کمزور ہو کر رہ گیا تھا۔

آج منزہ کو گھر سے گئے پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور اس ایک ہفتے میں سارے گھر کی رونق ماند پڑ گئی تھی۔ شیشے کی مانند چمکتا گھر گرد آلود ہو گیا تھا۔ بیڈ روم، لاؤنج، کچن سب کا حال ابتر ہو رہا تھا اوپر سے ننھے اذان کو سنبھالنا کسی مشقت سے کم نہیں تھا۔

اس کے اپنے کندھوں پر گھر داری کا بوجھ پڑا تو اخراجات بھی بڑھتے چلے گئے تھے۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی چیز رہ جاتی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے میں اس کا لانڈری اور کھانے کا بل ہی اتنا بن گیا تھا کہ دیگر کچھ ضروری اشیاء کی خریداری ملتوی کرنی پڑی تھی۔ منزہ کی موجودگی میں اسے کبھی کسی ذمہ داری کا احساس نہیں ہوا تھا۔ وہ خود ہی سب کچھ سلیقے اور سمجھ داری سے سنبھالتی تھی۔ ایک ساتھ گھر اور بچے کو سنبھالنا قطعی اتنا آسان نہیں تھا۔ جتنا وہ منزہ کے ہوتے ہوئے سمجھتا تھا۔

خالی دل، خالی گھر اور خالی بستر اس کی وحشتوں میں اضافہ کر رہے تھے۔

اس روز حمنیٰ اس کی طرف آئی تو بڑی دل چسپ نگاہوں سے اردگرد اطراف میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''گھر کا حال تو بڑا ابتر ہو رہا ہے عازی! جب تک تمہاری مسز واپس نہیں آتی کوئی ملازمہ ہی رکھ لو۔''

''ہاں۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اخبار میں اشتہار تو دے دیا ہے اب اللہ نے چاہا تو جلد ہی کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔'' اس کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔ تب ہی وہ اس سے پوچھ بیٹھی۔

''منزہ کا کچھ پتا چلا کہاں گئی ہے......؟''

''ہاں......ابھی پرسوں ہی معلوم ہوا ہے۔

مارکیٹ میں مسز ہمدانی کے ساتھ دیکھا تھا میں نے اسے......'' پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اچانک اس نے حمنیٰ عباسی سے پوچھا۔

''سنو......اگر میں کہوں کہ میں تمہیں پر پوز کرنا چاہتا ہوں تو کیا......تم میری اس خواہش کا مان رکھو گی؟'' کیسا غیر متوقع سوال پوچھا تھا اس نے حمنیٰ عباسی کے چہرے کا رنگ اس لمحے دیکھنے لائق تھا۔

''یہ......یہ تم کیا کہہ رہے ہو......؟''

''میرے سوال کا جواب دو حمنیٰ پلیز......''

''نہیں......میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اپنی خوشیوں کے لیے اپنی ماں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔''

''میں انہیں اکیلا چھوڑنے کی بات نہیں کر رہا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہیں



گی......'' عضنان نے فوراً وضاحت کی تھی، مگر حمنیٰ عباسی کے چہرے کا رنگ بحال نہیں ہوا۔

''پھر بھی، ابھی یہ سب مناسب نہیں ہے پلیز مائنڈ مت کرنا۔ ابھی میرے لیے فوری طور پر کوئی بھی فیصلہ کرنا ممکن نہیں......'' بڑی سہولت سے اس نے دامن بچاتے ہوئے کہا تھا۔ تاہم عضنان کو اس کی یہ ادا بھی پسند آئی تھی۔

''فیصلہ کوئی بھی ہو سوچ سمجھ کر کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔'' اس روز پھر سے حمنیٰ عباسی کی قربت میں وہ اپنی موجودہ تمام پریشانیاں فراموش کر گیا تھا۔

اگلے روز اس نے ایک عدد ملازمہ رکھ لی تھی جو باسلیقہ بھی تھی اور پڑھی لکھی بھی۔۔ لہٰذا وہ اذان کو مستقل بڑی آپا کے ہاں سے لے آیا تھا۔ تاہم یہ سکون بھی چند روزہ ثابت ہوا۔

ابھی ملازمہ کو ڈیوٹی سنبھالے چند روز بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس کے گھر کی بیشتر قیمتی اشیاء جو منزہ نے سگھڑ بیویوں کی طرح ایک ایک پیسہ جمع کر کے بڑی مشکل سے خریدی تھیں غائب ہو گئیں۔ اذان کو مختصر عرصے میں دو دفعہ شدید چوٹ لگی۔ پہلی بار وہ سیڑھیوں سے پھسل کر گرا تھا اور اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ دوسری بار جھولے سے گرا اور سر پر چوٹ کھا بیٹھا۔ ملازمہ نے اس کا خیال رکھنا تو در کنا عضنان کو آفس میں اطلاع دینا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ دونوں بار ساتھ والی ہمسائی نے اسے فون کر کے ایمرجنسی اطلاع دی تھی۔ اس کے علاوہ صفائی ستھرائی میں بھی وہ لاپروائی سے کام لیتی تھی۔ کبھی عضنان کی ضروری فائلیں اٹھا کر وارڈ روب میں رکھ دیتی تو کبھی اس کے موزے گم کر دیتی۔ عضنان استفسار کرتا تو لاعلمی کا اظہار کر دیتی۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک جاتا تھا تب کہیں جا کر چیز ملتی تھی۔

عضنان اس تمام صورت حال سے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ پندرہ دن کے اندر ہی اس کا حساب کر کے اسے چلتا کر دیا۔ پچھلے ایک ماہ میں اذان نے رو رو کر اس کا ناک میں دم کر دیا تھا۔ دو تین بار بیمار بھی ہو گیا تھا۔ لہٰذا شدید مجبور ہو کر اس روز وہ اسے ساتھ لیے مسٹر ہمدانی کے گھر چلا آیا۔

موسم اچھا تھا اور وہ سب لوگ لان میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ منزہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ عضنان قریب آیا تو اسے سنائی دیا۔ وہ غالباً اپنی ماں سے بات کر رہی تھی۔

''میں آپ کے پاس آ رہی ہوں مما میرا کوئی بھی نہیں رہا۔ پلیز پاپا سے کہیے اپنی

مانو کو معاف کر دیں۔ میں نے آپ لوگوں کا دل دکھانے کی سزا پالی ہے مما پلیز......''

وہ ٹھنکا تھا۔ منزہ اسے چھوڑ کر سچ مچ اپنے والدین کے پاس چلی جائے گی۔ اس سوچ نے ہی اس کے اندر گہرا اضطراب بکھیر دیا تھا۔ ہمدانی صاحب گھر پر نہیں تھے۔

لان میں اس وقت منزہ، مسز ہمدانی اور ان کی دو نوجوان بیٹیاں ہی بیٹھی تھیں جو عضنان کے آنے پر فوراً اٹھ کر اندر راہداری کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

''السلام علیکم!'' مسز ہمدانی کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے فوراً سلام جھاڑا تھا۔

جواب میں انہوں نے اس کی طرف متوجہ ہو کر فوراً جواب دے دیا۔

''وعلیکم السلام۔ آیئے بیٹھے مسٹر عضنان! کہیے کیسے آنا ہوا......؟''

منزہ بھی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اپنا سیل آف کر گئی تھی۔

''اذان بہت تنگ کر رہا تھا۔ شاید اسے منزہ کے بغیر رہنے کی عادت نہیں ہے۔ مجھے معلوم تھا یہ محترمہ یہیں ہوں گی لہٰذا مجبور ہو کر یہاں چلا آیا۔ لو سنبھالو اپنا بچہ......'' اذان کو اس کے سپرد کرتے ہوئے اس نے اپنی بے بسی کا اعتراف کیا تو ایک مرتبہ پھر اس کے لبوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''آپ ہر کام مجبوری میں کرتے ہیں مسٹر عضنان! کبھی کوئی کام دلی رضا سے بھی کر لیا کریں۔'' اس کے طنز پر عضنان نے قدرے شکایتی انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ بھی تو ہر فیصلہ جذباتیت میں رہ کر کرتی ہیں۔ زندگی جذباتیت کے سہارے بسر نہیں ہوتی۔''

''یہ خالص میرا مسئلہ ہے مسٹر عضنان! آپ اپنی زندگی کے بارے میں سوچیے۔''

''پلیز منزہ! جذبات میں آ کر وہ قدم کبھی مت اٹھانا جو ہم دونوں کے لیے یکساں تکلیف دہ ہو......''

بہت دنوں بعد اسے اپنے مقابل پا کر وہ پھر سے موم ہو گیا تھا۔ تاہم منزہ نے اس کے جذبات کی پروا نہیں کی۔

''آئی ایم سوری مسٹر عضنان! مگر مجھ سے پہلے ہی آپ یہ قدم اٹھا چکے ہیں۔ میں نے تو ہر کٹھن موسم میں بھی ساتھ نبھانے کی کوشش کی تھی مگر آپ نے...... سرعام میرے دل و



اعتبار کو تختہ دار پر لٹکا دیا لہٰذا اب ہمارے راستے کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ نے آسانی سے مجھے طلاق نہیں دی تو میں اپنے پاپا سے کہہ کر خلع کا نوٹس بھجوا دوں گی پھر آپ کے پاس سوائے مجھے آزاد کرنے کے کوئی چارہ نہیں رہے گا۔''

''شٹ اپ۔ میں تمہیں ایسا کوئی قدم اٹھانے نہیں دوں گا۔ نہ ہی میرے جیتے جی تم اپنے آپ کو مجھ سے الگ کر سکتی ہو سمجھی تم......'' دھاڑ کر قطعی درشت لہجے میں کہتا وہ اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''پلیز اسے سمجھائیں مسز ہمدانی! میں نے دنیا کا کوئی انوکھا کام نہیں کیا ہے جو یہ یوں جذباتی ہو رہی ہے۔ آج کل کے معاشرے میں' مرد کے لیے کسی چیز پر کوئی پابندی نہیں......'' وہ اس کے لیے جذباتی ہو رہا تھا اور اسے اپنے کیے پر کوئی پشیمانی بھی نہیں تھی۔

منزہ کا دل اس لمحے بہت زیادہ جلا تھا۔

''پرائے گھر میں چیخ چلا کر زیادہ شور مچانے کی ضرورت نہیں ہے عضنان! کان کھول کر سن لو۔ میرا دل تمہارے لیے مر چکا ہے اور دل مر جائے تو پھر زندہ رہنے کے کوئی اصول و قواعد نہیں ہوتے۔ میں صاف ستھری ایمان دار لڑکی ہوں اور مجھے اپنے لیے بھی ایسے ہی ساتھی کی خواہش تھی مگر تم......تم میرا غلط انتخاب ثابت ہوئے لہٰذا میں کسی قیمت پر اب تمہارے ساتھ رہنا گوارا نہیں کر سکتی۔ تمہیں اپنی مردانگی کا اتنا ہی غرور ہے تو جاؤ جا کر شوق سے اپنی حسرتیں پوری کرو۔ بناؤ اپنے وجود کو جہنم کا ایندھن۔ میری ذات تمہارے کسی شوق کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی میں دوبارہ تمہاری زندگی میں آؤں گی اس خوش فہمی کو اب کبھی دل میں جگہ مت دینا یہی بہتر ہو گا تمہارے لیے......''

وہ نازک سی لڑکی جس نے آج تک اس پر صرف اپنے پیار کے پھول ہی نچھاور کیے تھے اب کیسے پتھر بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس لمحے عضنان نے خود کو قطعی بے بس محسوس کیا تھا۔

وہ گھر واپس آیا تو اس کا پورا وجود تھکن کا شکار تھا۔ ذہن میں بار بار منزہ کی تلخ باتیں گردش کر رہی تھیں۔ رات تک اچانک تیز بخار کا حملہ ہو گیا۔ شاید یہ شدید ذہنی پریشانی کے باعث ہوا تھا۔ رات بھر وہ تیز بخار میں جلتا رہا مگر کوئی اس کا حال پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا۔ پہلے کبھی سر میں ہلکا سا درد بھی ہو جاتا تھا تو منزہ تمام کام چھوڑ کر اس کے پاس

بیٹھ جاتی تھی پھر اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر یوں نرمی سے دباتی کہ اسے فوراً نیند آ جاتی۔ ایک دو بار اسے تیز بخار ہوا تھا تو وہ پوری رات اس کے ساتھ جاگتی رہی تھی۔ ہر نماز میں رو رو کر خدا کے حضور اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی تھی۔

اس نے کبھی اسے بلاضرورت محلے میں کسی کے گھر جاتا نہیں دیکھا تھا۔ اس کا سیل بھی تمام وقت خاموش پڑا رہتا تھا۔ صرف عضنان سے رابطے کے وقت ہی وہ اسے استعمال کرتی تھی۔ عضنان اس کی اچھائیوں کو یاد کرنا نہیں چاہتا تھا مگر...... وہ اپنی ہر اچھائی کے ساتھ اسے یاد آ رہی تھی۔ کبھی کھلکھلا کر ہنستی ہوئی تو کبھی چپ چاپ آنسو بہاتی ہوئی، کبھی رعب سے جھگڑا کرتی تو کبھی پھٹی پھٹی سی نگاہوں میں حد درجہ بے یقینی لیے اس کی طرف دیکھتی ہوئی۔

بیڈ روم کی ہر چیز میں اس کا عکس جھلک رہا تھا۔ کتنی ظالم تھی وہ ایک چیز بھی اپنے ساتھ لے کر نہیں گئی تھی۔

اس رات وہ اپنے دل سے بہت لڑا تھا۔ منزہ کی ضد کو شکست دینے کے لیے کسی اور لڑکی کا ہاتھ تھامنے کے بہت سے ارادے بنائے تھے اس نے مگر وہ اپنے دل سے جیت نہیں پایا تھا۔ اس کا بنایا ہر ارادہ، ریت کی دیوار ثابت ہوا تھا۔

مکان دل میں کسی نئے وجود کو بسانے کے لیے وہاں سے منزہ کی دربدری ضروری تھی اور یہی وہ نہیں چاہ رہا تھا۔ اپنے دل سے دربدر ہی تو نہیں کر پارہا تھا اسے۔ بہت کڑھا تھا اس رات وہ مگر جس کے لیے کڑھا تھا اسے تو اس کے احساسات کی خبر بھی نہیں رہی تھی۔ اگلی صبح بخار کے باعث وہ پھر آفس نہیں جا سکا تھا۔ بخار کی حرارت رات کی نسبت کم تھی لہٰذا چائے کا کپ بنا کر وہ بیڈ روم میں ہی چلا آیا تھا۔

ابھی اس نے کپ خالی بھی نہیں کیا تھا کہ اس کا آفس کولیگ نوید رانا اس کی مزاج پرسی کے لیے چلا آیا۔ عضنان کو علالت کے باوجود اس کے لیے ایک کپ چائے مزید بنانی پڑی تھی۔

"خیریت...... یہ اچانک بیٹھے بٹھائے بخار کو کیوں گلے لگا لیا......؟" اس کے مقابل بیٹھے نوید رانا نے ابتدائی رسمی گفتگو کے بعد اچانک راز داری سے پوچھا تھا۔ جواب میں وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر قدرے تھکے تھکے سے لہجے میں بولا۔

"بس ویسے ہی یار! شاید موسم کا اثر ہے......"

نوید کے لب اس کے الفاظ پر یوں مسکرائے تھے گویا اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔



"دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے......" پورے آفس میں وہی سب سے زیادہ عضنان کے قریب تھا اور ہمیشہ اس کی اچھی نصیحتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا کرتا تھا۔

"دل نہ جلا یار! پہلے ہی طبیعت سکون میں نہیں ہے......" اس کے ایک ایک لفظ سے بوجھل پن کا اظہار ہو رہا تھا۔ شاید تب ہی نوید رانا بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"مجھے افسوس ہے عضی! تم نے کبھی میری کسی نصیحت پر کان نہیں دھرے حالانکہ آج کل کے دور میں ایسے دوست ہی نایاب ہو گئے ہیں جو ہمیں برائی سے روک کر اچھائی کا راستہ دکھائیں۔ قدم قدم پر گمراہی کے گڑھ کھد گئے ہیں۔ کوئی کیسے اور کب تلک سنبھل کر چلے۔ ایمان کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ سب ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی خود اپنی بربادی کے راستے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مسلم حقیقت ہے عضنان جو انسان جس چیز کی رغبت رکھتا ہے مالک دو جہاں اسے اسی چیز کی طرف مزید راغب فرما دیتا ہے۔ جو اللہ سے ہدایت مانگتا ہے اور نیکی کرنے کی خواہش رکھتا ہے مالک پروردگار اسے زیادہ سے زیادہ نیکی کے کاموں کی طرف آنے کی خواہش سے نواز دیتا ہے اور جو اپنے لیے تباہی و گمراہی طلب کرتا ہے پھر اس کی طلب زیادہ سے زیادہ گناہوں کے لیے بڑھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک مقام پر پہنچ کر وہ جنت تک کو خود پر حرام کر لیتا ہے۔ میں جانتا ہوں عضنان گناہ کا راستہ آسان بھی ہے اور وقتی لذت سے لبریز بھی مگر اس لذت کا تعلق صرف ہماری سانس کے چلنے تک محدود ہے دوست۔ شاید تم نہیں جانتے کہ قرآن پاک و حدیث میں اس کا انجام کیا ہے؟ میں مانتا ہوں کہ تم اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کے پورے حق دار ہو مگر بحیثیت مسلمان تمہاری اصلاح کرنا میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔ دیکھو عضنان وطن عزیز اس وقت بہت کٹھن امتحان سے دوچار ہے۔ چاروں طرف سے اس کی بنیادیں ہلانے کی کوششیں زور پکڑ رہی ہیں۔ اسلام دشمن عناصر پوری تندہی سے ہماری نئی نسل کو دین سے دور کر کے بربادی کے اس گڑھے کی طرف دھکیل رہے ہیں جس میں وہ خود پہلے ہی گر چکے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کسی طور ہماری سرخروئی و بھلائی نہیں چاہ سکتے۔ گیارہ ستمبر کے بعد تو پاکستانیوں کے لیے ان کی نفرت اور بھی بڑھ چکی ہے۔ وہ ہمیں ہمارے اللہ سے دور کر کے اپنے مذموم مقاصد پورے کرنا چاہتے ہیں یار اور ہماری بدقسمتی کہ وہ اس میں نوے فیصد کامیاب بھی ہو گئے۔ فقط چار پانچ سالوں میں، پاکستان کے بچے بچے کو داغدار کر کے رکھ دیا ہے انہوں نے۔ وڈیو سیکس اتنا عام کر دیا کہ اب یہ اوریجنل ہمارے شہروں میں بھی دن

رات ہو رہا ہے۔ہم خود اپنے ہاتھوں سے اپنی بربادی و تباہی کی قبریں کھود رہے ہیں۔دل کے نیچے کھرے،سونے جیسے جذبات نفسی ہوس کی زد میں آ کر بے موت مر گئے ہیں۔ ہر مرد اپنی مردانگی کے زعم میں بیک وقت چار چار چھ چھ لڑکیوں کے ساتھ اخلاق سوز کھیل ،کھیل رہا ہے تو عورت اپنی آزادی سے فائدہ اٹھا کر خوشی خوشی اپنی عزت کو داغ دار کرنے کے لیے بے قرار ہے۔ یہاں......اس مکروہ ماحول میں تمہیں حمنیٰ عباسی جیسی بیسیوں مل جائیں گی مگر......منزہ افتخار جیسی شاید ایک بھی نہ ملے۔''اس نے اچانک رک کر گہری سانس بھری پھر بولا۔

''ہمارا المیہ ہے عضنان! یہاں ہم میں سے کوئی ذاتی تجربہ کرنے کے بعد خود ٹھوکر کھا کر سنبھلتا ہے۔ یہاں دوسروں کی نصیحتیں ہم میں سے کسی کے دماغ پر بھی اثر نہیں کرتیں بہر حال میں کل ہمیشہ کے لیے پاکستان سے سعودیہ شفٹ ہو رہا ہوں۔ پھر جانے کبھی زندگی تم سے اتنی ساری باتیں کرنے کی مہلت دے نہ دے لہٰذا میری آخری نصیحت پر کان ضرور دھرنا۔''

عضنان تقریر سے بے زار ہو کر اسے ٹوکنا چاہتا تھا۔اس سے کہنا چاہتا تھا۔

''خدا کا واسطہ ہے یار! یہ لیکچر شپ ختم کر دے یا کم از کم مجھے نشانہ ستم نہ بنایا کر کیونکہ تیری باتیں میرے پلے نہیں پڑتیں۔'' مگر اس کی آخری نصیحت کا سن کا خاموش رہ گیا تھا۔

''بولو......'' قدرے احسان جتانے والے لہجے میں اس نے اجازت دی تھی جب وہ سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا البتہ جو لوگ سیدھے راستے پر چلتے ہیں وہ مر کر بھی کبھی مردہ نہیں ہوتے۔ گناہوں میں انسان نمرود اور فرعون سے بڑھ نہیں سکتا اور دیکھ لو وہ بھی وقت کے ہاتھوں شکست کھا کے بے بس ہو گئے۔ نیکی کے راستے پر چلنا مشکل نہیں ہے بلکہ ہمیشہ خود کو سمجھانا دشوار ہوا کرتا ہے۔ بہر حال ہمیشہ یاد رکھنا عضنان زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔لہٰذا اسے اسی شخص کی محبت میں بسر کرنا چاہیے جس سے ہمارا دل کا رشتہ ہو جسم کا نہیں ......جس سے تعلق دعا اور خلوص کا ہو، ہوس اور ذاتی غرض کا نہیں جس کے ہونے سے ہمارے لیے زندگی کا حسن معنی رکھتا ہو نہ کہ صرف دل بہلانے کے لیے ہم اپنا قیمتی وقت اور پیسہ برباد کرتے رہیں۔ امید ہے تم میری باتوں پر عمل نہیں تو غور ضرور کرو گے......''

اس کا ایک ایک لفظ قیمتی تھا مگر عضنان کا دماغ اس وقت ان قیمتی الفاظ کو قبول کرنے کے قابل نہیں تھا۔ لہٰذا ہمیشہ کی طرح اس نے ایک کان سے اس کی نصیحتیں سنیں اور



دوسرے سے اڑا دیں۔

''او کے اب میں چلتا ہوں لیکن جانے سے پہلے ایک اور اہم بات بھی تمہارے گوش گزار کرنا ضروری سمجھوں گا۔'' چلتے چلتے وہ رک کر بولا تو عضنان گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

''فرمایئے......''

نوید سمجھ رہا تھا کہ اس وقت اس کی باتیں عضنان پر اثر نہیں کر رہی مگر اس کے باوجود اسے سمجھانے سے باز نہیں آیا تھا۔

''دیکھو عضنان حمنیٰ عباسی کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ خوب صورت مرد اور ناجائز پیسہ اس کی کمزوری ہیں وہ ان عورتوں میں سے ہے جن کا تن زندہ رہتا ہے مگر ایمان مر جاتا ہے اور یقیناً ایسی عورت تباہی کا باعث بنتی ہے۔ لہٰذا اگر اس کے چکر میں منزہ بھابی جیسی اچھی عورت کو گنواؤ گے تو یقیناً بہت بڑی حماقت کرو گے......''

''میرے خیال سے یہ بھی خالص میرا ذاتی مسئلہ ہے۔تم صرف اپنے ایمان کی سلامتی کی فکر کرو۔ میرا مجھ پر چھوڑ دو۔ جب کچھ ہو گا تب دیکھا جائے گا فی الحال تو عیش کرنے دو۔ دنیا میں کچھ کرنے کے لیے آئے ہیں ہونے دو جو ہوتا ہے۔ جہاں سب جواب دیں گے وہیں میں بھی دے لوں گا۔تم یہ کرنا کہ سعودیہ جا کر بھی رابطے میں رہنا اور اپنا خیال رکھنا او کے۔''

''ٹھیک ہے فی امان اللہ۔'' اپنی کسی بات پر کوئی مثبت ردعمل نہ دیکھ کر وہ فوراً خاموشی سے سلام کر کے رخصت ہو گیا تھا۔

''جنت......دوزخ......یہ جہاں......وہ جہاں......اچھی عورت......بری عورت......کیا بکواس ہے یار......؟ اتنے ایڈوانس دور میں کوئی جاہل ہی ہو گا جو ایسے موضوعات میں دل چسپی رکھتا ہو گا۔'' نوید رانا کے جانے کے فوراً بعد وہ بیزاری سے بڑبڑایا تھا۔

''اچھی عورت...... ہوں اچھی عورت ہوتی تو یوں چھوڑ کر جاتی مجھے۔ خلع کی دھمکی دیتی......؟ اچھی عورتیں شوہر کے ہاتھوں میں قتل ہو کر بھی اف نہیں کرتیں اور ایک اُس محترمہ کو اپنے شوہر کی ذرا سی خوشی بھی برداشت نہ ہو سکی، لعنت ہے ایسی محبت پر جو صرف اپنی غرض کے لیے ہو......''

اس کا ذہن پھر سے منفی ہو رہا تھا۔ اندر کا اضطراب بڑھا تو اس نے پھر سے کال کر کے حمنیٰ عباسی کو طلب کر لیا۔

اگلے کچھ روز میں حمنیٰ عباسی کے ساتھ ساتھ کچھ اور لڑکیاں بھی اس کی دسترس میں آ گئی تھیں۔ آفس سے آ کر کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ کہیں نکل جاتا۔ موڈ ہوتا تو گھر بھی لے آتا اور شب میں کئی کئی گھنٹے ان سب کے ساتھ موبائل پر مصروف ہوتا۔

آج کل یہی اس کی زندگی کا مقصد بنا ہوا تھا۔ تنخواہ کا نصف حصہ وہ اپنی اسی عیاشی پر صرف کر رہا تھا۔ لڑکیاں خود اس پر اپنا آپ لٹانے کے لیے بے قرار رہی تھیں۔ بڑے آرام سے والدین کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہ اس کی ایک کال پر سر کے بل دوڑی چلی آتی تھیں۔

ایسی دل چسپ مصروفیات میں منزہ افتخار کی یاد اور اس کی کمی کا احساس قطعی مٹ کر رہ گیا تھا۔

ادھر منزہ مسز ہمدانی کے گھر سے اپنے بچے کو لے کر اپنے والدین کے پاس پہنچ گئی تھی جنہوں نے پہلے پہل تو اس پر خاصی خفگی کا اظہار کیا بعدازاں اس کے آنسو دیکھ کر موم پڑ گئے۔

پروفیسر افتخار ویسے بھی بہت سوبر انسان تھے۔ اپنی پوری زندگی انہوں نے نہایت صاف ستھرے انداز میں بسر کی تھی اور یہی درس اپنے بچوں کو دیا تھا۔ منزہ کے علاوہ ان کی ایک اور چھوٹی بیٹی بھی تھی۔ یمنیٰ افتخار جو قرآن پاک کی حافظہ تھی اور اپنی زندگی اسلام کے زریں اصولوں کے عین مطابق پردے کی حدود و قیود میں رہ کر بسر کرنا ہی پسند کرتی تھی۔ منزہ کا مزاج تھوڑا لبرل تھا مگر اس کے باوجود دونوں بہنوں میں غضب کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔

ان کے دو بھائی تھے۔ بڑا بھائی شادی شدہ تھا اور کاروبار میں افتخار صاحب کا ہاتھ بٹا رہا تھا جب کہ چھوٹا ابھی پڑھ رہا تھا۔ کمپیوٹر اور موبائل فون کے تباہ کن دور میں بھی افتخار صاحب اور سعیدہ بیگم کی نیک اور سخت تربیت نے ان کے بیٹوں کو بھی راہ راست سے بھٹکنے نہیں دیا تھا۔ دونوں پابندی سے پانچوں وقت کی نماز ادا کرتے تھے۔ چھوٹے صارم کو پڑھائی سے جتنا وقت فری ملتا تھا وہ دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں صرف کر دیتا لائبریری میں جا کر بڑے بڑے ادیبوں کی زندگیوں کے واقعات پڑھتا تھا۔

بڑا ساجد آفس سے آ کر تمام ٹائم مکمل ایمانداری سے اپنے گھر والوں کی نذر کرتا تھا۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ کسی نہ کسی دوست کے گھر چلا جاتا اور وہیں باقی کے دوست بھی آ جاتے تو کیرم، شطرنج یا اسی طرح کے دیگر کھیل کھیل کر خوب شغل لگاتے۔ کھانا پینا بھی ساتھ چلتا رہتا تھا۔



منزہ نے اپنے والدین سے اپنی اور عضنان کی کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ اس کے چھوٹے چاچو بہت قابل وکیل تھے۔ ان ہی سے صلاح مشورہ کر کے منزہ نے خوب سوچنے سمجھنے کے بعد عضنان کو خلع کا نوٹس بھجوا دیا تھا۔ گو یہ قدم اٹھاتے ہوئے وہ نئے سرے سے پاش پاش ہوئی تھی۔ بچوں کی طرح بلک بلک کر روئی تھی مگر پھر بھی اس نے اپنا ارادہ نہیں بدلا تھا۔

عضنان کی ہزار ہا خامیاں قبول تھیں مگر وہ غلاظت قبول نہیں تھی جس کا چسکا اسے پڑ گیا تھا۔ وہ اسے صرف اپنے لیے پیار کرنے والا دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی محبت میں کسی دوسری لڑکی کی مداخلت گوارا ہی نہیں تھی اسے۔ خود کو لاکھ سمجھانے اور بہلانے کے باوجود اپنے دل کو پھر سے اس کے لیے پہلے جیسا بنانے میں ناکام رہی تھی۔ وہ منافق نہیں تھی وگرنہ شاید خود کو کسی سمجھوتے پر راضی کر ہی لیتی۔

عضنان اس کی طرف سے نوٹس پا کر شاکڈ رہ گیا تھا۔ وہ سچ مچ ایسا کوئی قدم اٹھا لے گی اس نے نہیں سوچا تھا۔ لاکھ اس نے اپنی زندگی کی روش بدل ڈالی تھی۔ لاکھ ان دونوں کے بیچ فاصلے پیدا ہو گئے تھے مگر اس کے باوجود اسے اپنی زندگی سے نکال دینے کا تصور اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔

اس کے اور اپنے بچے کے بغیر وہ جیسے خود کو بہلا رہا تھا۔ محض اس کا دل ہی جانتا تھا۔ جو لڑکیاں روزانہ اسے تفریح فراہم کرنے چلی آتی تھیں وہ اس کا دل اور گھر نہیں بسا سکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ شدید غم و غصے کا شکار ہو کر اس نے کورٹ سے آیا خلع کا نوٹس پھاڑ دیا اور فوراً منزہ کے گھر فون کھڑکا ڈالا۔ جسے افتخار صاحب نے اٹھایا تھا۔

”ہیلو.....“ اپنے ہیلو کے جواب میں افتخار صاحب کی آواز سن کر چند لمحوں تک تو وہ کچھ بول ہی نہیں پایا تھا۔ پھر قدرے ہمت کرتے ہوئے بولا۔

”میں عضنان بات کر رہا ہوں انکل پلیز منزہ سے بات کروا دیجئے۔“

”کس منزہ سے؟ یہاں کوئی ایسی منزہ نہیں رہتی جس کا تم سے کوئی واسطہ ہو۔“

”انکل پلیز! میں جانتا ہوں آپ مجھ سے خفا ہیں لیکن پلیز صرف ایک بار میری اس سے بات کرا دیجئے۔ میں اسے منا لوں گا۔ وہ اتنی آسانی سے مجھے بے مول نہیں کر سکتی.....“ اس کے لہجے میں اپنے ہی آپ نمی کیوں اتر آئی تھی اسے خود بھی پتہ نہ چل سکا تھا۔

”وہ ملے گی تم سے اور بات بھی کرے گی مگر فون پر نہیں کورٹ میں..... آ جانا

پرسوں اس سے ملنے۔'' درشت لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے کھٹاک سے فون رکھ دیا تو عضنان مزید جھنجھلا کر رہ گیا۔

''نہیں ......تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں مون۔ تم میرے پیار کو اتنی آسانی سے نہیں بھلا سکتیں......'' بالکل اچانک منزہ کے لیے اس کا پیار پھر سے جاگا تھا۔ وہ پھر سے اسے پانے کے لیے پاگل ہوا تھا۔ حمنیٰ عباسی اور دیگر لڑکیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا اس نے۔ کسی کا بار بار فون آتا تو غصے سے کاٹ دیتا تھا۔ زیادہ تر گھر سے باہر ہی وقت گزارتا تھا۔ عجیب سی بے سکونی در آئی تھی زندگی میں۔ کسی پل قرار نصیب نہیں ہو رہا تھا۔

اس روز کچھ اور سمجھ میں نہ آیا تو اپنی اور منزہ کی شادی کی تصویر دیکھ کر اس پر چاہت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے رو پڑا۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے مون۔ ہمارے بیچ روٹھنا اور منانا طے ہوا تھا۔ روٹھ کر تعلق توڑنا نہیں۔'' جس مسئلے کو وہ ابھی تک سنجیدہ نہیں لے رہا تھا اسی مسئلے نے بالآخر اسے رلا ڈالا تھا۔ نوید صحیح کہتا تھا۔ اس کے اردگرد حمنیٰ عباسی جیسی نفس کی غلام لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں تھی مگر ان سب ہی لڑکیوں میں منزہ افتخار جیسے اوصاف تلاشنا بہت مشکل تھا۔ لہٰذا اگلے روز صبح ہی صبح وہ اس سے ملنے کے لیے گھر سے نکل پڑا تھا۔

منزہ اس وقت لان میں پودوں کی صفائی کر رہی تھی جب کہ افتخار صاحب سنڈے کی چھٹی کے باعث اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ وہیں بیٹھے ملکی حالات پر تبصرہ کر رہے تھے۔ جب وہ چوکیدار سے جھگڑ کر زبردستی اندر گھس آیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے......؟'' افتخار صاحب کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر دھاڑتے ہوئے بولے تھے۔ جواب میں وہ ایک تشنہ سی نظر حیران کھڑی منزہ افتخار پر ڈالتے ہوئے ادب سے بولا تھا۔

''میں اپنی بیوی اور بچے سے ملنے آیا ہوں۔''

''شٹ اپ۔ میری بیٹی اب تم سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی لہٰذا دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

''نہیں...... میں ہرگز ایسے نہیں جاؤں گا۔ آپ کی بیٹی کو مجھے جواب دینا ہوگا۔ اگر یوں ہی میری زندگی برباد کر کے چھوڑنا تھا تو میرا ہاتھ تھاما ہی کیوں تھا......'' وہ جذباتی ہو رہا



تھا۔ جب کہ منزہ کے بڑے بھائی ساجد نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

''تم جاتے ہو یہاں سے کہ میں تمہاری خدمت کے لیے پولیس بلواؤں......؟''

''کسی کو بھی بلوا لو۔ میں نہیں ڈرتا۔ منزہ......منزہ پلیز! گھر چلو دیکھو مجھے تمہارے بغیر جینے کی عادت نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میں نے جو کیا وہ غلط تھا مگر اس غلطی کی اتنی بڑی سزا مت دو مون کہ ہم تینوں کی زندگی متاثر ہو کر رہ جائے۔ پلیز مون! میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ کچھ بھی غلط نہیں کروں گا پلیز......'' ساجد کو لاپروائی سے جواب دے کر وہ اس سے اپنا گریبان چھڑاتا منزہ کے قریب آیا تو اس کا دل پھر سے سسک اٹھا۔

''نہیں۔ جو زخم تم نے مجھے دیا ہے اس کی تکلیف میں اتنی جلدی نہیں بھول سکتی۔ تم نے خود کہا تھا کہ تم حمنیٰ عباسی کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا میں اگر اسے تمہاری زندگی میں برداشت نہیں کر سکتی تو جو چاہوں فیصلہ کر سکتی ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے عضنان اب مجھے میری مرضی سے زندگی گزارنے دو۔ تم نے خود کہا تھا کہ تمہارا دل میری طرف سے بھر گیا ہے تم مجھ سے تنگ آ چکے ہو پھر اب یہ ڈرامہ بازی کس لیے؟ میں نے تمہیں تمہاری خوشی کے لیے چھوڑا ہے۔''

''مگر میری خوشی اس میں نہیں ہے مون......'' وہ فوراً مچلا تھا۔ ''محبت میں غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں مگر...... سب محبت کرنے والے تمہاری طرح راستہ تو نہیں بدل لیتے۔ میں نے بکواس کی تھی کہ مجھے تمہارے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے فرق پڑتا ہے منزہ بہت زیادہ فرق پڑتا ہے۔''

''میں نہیں جانتی۔ یہ لفظ اب اپنا اعتبار کھو چکے ہیں مسٹر عضنان پلیز جائیے یہاں سے......'' اس سے پہلے کہ اس کا دل اسے پھر خوار کرتا۔ وہ پائپ پودوں میں پھینک کر تیز تیز قدم اٹھاتی اندر چلی آئی تھی کہ اب اسے دوبارہ اپنے والدین کی عزت کی نیلامی گوارا نہیں تھی جب کہ عضنان پیچھے مچلتا رہ گیا تھا۔

وہ اس قدر سنگ دل بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ آج سے پہلے اسے اندازہ نہیں ہو پایا تھا۔ عدالتی کارروائی شروع ہو چکی تھی اور ادھر گھر کے سناٹے اس کی روح کو نوچنے لگے تھے۔ کسی چیز میں اس کی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اپنا من پسند مشغلہ بھی وہ پچھلے کئی دنوں سے ترک کر چکا تھا۔ جواباً جو لڑکیاں اس کی جھولی میں آ کر گرتی تھیں اب وہ اسی کے جیسے اور مرد کی طرف لپک گئیں۔ کسی کو اس کی تنہائیوں اور وحشتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔

فقط چند ہی دنوں میں اس کی صحت بہت بری طرح سے گر گئی تھی۔ اس روز عدالتی کارروائی کے لیے کورٹ آیا تو منزّہ کی گود میں ننھے اذان کو اپنے لیے مچلتا دیکھ کر تڑپ گیا۔ کتنا پیارا گلشن تھا اس کا جسے وہ خود شیطان کے بہکاوے میں آ کر اپنے ہاتھوں سے آگ لگا چکا تھا۔

نوید رانا نے درست کہا تھا۔ حمنیٰ عباسی ان ہی عورتوں میں سے ایک تھی جن کا وجود حرام کی کمائی پر پلتا ہے اور ایک بار کسی کو حرام کھانے کی عادت پڑ جائے وہ پھر اس دلدل سے نکل نہیں پاتا اور نہ ہی نکلنا چاہتا ہے۔ بہت منت کی تھی اس نے منزّہ افتخار کی کہ وہ اس سے جدائی کا فیصلہ واپس لے لے۔ نہیں تو وہ مر جائے گا مگر اس کا دل ایسا پتھر ہوا تھا کہ اب وہ اس کی کسی التجا پر بھی کان نہیں دھر رہی تھی۔

عضنان نے ارادہ کر لیا تھا کہ جیتے جی وہ کبھی اپنے راستے اس سے علیحدہ نہیں کرے گا اور یہی اس نے عدالت میں بھی کہہ دیا تھا۔ اس روز پیشی سے فارغ ہو کر وہ عدالت کے احاطے سے باہر آیا تو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی لہٰذا وہیں سے ہسپتال چلا گیا جہاں ڈاکٹر طیب نے اس کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد کچھ دوائیاں لکھ دیں۔ ساتھ ہی کچھ ٹیسٹ بھی لیے جن کی رپورٹس کل پرسوں تک تیار ہونی تھیں۔

منزّہ نے اس کا بکھرا بکھرا سا سراپا دیکھا تھا اور پھر رنجیدہ ہوئی تھی مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتی جو عضنان کی طرف سے بری طرح خراب ہو چکا تھا۔ اسے جب بھی حمنیٰ عباسی کے ساتھ اس کا تعلق یاد آتا تو وہ نئے سرے سے لہولہان ہو کر رہ جاتی تھی۔

انگلینڈ سے اس کا کزن عاطف یزدان آج کل پاکستان آیا ہوتا تھا۔ اس کا ارادہ پاکستان سیٹل ہوں کا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک وہ منزّہ کا بہت اچھا دوست ثابت ہوا تھا۔ افتخار صاحب اور سعیدہ بیگم کی خواہش تھی کہ منزّہ کی شادی اسی کے ساتھ ہو مگر وہ عضنان کی محبت میں جذباتی ہو کر ان کی آرزوؤں پر پانی پھیر گئی تھی۔ منزّہ جانتی تھی کہ وہ اس سے بے حد پیار کرتا ہے۔

اور اس کا سب سے بڑا ثبوت اس کی لندن سے اس کی وقتاً فوقتاً پاکستان آمد تھی۔ وہ اس کا پھپھو زاد تھا ار پھپھو کے ہی بقول اس کی روح پاکستان کے لیے مچلتی رہتی تھی۔ منزّہ نے کئی بار اس کی آنکھوں میں اپنے لیے بہت خوب صورت جذبات مچلتے دیکھے تھے مگر اس کے ذہن میں تو ہمہ وقت عضنان کی سحر انگیز باتیں گھومتی رہتی تھیں پھر وہ اس کی آنکھوں کے پیغام کیسے پڑھتی۔

عاطف کا مزاج بہت شوخ تھا۔ وہ جب بھی ان کے ہاں قیام کرتا تھا۔ اس کا ناک میں



دم کر کے رکھ دیتا تھا۔ صرف اسے چڑانے کے لیے انگلینڈ کی بیسیوں لڑکیوں کے بے باک قصے سناتا رہتا تھا جب کہ منزّہ اچھی طرح اس کی فطرت کے بارے میں جانتی تھی۔ وہ اپنے کردار اور اپنے ایمان کے بارے میں بہت مضبوط تھا۔ یورپی ماحول میں رہنے کے باوجود اس کی ذات پر اسلامی رنگ غالب تھا۔ بے شک وہ اس قابل تھا کہ اسے چاہا جاتا مگر منزّہ افتخار نے اسے نہیں چاہا تھا۔

اس وقت بھی وہ ملول سی لان کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ جب عاطف دبے پاؤں چپکے سے آ کر اس کے قریب ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ سعیدہ بیگم کی زبانی وہ اس کی شادی شدہ زندگی کے تمام احوال سے باخبر ہو چکا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو مون......؟''

اس کے اچانک سوال پر وہ چونکی تھی پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''کچھ نہیں......''

''کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔'' اب کے وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا تھا۔''

منزّہ جانتی تھی کہ وہ اس سے اپنے دل کا کوئی دکھ نہیں چھپا سکتی تب ہی مغموم لہجے میں بولی تھی۔

''میں عضنان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پتہ ہے عاطی! میں نے پچھلے تین سالوں میں پاگلوں کی طرح اسے ٹوٹ کر چاہا ہے۔ بہت بار ہمارے بیچ جھگڑے ہوئے مگر ان جھگڑوں کے باوجود ہماری محبت کبھی کم نہیں ہوئی۔ وہ خود مجھ سے کہتا تھا کہ میں دیگر عام لڑکیوں سے بہت مختلف ہوں مگر...... اس کے باوجود اس نے مجھے وہی درد دیا جو دوسری عام لڑکیوں کو اپنے بوائے فرینڈ یا شوہروں سے ملتا ہے۔ میری محبت کافی کیوں نہیں لگی اسے......؟''

عاطف یزدان اس کے الفاظ پر چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد بولا تھا۔

''تم بہت جذباتی لڑکی ہو مون! ورنہ اس دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔ میں مانتا ہوں عضنان نے جو کیا وہ غلط تھا مگر وہ اپنے کیے پر پشیمان بھی تو ہے۔ اس نے معافی بھی تو مانگی ہے تم سے...... معافی مانگنے پر تو خدا بھی اپنے بندے کو معاف کر دیتا ہے ڈیئر تم تو پھر ایک انسان ہو......؟''

''مجھے اس سے انکار نہیں ہے لیکن جو فعل اس نے سرانجام دیا وہی اگر مجھ سے سرزد ہو جاتا تو کیا وہ مجھے معاف کرتا؟ تم نہیں جانتے عاطف میں نے کتنا درد سہا ہے۔ جس انسان

سے آپ اپنی زندگی سے بڑھ کر پیار کرتے ہوں۔ وہی آپ کو نظر انداز کر کے کسی اور کی طرف متوجہ ہو جائے تو یہ دکھ جگر کو کاٹ دیتا ہے......''

عاطف یزدان چونکہ خود اس درد کا راہی تھا لہٰذا اس بار وہ عضنان کی حمایت میں کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

عضنان کی حالت آج کل بہت خراب رہنے لگی تھی۔ بڑی آپا کو جیسے ہی اس کے حالات کی خبر ہوئی وہ دوڑی چلی آئی تھیں اور پھر ان ہی کی کوششوں سے عضنان دوبارہ اپنے باپ کے گھر کی دہلیز پر قدم رکھ سکا تھا۔ اس کی مما حفصہ بیگم پچھلے تین سال میں اس کے لیے رو رو کر آدھی رہ گئی تھیں۔

اپنا وہ گھر جہاں اس نے منزہ کے ساتھ بہت خوب صورت دن بسر کئے تھے خالی کر دیا تھا۔ پھر سے اپنی مما کی گود میں آ کر وہ قدرے سنبھل تو گیا تھا مگر اندر کا اضطراب اب بھی قائم تھا۔ اس روز پھر سے طبیعت خراب ہونے پر وہ ڈاکٹر طیب کے پاس آیا۔ تو اس کی رپورٹس آ چکی تھیں۔

''یہ کیسی رپورٹس ہیں۔ میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' ہمیشہ فریش رہنے والے ڈاکٹر طیب کو ملول دیکھ کر اس نے پوچھا تھا جب وہ سرد آہ بھر کر اس کے حسین سراپے سے نگاہ چراتے ہوئے بولے۔

''یہ تمہاری نہیں مس حمنیٰ عباسی کی وہ رپورٹس ہیں جو چھ ماہ پہلے اسی ہسپتال میں خود میری بیوی نے اپنے ہاتھوں سے تیار کی تھیں اور ان رپورٹس کے مطابق مس حمنیٰ عباسی ایڈز کا شکار ہیں......''

''کیا......؟'' وہ شدید حیرانی کا شکار ہو کر چلایا تھا۔

''ہاں عضنان! یہی سچ ہے۔ بدقسمتی سے آج صبح ہی یہ رپورٹس میرے ہاتھ لگی ہیں اور آج صبح ہی یہیں اسی ہسپتال میں حمنیٰ عباسی نے زندگی کو خیر باد بھی کہہ دیا ہے۔''

ڈاکٹر طیب اسے دھچکے پر دھچکا لگا رہے تھے اور اس کا دماغ جیسے ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔

''میری بیوی کی بہت اچھی دوست تھی وہ۔ یونیورسٹی تک دونوں نے اکٹھے پڑھا ہے۔ اسی کی معرفت مس حمنیٰ کی کہانی سامنے آئی ہے۔ ابتداء میں بہت اچھی لڑکی تھی وہ مگر...... یونیورسٹی پیریڈ میں جس لڑکے سے اسے پیار ہوا وہ اچھا لڑکا نہیں تھا۔ کئی لڑکیوں سے تعلقات تھے اس کے۔ جہاں کوئی لڑکی آفر کرتی وہیں چلا جاتا تھا۔ نتیجتاً کوئی شاطر دماغ لڑکی اسے ہاتھ دکھا گئی اور وہ ایڈز کا شکار ہو گیا۔ خود اس موذی مرض کا شکار ہو کر اس نے اپنی گرل فرینڈز کو



اس کا مزا چکھانا شروع کر دیا تھا۔ حمنیٰ عباسی بھی اس کی مکاری کے سبب اسی کے جال میں پھنس گئی۔ نتیجتاً اس کی زندگی کا ہر سانس داؤ پر لگ گیا۔ جب اس پر حقیقت کا انکشاف ہوا تو اس کا دماغ مردوں کے لیے نفرت سے بھر گیا۔ اپنی بربادی کا بدلہ لینے کے لیے اس نے ہر خوب صورت مرد کو نوالہ بنانا شروع کر دیا جہاں تک میرے علم میں آیا ہے اب تک تقریباً ساٹھ، ستر مرد اس کے انتقام کا شکار ہو چکے ہیں اور ان بدنصیبوں میں سے ایک نمبر تمہارا بھی ہے......''

ڈاکٹر عاطف کا لہجہ دھیما تھا مگر اس کے دماغ میں جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ پورا وجود کپکپا اٹھا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ چند دنوں کی وقتی لذت کا انجام اتنا برا ہو گا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اب اسے نوید رانا کی باتوں کی اہمیت معلوم ہو رہی تھی مگر اب وقت گیلی ریت کی مانند اس کے ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔

''دیکھا عضنان! جو لوگ خدا کی قائم کردہ حدود کی نفی کرتے ہیں ان کا انجام کتنا برا ہوتا ہے اور ابھی آخرت کا حساب تو باقی ہے۔'' ڈاکٹر طیب جانے کیا کیا کہہ رہے تھے مگر...... وہ سن کہاں رہا تھا۔ وہ تو ہوا میں تحلیل ہوتے اپنے جسم کے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی سی لذت کی خاطر اپنی دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہوتے محسوس کر رہا تھا۔

اس رات گھر آ کر وہ بہت رویا تھا۔ پوری رات سخت اذیت کے عالم میں بسر ہوئی تھی۔

بے شک جو لوگ جان بوجھ کر گمراہی کے راستوں پر قدم رکھتے ہیں وہ یوں ہی نقصان اٹھاتے ہیں۔

اس رات رو رو کر خدا سے معافی مانگنے کے بعد صبح نماز فجر کی ادائیگی کے ساتھ ہی وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ دن بھر وہ کہاں رہا، کیا کیا، کسی کو کچھ خبر نہ ہو سکی تھی۔ تاہم شام ڈھلے وہ اپنے تھکے تھکے قدموں کو گھسیٹتا منزہ افتخار کے پاس چلا آیا تھا۔ جو لان میں اذان اور اپنے کزن عاطف یزدان کے ساتھ بیٹھی کسی گھریلو مسئلے پر بات کر رہی تھی۔

''مون......'' قریب پہنچ کر جوں ہی اس نے پکارا۔ وہ پھر سے حیران رہ گئی تھی۔

تب عضنان نے آگے بڑھ کر اذان کو اس کی گود سے اٹھایا پھر اپنی بانہوں میں بھر کر جو پیار کرنا شروع کیا تو پھر جیسے اسے خود سے دور کرنا ہی بھول گیا۔ منزہ کے ساتھ ساتھ چھوٹا سا بچہ بھی پیار کی اس شدت پر گھبرا کر رونا شروع ہو گیا تھا۔

''آئی ایم سوری۔'' اذان کو پیار کرنے کے بعد نم ناک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا تو منزہ مزید حیران رہ گئی۔ تب ہی اس نے بایاں ہاتھ بڑھا کر ہونق کھڑی

منزہ افتخار کے گال کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہا تھا۔

''میں پاکستان سے باہر جا رہا ہوں مون! ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لیکن ...... جانے سے پہلے پلیز مجھے یہ اعتراف کر لینے دو کہ میں نے اپنی زندگی میں تمہاری جگہ کبھی کسی کو نہیں دی۔ تم ہی وہ پہلی اور آخری لڑکی ہو جس سے میں نے محبت کی ہے......'' خوب صورت آنکھوں کے گوشوں کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی بھیگنے لگا تھا۔ تب ہی پتھر بنی منزہ کی سختی کا سارا خول چٹخ کر ٹوٹ گیا۔ اس کی آنکھیں بھی لمحوں میں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔ عورت ایسی ہی ہوتی ہے۔ لمحوں میں سارے زخم بھول کر بہل جانے والی۔

عضنان نے چند لمحوں تک اس کی بھیگی پلکوں کو رنجیدگی سے دیکھا تھا پھر اپنا ہاتھ اس کے گال سے ہٹاتے ہوئے شکستہ لہجے میں بولا۔

''جو اذیت میری وجہ سے تمہیں اٹھانی پڑی۔ میں اس کے لیے شرمندہ ہوں مون لیکن آج کے بعد میرے نام کا کوئی دکھ تمہارے دل کی راہ نہیں دیکھے گا۔ میں مکمل ہوش و حواس کے ساتھ تمہیں طلاق دیتا ہوں......طلاق دیتا ہوں......طلاق دیتا ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دینا......''

ٹوٹنے بکھرنے کی اذیت میں مسمار ہوتا وہ شخص گلوگیر لہجے میں اپنی بات مکمل کرنے کے بعد پھر ایک لمحے کے لیے بھی وہاں ٹھہرا نہیں تھا جب کہ خلع کا مقدمہ دائر کرنے والی ''بااصول'' منزہ افتخار اس کے الفاظ پر شاکڈ رہ گئی تھی۔ وہ ہار کر بھی یوں جیت اپنے نام کروا لے گا' اسے گمان نہیں تھا۔

ننھا اذان نیچے گھاس پر بیٹھا ٹکر ٹکر اپنے باپ کی طرف دیکھتا رہا تھا جب کہ وہ جیسے سچ مچ پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ سچ کہا تھا عضنان نے اسے اس کے بغیر سکون میسر نہیں تھا۔

عضنان کے جاتے ہی وہ اپنے تیزی سے گھومتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ عاطف یزدان جو خود بھی تمام غیر متوقع صورت حال پر حیران کھڑا تھا تیزی سے اس کی طرف لپکا تھا۔

وہ رو رہی تھی۔ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی اور اس کے مقابل بیٹھا عاطف یزدان اسے بکھرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''میں اس سے محبت کرتی ہوں عاطی! اسے کہو وہ میرے دل سے اپنی محبت بھی



نکال کر لے جائے۔ وہ مر کیوں نہیں گیا مجھ سے جدا ہوتے ہوئے۔ کوئی یوں بھی کرتا ہے۔ اگر میں ہی اس کی محبت ہوں تو پھر وہ کس کے لیے بے نام کر گیا مجھے۔ اس سے پوچھو عاطی پلیز......'' وہ بھول رہی تھی کہ جدائی کا فیصلہ اُس نے کیا تھا۔ اس لمحے اسے کچھ یاد بھی نہیں رہا تھا۔ محبت جب کسی دل کو اپنا مسکن بنانے کے بعد وہاں سے رخصت ہوتی ہے تو سب کچھ اجاڑ جاتی ہے۔ دور دور تک سناٹے بکھیر کر رکھ دیتی ہے۔

وہ بھی اجڑ گئی تھی۔

اگر عاطف یزدان نہ ہوتا تو شاید یوں بکھر بھی جاتی کہ پھر تا عمر سمٹ نہ پاتی۔ بہت گہرا گھاؤ لگایا تھا محبت نے اس کے دل پر۔

افتخار صاحب اور سعیدہ بیگم نے عضنان کے خود ہی طلاق دینے پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور پھر اس نے زندگی کو جینا چھوڑ دیا۔ جیسے والدین نے کہا اور چاہا وہ ویسے ہی کرتی گئی۔



عاطف یزدان اس کے لیے بہت اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ عضنان سے بڑھ کر اس کا خیال رکھتا تھا مگر اس کے باوجود وہ کبھی عضنان کی جگہ نہ لے سکا۔ خاموشی اور اداسی کا جو قفل عضنان سے جدائی کے بعد اس کے ہونٹوں پر پڑا۔ وہ پھر بیس سالوں میں بھی کھل نہ سکا۔ اس سے دیوانہ وار محبت کا دعوے دار عاطف یزدان اس تمام عرصے میں اپنے لیے اس کی ایک دھیمی سی مسکان کو بھی ترستا رہا تھا۔

پچھلے بیس سال ایک پتھر کے مجسمے کے ساتھ جس حوصلے اور صبر سے اس نے بتائے تھے صرف اسی کا دل جانتا تھا۔ اب تو اسے بھی صبر آنے لگا تھا۔ اس کی بیٹی کالج میں پہنچ گئی تھی۔ اذان اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں پچھلے پانچ سال سے چین میں مقیم تھا۔ پچھلے بیس سال میں منزہ افتخار نے کوئی تہوار' کوئی فنکشن پر اہتمام نہیں کیا تھا۔ افتخار صاحب اور سعیدہ بیگم اس کا دکھ لے کر ہی لحد کے اندھیروں میں اتر گئے تھے مگر اب جیسے اس کے لیے ہر دکھ بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔

عاطف کی طبیعت ان دنوں ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ منزہ کی سرد مہری و بے نیازی نے اسے ویسے بھی اپنے آپ سے غافل کر دیا تھا۔ حقیقی معنوں میں وہ تھک گیا تھا۔ ایک بے حس پتھر دل لڑکی سے سر پھوڑتے پھوڑتے ہار گیا تھا۔

رمضان المبارک کی آمد آمد تھی۔

اس کی بیٹی طائشہ پچھلے کئی دنوں سے اس سے موبائل فون کے لیے فرمائش کر رہی تھی۔
اس روز وہ قدرے فری تھا لہٰذا مارکیٹ کا چکر لگا کر گھر آیا تو طائشہ لاؤنج میں بیٹھی کوئی ناول پڑھ رہی تھی جب کہ منزہ اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھی عاطف کے کپڑے پریس کر رہی تھی۔

''طاشی! دیکھو پاپا آج آپ کے لیے کیا لائے ہیں؟'' اپنی بیٹی کی معصوم خوشی کے لیے بہت قیمتی سیل خریدا تھا اس نے۔ طائشہ کے ساتھ ساتھ منزہ نے بھی سرسری سی نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''او...... پاپا جانی! آپ میرے لیے موبائل لے آئے۔''

ناول صوفے پر پھینکتے ہوئے وہ کسی چھوٹے بچے کی مانند اچھل کر اس کی طرف لپکی تھی مگر اس سے پہلے کہ طائشہ اپنے پاپا کا لایا سیل ڈبے سے نکال کر اچھی طرح دیکھتی منزہ چیل کی طرح اس پر جھپٹی اور موبائل سیٹ اس کے ہاتھ سے چھین کر شدید اشتعال کے انداز سے دور پھینکتے ہوئے بولی۔

''یہ چیز مسلمان بچیوں کے استعمال کے لیے نہیں ہے سمجھی تم......''

اس کے اتنے شدید ردعمل پر عاطف کے ساتھ ساتھ طائشہ بھی سہم کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''نہیں ہے کوئی ضرورت تمہیں فضول چیزوں میں دل چسپی لینے کی۔ میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں جن کی ناک تلے ان کی بیٹیاں اسی موبائل فون کو سہارا بنا کر اپنی دنیا و آخرت تباہ کر لیتی ہیں اور وہ بے خبر کی بے خبر ہی رہتی ہیں سنا تم نے...... اب جاؤ اپنے کمرے میں۔''

زندگی میں پہلی بار طائشہ نے اپنی ماں کو اس درجہ غصے میں دیکھا تھا۔ تب ہی وہ روتے ہوئے بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تو عاطف یزدان کے اندر بیس سال سے خاموش شخص بھی چلایا تھا۔

''یہ کیا حرکت ہے منزہ! اس گھر میں رہنے والے تمام لوگ تمہاری مرضی کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور نہیں ہیں۔ جو غلطیاں ماضی میں تم سے سرزد ہوئیں ان کی سزا تم میری بیٹی کو نہیں دے سکتیں اور نہ ہی میں اپنے بچوں کے معاملے میں تم سے کوئی سمجھوتہ کروں گا۔ سنا تم نے......''

اسی کے انداز میں چلا کر غصے سے تنبیہہ کرتے وہ طائشہ کے کمرے کی طرف بڑھ



گیا تو منزہ وہیں صوفے کے پائے سے سر ٹکا کر چپ چاپ رو پڑی۔

''تم نے میری ساری زندگی میں بے اعتباری کے ببول اگا دیے عضنان احمد' میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' اس کی آنکھوں سے گرنے والے ہر اک آنسو کا سبب آج بھی عضنان کی ذات تھی جس سے جدائی کے بعد اس نے نہ صرف کراچی کو خیر باد کہہ دیا تھا بلکہ پاکستان سے ہی اپنے تمام تعلق توڑ کر دوحہ میں مقیم ہو گئی تھی۔

اس روز موسم بہت خوب صورت تھا۔

رمضان المبارک کا تیسرا عشرہ شروع ہو چکا تھا۔ اسے گھریلو استعمال کے لیے چند چیزوں کی ضرورت تھی لہٰذا وہ مارکیٹ چلی آئی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی کا سلسلہ اچھا لگ رہا تھا۔

اپنی مطلوبہ اشیاء کی خریداری کے بعد وہ گھر واپسی کا ارادہ کر رہی تھی کہ اچانک اتفاقیہ طور پر مسز ہمدانی کے ساتھ اس کا ٹکراؤ ہو گیا۔ بیس سال پہلے جب اس کی بربادی کا آغاز ہوا تھا تب بھی وہ یوں ہی اتفاقیہ ان سے ٹکرائی تھی اور آج تک وہ اسی پچھتاوے کے ساتھ جی رہی تھی کہ کاش مسز ہمدانی نے اسے عضنان کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا ہوتا۔ کاش وہ اس کی ہر حرکت سے بے خبر ہی رہتی تو آج محبت کو کھو دینے کا دکھ اس کے ساتھ نہ ہوتا۔

''ارے...... تم یہاں......؟''

بیس سال پہلے کی طرح مسز ہمدانی نے اس سے اتفاقیہ ٹکراؤ پر مسرت آمیز حیرانگی کا اظہار کیا تھا۔ جواب میں وہ بس ایک پھیکی سی مسکان ہی چہرے پر سجا سکی تھی۔

''آپ یہاں کیسے......؟''

''بس ایسے ہی نند سے ملنے چلے آئے۔ ہمدانی صاحب کی بہن رہتی ہیں یہاں دوحہ میں۔ پچھلے ماہ دل کا بائی پاس ہوا ہے ان کا اسی لیے خیریت دریافت کرنے چلے آئے۔ تم سناؤ عاطف اور بچے کیسے ہیں......؟'' ان کا انداز اب بھی ویسا تھا بیس سال پہلے والا' اپنائیت سے بھرپور......''

''ٹھیک ہیں۔ وہاں پاکستان میں تو سب ٹھیک ہیں ناں......؟'' بہت مختصر لفظوں میں اس نے پوچھا تھا۔ تاہم مسز ہمدانی اس کا سوال سمجھ گئی تھیں تب ہی ہلکا سا سانس بھرتے ہوئے بولیں۔

''ہاں...... سب اپنی اپنی زندگی میں مگن ہیں۔ تمہارے دوحہ آنے کے ایک ہفتے

بعد ہی عضنان کا انتقال ہو گیا تھا۔ دم آخر سنا ہے بہت دیر تک تمہیں اور اذان کو دیکھنے کے لیے تڑپتا رہا تھا۔ ایڈز کا مریض تھا۔ بہت قصے مشہور ہوئے اس کی وفات پر......''

بیس سال پہلے کی طرح مسز ہمدانی اس کی ساعتوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل رہی تھیں اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے پھر سے مسمار ہو رہی تھی۔

''نہیں......وہ......وہ ایڈز کا مریض ہو کر کیسے مر سکتا ہے......؟''

اس کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا۔ اندر جیسے کوئی طوفان بپا ہو گیا تھا مگر مسز ہمدانی اس کی حالت سے بے نیاز اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

''یہی سچ ہے مزہ! اسے تو بہت پہلے پتہ چل گیا تھا۔ وہ کیا نام تھا اس لڑکی کا......؟ ہاں......حمنیٰ عباسی اسی نے برباد کیا تھا اسے تب ہی تو خود آسانی سے طلاق دے دی تھی تمہیں ورنہ وہ اتنی جلدی خود سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ خیر چلتی ہوں تم اپنا ایڈریس دے دو انشاء اللہ میں پہلی فرصت میں تم سے ملنے تمہارے گھر آؤں گی۔''

اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اس نے کیسے مسز ہمدانی کو اپنا ایڈریس بتایا تھا۔

وہ گھر آئی تو اس کے جسم کا ایک ایک عضو درد کر رہا تھا۔ گرم گرم آنسوؤں کا قافلہ جو شفاف گالوں پر رواں ہوا تو پھر یہ سلسلہ دیر تک چلتا ہی رہا۔ خود کو اپنے کمرے میں مقید کر کے جو وہ رونا شروع ہوئی تو پھر آنسوؤں نے تھمنے سے انکار کر دیا۔ آج یہ آخری خلش بھی دل سے نکل گئی تھی کہ عضنان احمد نے اس کی خوشی کے لیے محبت سے دستبرداری کا دکھ قبول کیا تھا۔

اس کی موت کا باعث اس کی ضد نہیں وہ راستہ بنا تھا کہ جس پر چل کر وہ اپنے اصل سے بھٹک گیا تھا۔

بیشک جو جیسا کرتا ہے اسے ویسا ہی صلہ ملتا ہے۔

اپنے اندر کے تمام آنسو عضنان احمد کے لیے بہا دینے کے بعد وہ ہلکی پھلکی ہوئی تو اسے یاد آیا کہ پچھلے بیس سالوں میں اس نے اس شخص کے ساتھ کتنی زیادتیاں کی ہیں جو ہر دکھ اور کڑی دھوپ کے موسم میں اس کی بے نیازی و لاتعلقی کے باوجود کسی کانچ کی گڑیا کی مانند اس کا خیال رکھتا رہا ہے۔ اپنے نام کی ردا اس کی لہولہان روح پر تان کر خود چپ چاپ محبت کے دکھ اٹھاتا رہا ہے۔

وہ جس کا کردار آئینے کی مانند شفاف تھا۔ جس نے کبھی اس سے ہٹ کر کسی دوسری لڑکی کے لیے اپنے دل اور سوچ میں کوئی جگہ نہیں رکھی تھی۔ اسی شخص کو پچھلے بیس سالوں سے



بے قصور ہرٹ کر رہی تھی۔ کسی اور کے غم میں مدہوش ہو کر اس کے حق میں خیانت کر رہی تھی۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ پچھلے بیس سالوں میں اس نے کبھی عاطف یزدان کا کوئی کام اس کے کہے بغیر اپنے ہاتھوں سے نہیں کیا تھا۔ پچھلے بیس سالوں میں نہ وہ اس کے لیے ہنسی تھی، نہ روئی تھی۔ اسے اس کی خوشیوں سے سروکار رہا تھا نہ غموں سے......

پچھلے بیس سال سے اس نے کسی رمضان المبارک یا عید، بقر عید کا اہتمام نہیں کیا تھا۔ اس کی نمازوں میں بھی باقاعدگی اور خشوع خضوع نہیں رہا تھا۔ اللہ سے کچھ بھی مانگنا ہی چھوڑ دیا تھا اس نے۔ عاطف اور طائشہ خود ہی سحری اور افطاری کا اہتمام کرتے تھے۔ وہ رات کو دیر تک شب بیداری کے بعد نیند کی گولیاں پھانک کر جو سوتی تو پھر دن چڑھے ہی دوبارہ آنکھ کھلتی تھی۔

پچھلے بیس سالوں میں کیا کیا گناہ سرزد نہیں ہو گئے تھے اس سے......

آگاہی کے در جو وا ہونے شروع ہوئے پھر وہ زمین میں گڑھتی ہی چلی گئی تھی۔

عاطف اور طائشہ دونوں ہی اس سے ناراض تھے۔

عاطف کا 'اس بار عید اپنے گھر والوں کے ساتھ پاکستان میں ہی منانے کا ارادہ تھا۔

اس کے گھر والے افتخار صاحب کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد مستقل پاکستان میں شفٹ ہو گئے تھے لیکن وہ دونوں تا حال اپنے وطن سے دور رہ کر زندگی بسر کر رہے تھے۔

وہ شرمندہ تھی۔ عاطف اور اپنے بچوں سے معافی مانگنا چاہ رہی تھی مگر اسے کوئی موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ مدتوں کے بعد وہ دل سے وضو کر کے خدا کے حضور جھکی تھی اور اس سے رو رو کر اپنے گناہوں اور جہالت کی معافی مانگی تھی۔

عاطف اس کی رضامندی کے بعد عید سے تین روز پہلے ہی پاکستان چلا آیا تھا۔

پورے بیس سال کے بعد اس نے پاکستان ایئر پورٹ پر قدم رکھے تو نگاہیں پھر جھلملا گئیں مگر اس نے سختی سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ اب ان آنکھوں میں ماضی کے کسی بھی زخم کو تازہ ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ پاکستان میں ان کا بڑا والہانہ استقبال ہوا تھا۔ زندگی کے حقیقی رنگوں کی خوب صورتی' بڑے لمبے عرصے کے بعد محسوس کی تھی اس نے۔ کوئی بھابی کہہ کر پکار رہا تھا کوئی چاچی' کسی کی وہ مامی تھی تو کسی کو پھپھو۔

افتخار صاحب اور سعیدہ بیگم کی وفات کے بعد صارم اور یمنیٰ کی شادی پھپھو نے اپنے ہی بیٹے اور بیٹی کے ساتھ طے کر دی تھی۔ یوں وہ سب لوگ اپنی جوان اولادوں کے

ساتھ ایک ہی گھر میں مل کر رہ رہے تھے۔

عاطف اور طائشہ دونوں ہی یہاں آکر بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ سحری اور افطاری دونوں کا حقیقی لطف یہاں دیکھنے کو مل رہا تھا۔ منزہ نے بھی یہاں آکر دیگر گھر والوں کے ساتھ روزے رکھے تھے۔ پھپھو اس کے نازیوں اٹھاتی تھیں جیسے وہ ان کی چھوٹی سی بیٹی ہو.......

پورا گھرانہ خوشیوں کا گہوارا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر پچھتا رہی تھی کہ اتنی زندگی ان سب سے دور کیوں رہی۔ اب نماز کی باقاعدگی سے ادائیگی کے بعد وہ عضنان کی مغفرت کرنا نہیں بھولتی تھی اور بے شک یہی اس سے محبت کا صحیح حق تھا۔

اس روز چاند رات تھی۔ لڑکیاں بالیاں سب آپس میں صلاح مشورہ کر کے عید کے لیے اپنی اپنی خریداری کی فہرست تیار کر رہی تھیں۔ چین سے اذان بھی سرپرائز دینے کے چکر میں چھٹیاں لے کر پاکستان آ گیا تھا۔ منزہ اسے زیادہ پیار کرنے سے ہچکچاتی تھی کیونکہ وہ بالکل عضنان کی کاپی تھا اور اسے دیکھ کر اس کے پرانے زخم اور یادیں پھر سے رسنے لگتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی نسبت عاطف کے زیادہ قریب تھا۔ جس نے پوری ایمانداری سے اس کے لیے ایک اچھے باپ ہونے کا کردار بھی بخوبی نبھایا تھا۔ سب ہی بے حد خوش تھے۔

صارم اپنی بیوی کو شاپنگ کرانے لے کر گیا ہوا تھا جب کہ یمنیٰ اپنے شوہر کے ساتھ خریداری کا پروگرام بنا رہی تھی۔ عاطف البتہ خاموش بیٹھا حسرت زدہ سی نگاہوں سے ان سب کے خوش باش چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ پچھلے بیس سالوں میں کتنی بار اس کا دل منزہ کے مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھنے کو چاہا تھا۔ کتنی بار اس کے دل میں اس خواہش نے چٹکی بھری تھی کہ وہ اس کی رنگ برنگ چوڑیوں سے سجی ہوئی کلائیاں دیکھے۔ کبھی اس کے وجود پر کوئی رنگ اس کی پسند کا بھی سجے مگر منزہ نے ہمیشہ ہر قدم پر اسے یہ کہہ کر مایوس کیا تھا کہ اسے ان خرافات میں کوئی دلچسپی نہیں۔

پھپھو صبح سے کئی بار اسے مہندی اور چوڑیوں کے لیے کہہ چکی تھیں مگر وہ عاطف سے کہتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ اذان ابھی ابھی ڈھیر ساری منت کر کے گیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بازار چلے مگر اس نے نہایت محبت سے اس کے بال سنوارتے ہوئے اسے یہ کہہ کر واپس لوٹا دیا تھا کہ وہ اس کے پاپا کے ساتھ بازار جائے گی۔

عاطف اس وقت اپنے اندر گھٹن سے تنگ آ کر باہر لان کے قریب سیڑھیوں پر آ کر بیٹھا تو منزہ بھی کچھ سوچتے ہوئے اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔



''عاطی......''

آج بہت عرصے کے بعد اس نے اسے اپنے مخصوص انداز میں پکارا تھا لہٰذا اس کا چونک جانا لازمی تھا۔

''یہاں کیوں بیٹھے ہو...... سردی لگ گئی تو......؟'' اسے چونک کر اپنی جانب دیکھتے پا کر بہت اپنائیت سے وہ بولی تھی۔ جواب میں عاطف نے بے گانگی سے رخ پھیر لیا۔

''تو کیا......؟ مجھ سے سخت جانوں کو کچھ نہیں ہوتا۔'' وہ اس سے خفا تھا۔ تب ہی منزہ نے اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر اس کے مضبوط کندھے پر جما دیا۔

''میں جانتی ہوں تم مجھ سے بہت خفا ہو۔ یقینی طور پر میں معافی کی حقدار بھی نہیں مگر...... میں یہ بھی جانتی ہوں عاطی کہ تمہارا دل بہت بڑا ہے۔ تم نے واقعی ثابت کیا ہے کہ تم عام روایتی مردوں سے بہت ہٹ کر ہو۔ مجھ جیسی حقیر و گناہ گار لڑکی تمہارے کردار اور رفاقت پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ سچ کہتی ہوں عاطف! پہلے میں اس پچھتاوے میں گھل کر جی رہی تھی کہ میں نے ایک محبت کرنے والے انسان سے جینے کا حق چھین لیا لیکن اب یہ پچھتاوا روپ بدل گیا ہے۔ اب مجھے یہ کسک بے قرار کرتی ہے کہ میں نے عضنان احمد کی جگہ عاطف یزدان سے محبت کیوں نہیں کی۔ وہ شخص جو میری بے لوث محبت کا اہل نہیں تھا میں نے اپنی زندگی کے پچیس سال اس پر وار کر رکھ دیے اور یہ شخص جو میری پسند کے معیار پر پورا اترنے میں خود تھک گیا میں اسے کبھی پچیس منٹ کی توجہ بھی نہیں دے پائی۔ مجھے معاف کر دو عاطف میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں۔ پتہ نہیں کیوں ایک لا حاصل محبت کے روگ میں گھل کر میں نے تم جیسے اچھے دوست کی قدر نہیں کی۔ پتہ نہیں کیوں......؟''

اس کا لہجہ بھیگ رہا تھا۔ عاطف نے ذرا سا رخ موڑ کر سرسری سی ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر رخ پھیر لیا۔ گویا اس کی ناراضگی اب بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

''پلیز عاطی! مجھے معاف کر دو۔ میں بہت گلٹی فیل کر رہی ہوں۔ سچی محبت کیا ہے یہ میں نے تم سے سیکھا ہے جو لوگ قدم قدم پر اپنی دلچسپی کے محور بدل لیا کرتے ہیں وہ بھلے کچھ بھی کرنا جانتے ہوں مگر محبت کرنا نہیں جانتے۔ تم نے بتا دیا ہے مجھے کہ محبت وہی سچی ہوتی ہے جو آپ کو عزت اور اطمینان دے کر آپ کی ہزار خامیوں اور بے نیازیوں کے باوجود بھی کبھی اپنا راستہ نہ بدلے جو محبت طوفان کی طرح دل میں اٹھ کر آپ کو رسوائی اور ہمہ وقت

اذیت کی طرف دھکیل دے وہ محبت کے منہ پر طمانچے کی مانند ہے۔ میں بہت تھک گئی ہوں عاطی۔ خدا کے لیے پلیز مجھے سمیٹ لو۔نہیں تو یہ تنہائی کا کرب میری جان لے لے گا۔“

رندھے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنا سر عاطف یزدان کے مضبوط کندھے پر ٹکا دیا تو وہ گہری سانس بھر کر لمحوں میں ہلکا پھلکا ہوتے ہوئے بولا۔

”اتنی جلدی نہیں منزہ بیگم! پورے بیس سال تڑپایا ہے تم نے مجھے۔اب یوں ایک دم سے تو معاف نہیں کروں گا۔آج پوری رات منتیں کرو پھر کل صبح صلح کروں گا۔“ اس کے فریش لہجے پر وہ اپنا سر اس کے کندھے سے اٹھاتی‘ شادمانی سے مسکرائی تھی۔ وہ واقعی اس قابل تھا کہ اسے جی بھر کر سراہا اور چاہا جاتا تب ہی وہ بھی اپنے پرانے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”پوری رات منت کر کے مناتی رہوں گی تو چاند رات گزر جائے گی یہ پھر صبح میں عید کا اہتمام کیسے کروں گی۔“

”ہاں ۔ یہ تو واقعی سوچنے والی بات ہے۔“ وہ اس کے ارادے جان کر اور بھی مسرور ہوا تھا۔

”چلو یوں کرتے ہیں کہ تم سے ایک عہد نامہ لکھوا لیتے ہیں۔ آئندہ کبھی اس کی خلاف ورزی کی تو بہت بُرا پیش آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ پھر مسکرائی تھی۔

”چلو پھر وعدہ کرو۔آئندہ مجھے نظر انداز نہیں کرو گی اور میری خوشی کا پورا پورا خیال رکھو گی۔میرے کپڑے خود دھو کر پریس کرو گی اور میرے لیے کھانا بھی خود اپنے ہاتھوں سے بناؤ گی۔“

”پرامس۔“

”شاباش۔اب یہ بھی وعدہ کرو آئندہ صرف میرے لیے روؤ گی اور میرے لیے ہنسو گی جو میں کہوں گا وہی کرو گی۔“

”وعدہ۔آئندہ جو تم کہو گے میں وہی کروں گی۔“

”پکا وعدہ۔“ اس کی آنکھوں میں بہت خوب صوت رنگ تھے تب ہی وہ کھل کر ہنس پڑی تھی۔



”ایک دم پکا وعدہ لیکن پہلے میرے ساتھ مارکیٹ چلو مجھے بہت ساری چیزیں خریدنی ہیں۔صبح عید پر میں سب سے زیادہ خوب صورت نظر آنا چاہتی ہوں۔“

جن لفظوں کے لیے عاطف یزدان پچھلے بیس سال سے ترس رہا تھا۔ وہ لفظ آج منزہ افتخار کے ہونٹوں سے ادا ہو رہے تھے۔

”ٹھیک ہے انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا لیکن پہلے کان ادھر لاؤ مجھے بہت ضروری بات کہنی ہے۔“ جتنے خوب صورت رنگ اس وقت عاطف یزدان کی آنکھوں میں تھے۔ اتنا ہی خوب صورت گلال منزہ افتخار کے گالوں پر بھی بکھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پہلی بار اسے عاطف کی قربت کنفیوژ کر رہی تھی۔

”ایسے ہی کہہ دو ناں۔“ وہ شرماتے ہوئے اٹھلائی تھی جب وہ مزید شوخ ہوا تھا۔

”ناں۔ایسے ہی کہہ دینے کی بات نہیں ہے۔“

”اچھا بولو...... کیا کہنا ہے۔“ قدرے مجبور ہو کر وہ اس کے قریب ہوئی تھی جب عاطف اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

”آئی لو یو منزہ! اور چاند رات بھی بہت بہت مبارک ہو......“

”تمہیں بھی۔کل مجھے ٹھیک ٹھاک عیدی لینی ہے ابھی سے انتظام کر لو۔“

کتنے سچے رنگ تھے اس کے چہرے پر...... عاطف مبہوت سا اسے دیکھتا رہا تھا۔

”سنو......کل عید پر عیدی کے علاوہ مجھے کیا گفٹ دو گے......؟“

وہ منزہ افتخار جسے عضنان احمد کی بے وفائی نے بے موت مار دیا تھا۔اس وقت اس کے سامنے کھڑی زندگی سے بھرپور لہجے میں پوچھ رہی تھی۔تب ہی وہ محبت سے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے بولا۔

”اپنا دل‘ بے لوث محبت اور خوب صورت خوابوں کی تعبیر‘ کہو قبول ہے......؟“

”بالکل قبول ہے......“ مکمل سرشاری سے ہنس کر کہتی وہ اسے اپنے دل کے بے حد قریب لگی۔

”چلو مما کو بتا کر مارکیٹ چلتے ہیں۔کہیں سچ مچ ہماری باتوں میں چاند رات گزر ہی نہ جائے......“

اگلے ہی پل منزہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ راہداری کی طرف بڑھا تو اس

نے بھی خوشی خوشی اپنے قدم اس کی ہمراہی میں آگے بڑھا دیے۔ بے شک خدا نے اس کی معافی قبول کر کے اس کا دامن دل اس انمول محبت سے بھر دیا تھا جس کا خواب ہر گداز دل رکھنے والی اچھی لڑکی دیکھتی ہے۔





# محبت اِک سلگتی شام

اس نے پیار سے میرا گھونگٹ اُلٹا
ایک ہی خواب ہے جس کو اکثر دیکھوں میں
روٹھ گیا وہ خواب ہی میری آنکھوں سے
چاہا تھا تعبیر کو چھو کر دیکھوں میں
”ہمیں مدت ہوئی بچھڑے تمہیں عرصہ ہوا بھولے
مگر بارش کے موسم میں ہوا جب گنگناتی ہے
میں اپنے گھر کی چھت پر سے چمکتے چاند کو
چھپتے گھٹا کی اوٹ میں دیکھوں تو اِن گھڑیوں میں
جانِ جاں مجھے تم یاد آتے ہو“

”واہ......واہ‘ واہ‘ کیا نظم ہے‘ کیا ذوق ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے‘ یہاں اتنے خوب صورت موسم میں‘ اکیلے اکیلے کھڑے یہ خوب صورت نظم کس کے لیے پڑھی جا رہی ہے بھئی؟“

موسم بے حد خوب صورت ہو رہا تھا۔ آسمان پر چھائے کالی گھٹاؤں والے گھنگھور بادل‘ برسنے کو بے تاب تھے‘ ٹھنڈی معطر ہوائیں اور ان معطر ہواؤں میں گھلی ہلکی ہلکی سی نمی‘ بے حد فرحت کا احساس دلا رہی تھی اور وہ اپنے گھر کی چھت پر منڈیر کے پاس کھڑی یہ خوب

صورت نظم مدہوش سروں میں گنگنا رہی تھی، جب اچانک اس کی بیسٹ فرینڈ پنکی کی کھنکتی آواز نے اسے چونکا ڈالا وہ اس کے کھلنڈرے انداز پر کھلکھلا کر ہنس پڑی، پھر قدرے بے ساختہ انداز میں بولی۔

''اپنے ہونے والے پیارے پیارے مجازی خدا کے نام' کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے......؟''

''نہیں، مجھے کوئی اعتراض کیوں ہوگا؟ مگر افسوس کہ کم از کم اس جنم میں تو تمہیں کوئی ہینڈسم سا' پڑھا لکھا، خوب صورت لڑکا نہیں مل سکتا، ہاں اگلے جنم میں ہوسکتا ہے کہ کسی من چلے کا تجھ پر دل وِل آجائے......''

اپنے ہاتھوں کے لانبے ناخنوں سے کھیلتی ہوئی پنکی کچھ ایسے جتانے والے انداز میں بولی کہ ایمن کو خواہ مخواہ غصہ آگیا، تب ہی وہ تپ کر کٹیلے لہجے میں بولی۔

''بس بس رہنے دو اپنی یہ جنموں ونموں کی کہانی' میں کوئی بدصورت ہوں، پھوہڑ ہوں یا اپاہج ہوں' جو مجھے اچھا سا ایک خوب صورت لڑکا نہیں مل سکتا، تم دیکھنا اپنی لو اسٹوری جس لڑکے کے ساتھ چلے گی وہ ایک دم شہزادہ ہوگا، شہزادہ' اور تم پیچھے پیچھے میری منتیں کرتی پھرو گی کہ ایمن، ذرا ایک نظر اپنے چاند سے ہیرو کو تو دکھا دے اور تب میں تمہارا ہاتھ جھٹک کر بڑے غرور سے کہوں گی، جی نہیں، مجھے اپنے شہزادے کو تمہاری نظر نہیں لگوانی۔'' گردن اکڑا کر وہ خاصے تفاخر سے بولی تو پنکی کو بھی ایک دم غصہ آگیا' تب ہی وہ چٹختے ہوئے بولی۔

''ہاں ......اور اس کے بعد تمہاری آنکھ کھل جائے گی اور پھر وہی تم ہوگی اور وہی تمہاری اماں کی چخ چخ۔''

پیچھے رہنا تو دونوں میں سے کسی نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ایمن اپنی ماں کے اس قدر ناگوار ذکر پر بری طرح تپ گئی۔

''ہاں ......اور تمہاری ماں کے لبوں سے تو جیسے پھول جھڑتے ہیں ناں' اپنے گھر میں کھڑے ہو کر بولتی ہیں تو دو محلوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ آج محترمہ پنکی صاحبہ کے اعزاز میں قصیدے پڑھے جارہے ہیں۔''

دونوں میں تو تو' میں میں روز کی بات تھی۔ اس وقت گیند پنکی کی کورٹ میں تھی اور وہ تنک کر اسے کوئی کرارا سا جواب دینے ہی والی تھی کہ اسی وقت ایمن کی ماں نے اسے پاٹ دار



آواز لگائی اور وہ ''ابھی آئی ماں'' کہتے ہوئے پنکی کو منہ چڑا کر سیڑھیوں کی طرف بھاگ گئی۔

ایمن اور پنکی میں بچپن سے دوستی کا مضبوط بندھن قائم تھا۔ دونوں جتنی ایک دوسرے سے چونچیں لڑاتی تھیں، اتنا ہی جان لٹاتی تھیں، ایک دوسرے پر۔ دونوں کے گھر بالکل آمنے سامنے تھے' لہٰذا ان کا زیادہ تر وقت ایک دوسرے کے گھر میں ہی گزرتا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ انٹر کے پیپرز دیئے تھے اور اب امتحانات کے بعد بالکل فارغ تھیں۔

ایمن ایک شوخ وچنچل، قدرے رومینٹک لڑکی تھی، ہمہ وقت رسالے پڑھتے ہوئے یا فلمیں دیکھتے ہوئے، اسے ہر کہانی، ہر فلم کی ہیروئن میں اپنا ہی چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ سو وہ ہر خوب صورت، پرکشش لڑکے کو فوراً پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتی مگر اس کی ہر لو اسٹوری، اپنے کلائمکس پر پہنچنے سے قبل ہی دم توڑ دیتی تھی، کیوں کہ وہ جس لڑکے کو بھی اپنے ہیرو کے روپ میں دیکھتی، اس لڑکے کی یا تو شادی ہو جاتی یا پھر وہ کہیں اور اٹک جاتا اور نتیجتاً وہ کسی اور طرف متوجہ ہو جاتی۔ بننا سنورنا، خواب دیکھنا اور رائٹرز کے تخلیق کردہ فرضی لفظوں میں کھوئے رہنا ہی اس کی زندگی کا مقصد تھا، جب کہ اس کے برعکس پنکی حقیقت پسند لڑکی تھی۔ وہ اس کے ہمہ وقت کہانیوں میں کھوئے رہنے اور فلمیں دیکھنے سے سخت عاجز تھی، سو ان دونوں میں کسی نہ کسی ٹاپک پر ضرور جھگڑا رہتا تھا۔

ایمن اپنی ماں کی پاٹ دار آواز پر بھاگتی ہوئی نیچے آئی تو راستے میں ہی بری طرح ان سے ٹکرا گئی جو سیڑھیوں کی گرل پکڑے راستے میں ہی کھڑی تھیں۔ ایمن کے یوں اندھا دھند بھاگنے اور خود سے ٹکرانے پر جو شروع ہوئیں تو پھر بریک لگانا ہی بھول گئیں، جب کہ ایمن چور نظروں سے اوپر سیڑھیوں پر کھڑی پنکی کی مسکراتی ہوئی طنزیہ نگاہوں کو دیکھتی سر جھکا کر چپ چاپ کچن میں گھس گئی کہ اس وقت ماں کو کچھ بھی کہنا ''آبیل مجھے مار'' کے مصداق تھا۔

شام کے سائے ڈھل رہے تھے اور یہ وقت رات کے لیے کھانے کی تیاری کا تھا، سو وہ فریج سے آٹا نکال کر اس کے پیڑے بنانے لگی کہ اب غصے سے کھولتے دماغ کو کسی کام میں محو ہو کر ٹھنڈا تو کرنا ہی تھا۔

باہر بارش کے بعد کچے صحن سے بڑی سوندھی سوندھی سی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس کے صحن کے بیچ و بیچ لگا سکھ چین کا درخت، بارش میں دھل دھلا کر یوں نکھر گیا جیسے کوئی نئی نویلی دلہن صبح سویرے نہا کر نکلتی ہے۔ سکھ چین کے اردگرد ہی اس نے کچھ گلاب اور چنبیلی کے

پھولوں کی بیلیں اور پودے بھی لگا رکھے تھے، جن کی مسحور کن خوشبو رات میں پورے صحن میں پھیل کر عجیب سا سرور بخشتی تھی۔

اکثر وہ اپنی باتیں، انہی پھول پودوں کے گوش گزار کرتی تھی کیوں کہ عشق و محبت کے ساتھ ساتھ اسے پھول پودوں میں بھی بہت لگاؤ تھا۔

اماں کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ وہیں کچن میں اس کے پاس چلی آئیں پھر قدرے رعب جماتے ہوئے بولیں۔

''ایمن! تمہاری پھوپھو کا بیٹا آرہا ہے ہمارے گھر، شہری لڑکا ہے نہ جانے کس مزاج کا ہو، اس لیے تم خود وہ میرے برابر والا جو کمرہ ہے، اس کی اچھی طرح صفائی کردو، دیکھو مجھے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے.....''

اماں ویسے تو اس سے بہت پیار کرتی تھیں مگر جب مخاطب ہوتیں تو ان کا انداز اکثر کڑک ہی ہوا کرتا تھا۔ شاید وہ اس مقولے پر پورا پورا عمل کرتی تھیں کہ اولاد کو کھلاؤ سونے کا نوالہ، مگر دیکھو شیر کی نظر سے۔ اماں کے برعکس ابا بہت دھیمے مزاج والے شخص تھے۔ اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ ایمن کو بہت پیار کرتے تھے۔ حقیقی معنوں میں انہوں نے ہی اسے اس قدر بگاڑ رکھا تھا' وہی کہتے رہتے تھے۔

''دیکھنا رضیہ' میں اپنی بیٹی کو کسی شہزادے کے ساتھ ہی بیاہوں گا، نوکر ہوں گے میری بیٹی کے آگے پیچھے.....'' اور آج اماں کی زبانی کسی ایسے ہی ان دیکھے شہزادے کی آمد کا سن کر وہ تو خوشی سے اچھل پڑی۔ کہانیوں میں ایسا ہی تو ہوتا تھا، ہیرو کسی دور دیس سے ہیروئن کے گھر آتا، پھر ہیروئن بہانے بہانے سے اس کے سامنے جاتی اور یوں دونوں کا چکر چل پڑتا۔

''ایمن! تو سن رہی ہے ناں' میں کیا کہہ رہی ہوں.....؟''

وہ جو اپنے ہی خوش کن تصورات میں کھوئی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اماں کی تیز آواز پر چونک کر زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگی۔

اُن لوگوں کو چونکہ ''امیر'' ہونے کا شرف حاصل نہیں تھا لہٰذا وہ ہمیشہ اپنے دولت مند عزیزوں سے دور ہی رہے، شادی بیاہ' یا ایسی ہی کسی اور تقریب میں صرف اس کے ابا یا کبھی کبھار اماں چلی جایا کرتی تھیں مگر اس کو کبھی اپنے کسی امیر کبیر' رشتہ دار کے گھر جانے کا چانس نصیب نہ ہوا اس کے لیے کزنز کا فقط تصور ہی خوش کن تھا۔ وگرنہ وہ قطعی بے خبر تھی کہ



اس کے کتنے کزنز ہیں، کہاں کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟

جب سے اماں نے کسی ان دیکھے شہزادے کی آمد کی اطلاع دی تھی، اس کا تو جیسے ایک ایک دن انگلیوں پر گزر رہا تھا۔

اپنے پورے حلقہ احباب میں' اس نے اپنے ان دیکھے کزن کی خوب صورتی، دولت مندی اور سلیقے کی تعریفیں کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا مگر افسوس کہ ایک دن، دو دن، تین دن غرض پورا ہفتہ گزر گیا مگر اس کے خوابوں کا شہزادہ، ان کے گھر نہیں آیا اور اس کا اسے اس قدر افسوس تھا کہ پورے دو دن اس نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ اس روز پنکی آئی تو وہ منہ سر لپیٹے یونہی صحن کے بیچ و بیچ چارپائی پر پڑی تھی۔

''اے مس ہیروئن، کیا ہوا، وہ تمہارا ہیرو صاحب نہیں آئے کیا.....؟'' وہی پرانا چڑانے والا انداز مگر آج پہلی مرتبہ ایمن اس کے الفاظ پر غصے ہونے کی بجائے قدرے اداسی سے بولی۔

''پنکی! ساری دنیا کی لڑکیاں محبت کرتی ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت لڑکا، ان پر جان دیتا ہے تم نے وہ رخ جی کی کہانی نہیں پڑھی، جس میں ان کی ہیروئن بالکل بھی خوب صورت نہیں تھی مگر پھر بھی ہیرو، اس سے ٹوٹ کر پیار کرتا رہا، پھر میں تو اتنی بدصورت بھی نہیں ہوں، پڑھی لکھی بھی ہوں پھر مجھ سے کوئی ہیرو پیار کیوں نہیں کرتا؟'' اس کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ شاید یہی تھا۔ پنکی نے تو مارے خوف کے اپنا سر پکڑ لیا۔

''او گاڈ.....لگتا ہے تم کبھی نہیں سدھرو گی۔''

اپنا سر پیٹ کر وہ انتہائی بے زاری کے ساتھ وہاں سے اٹھی اور اندر رضیہ بیگم کے پاس چلی گئی کہ اس کی ماں نے اس وقت اسے انہیں کے پاس ضروری کام سے بھیجا تھا۔

چند دن مزید اداسیوں کی نظر ہو گئے مگر اس کے بعد ایمن پھر سے وہی پہلے والی ایمن بن گئی کیوں کہ آج کل اسے ساتھ والی ہمسائی کے گھر میں دور دیس سے آنے والا ان کا بھانجا اپنا ہیرو دکھائی دینے لگا تھا۔ تب ہی تو وہ بہانے بہانے سے ان کے گھر جا رہی تھی اور خوب خوش تھی مگر یہ کیفیت بھی فقط چند دن کی مہمان رہی کیوں کہ کچھ ہی روز کے بعد ہمسائی صاحبہ کے بھانجے صاحب اپنے دیس سدھار گئے اور وہ ایک مرتبہ پھر اپنی ناکام حسرتوں پر آنسو بہاتی روتی رہ گئی۔

کیسی کہانی تھی اس کی کہ جس میں کوئی ہیرو تک ہی نہیں رہا تھا۔

اس روز رضیہ بیگم کسی ضروری کام سے محلے میں کسی کے گھر چلی گئیں اور وہ ہر کام

سے جی چرائے یونہی کوفت زدہ سی سکھ چین کے درخت تلے لیٹی ہوئی تھی، جب اچانک دروازے پر زور دار دستک ہوئی اور ہو سخت بیزاری کے عالم میں کوئی ساتویں آٹھویں بار دستک پر طوہاً وکرہاً اٹھ کر دروازے تک گئی اور بنا نام پتہ پوچھتے پٹ سے دروازہ کھول کر شروع ہوگئی۔

''فرمائیے کیوں ہمارے دروازے کو مفت کا مال سمجھ کر پیٹے چلے جا رہے ہیں آپ؟ کوئی ادب لحاظ ہے آپ کو نہیں؟ اور یہ منہ اٹھا کر آپ ہمارے در پر کیوں چلے آئے ہیں؟ جس کے گھر جانا ہے اسی کا دروازہ کھٹ کھٹائیے ناں......'' وہ اس وقت یہ بھی نہیں دیکھ رہی تھی کہ دروازے پر ایک انتہائی ہینڈسم شخص کتنا پریشان کھڑا ہے۔ آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کی اس نے کسی خوب صورت لڑکے سے ایسے لہجے میں بات کی ہو مگر اس وقت اس کا دماغ بری طرح گھوما ہوا تھا' سو اس نے سارا ادب لحاظ بالائے طاق رکھ دیا۔

نوجوان بیچارہ حیرت زدہ نگاہوں سے پٹر پٹر دیکھتا رہا' جو نجانے اسے کیا سمجھ رہی تھی۔

''ارے یوں کھڑے کھڑے آنکھیں پھاڑ کر مجھے کیوں دیکھے جا رہے ہیں آپ سیدھے سیدھے بتایئے آپ کو کس کے گھر جانا ہے....'' دونوں ہاتھوں سے دروازے کے کھلے پٹ تھام کر وہ خاصے تیکھے لہجے میں بولی تو نوجوان نے سرد آہ بھر کر سرسری سا اس کا جائزہ لیا پھر قدرے ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''دیکھئے، میرا نام حنان رؤف ہے' میں لاہور سے آیا ہوں اپنے ماموں ماسٹر حفیظ خان سے ملنے اور انہی کے گھر جانا ہے مجھے' مگر اب پتہ نہیں کہ وہ کہاں رہتے ہیں؟''

اجنبی نوجوان کا انداز خاصا تھکا تھکا سا تھا مگر ایمن تو جہاں کی تہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ اتنی دور سے چل کر اس کے گھر تک آیا تھا اور وہ اس سے بدتمیزی کر رہی تھی۔ تف ہے تجھ پر ایمن۔ اتنے ہینڈسم ہیرو کو جھاڑ کر دی۔ کبھی کبھی اسے اپنی اس جلد بازی والی عادت پر بے حد غصہ آتا تھا۔ اس وقت بھی خود پر لعنت ملامت کرنے کے بعد اس نے شائستگی سے دوپٹہ سر پر جمایا پھر دروازے کے ایک طرف ہو کر نرم میٹھے لہجے میں بولی۔

''آ......آپ...... باہر کیوں کھڑے ہیں' پلیز اندر آیئے ناں' یہی ماسٹر حفیظ اللہ خان کا گھر ہے' مگر آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آپ ہمارے ہی گھر آئے ہیں۔' اپنی خفت مٹانے کو وہ فوراً شائستگی کا پیکر بن گئی تو نوجوان نے کسی قدر حیرانی سے اس کا یہ پل میں تولہ پل میں ماشہ والا روپ دیکھا' پھر قدرے خفگی بھرے انداز میں بولا۔



''محترمہ! میرے خیال سے آپ نے مجھے اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنے کہ کوئی موقع نہیں دیا۔''

وہ اس سے خاصا ناراض لگ رہا تھا۔ ایمن نے فوراً معذرت کر لی اور اسے اندر بیٹھک نما ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خود رضیہ بیگم کو بلانے دوڑ پڑی۔ تھوڑی ہی دیر میں رضیہ بیگم گھر واپس چلی آئیں تو اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے پنکی کے گھر کا راستہ ناپا تا کہ اسے پوری شان وشوکت کے ساتھ اپنے کزن کی آمد کے بارے میں بتا سکے اور اس کی اسی ''مخبری'' کا نتیجہ تھا کہ اگلے چند ہی منٹوں میں اس کی ایک ایک دوست بہانے بہانے سے اس کے گھر اس کے کزن کے دیدار کے لیے آ رہی تھی۔

حنان نے کچھ دیر تو برداشت کیا' پھر اس دعا سلام کے کھیل سے جلد ہی اکتا کر رضیہ بیگم سے معذرت کرتے ہوئے اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے چلا آیا تو ایمن کی گویا شامت آ گئی۔ رضیہ بیگم نے اس کی دوستوں کا لحاظ کیے بغیر اس کی کلاس لینی شروع کی دی مگر آج پہلی مرتبہ اسے اپنی ماں کا کڑوا لہجہ برا نہیں لگ رہا تھا کیوں کہ وہ دھیان سے ان کو سنے اور ہدایات سن ہی نہیں رہی تھی اس کا ذہن تو مکمل طور پر حنان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ قدرت کو آخر اس کے معصوم سے جذبات پر رحم آ ہی گیا تھا' تب ہی تو اس نے یہ خوب صورت سا ہیرو یوں اس کے گھر تک پہنچا دیا تھا۔

''اماں! حنان ہمارے گھر رہنے کے لیے کیوں آیا ہے''

حنان کو آئے پورے سات گھنٹے ہو چکے تھے اور تب سے وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا' جب ہی وہ بے چین سی ہو کر کچن میں رات کے کھانے کی تیاری کرنے رضیہ بیگم کے پاس ان کا ہاتھ بٹانے کو چلی آئی اور آتے ہی یہ سوال داغ دیا' سالن میں چمچہ چلاتی رضیہ بیگم پھر دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو کر بے نیازی سے بولیں۔

''اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے آیا ہے ہماری محبت یہاں تک کھینچ کر نہیں لائی ہے اسے......''

ایمن نے محسوس کیا کہ ان کا لہجہ' حنان کے لیے کسی قسم کی اپنائیت سے یکسر خالی تھا' تب ہی وہ دوسرا سوال کرنے کی جرأت نہ کر پائی مگر تھوڑی ہی دیر بعد شام کو جب ان کے والد حفیظ اللہ خان صاحب گھر آئے تو وہ خود کو ان کے ساتھ حنان سے متعلق گفتگو کرنے سے

باز نہ رکھ پائی‘ تب ہی خوشی خوشی اس کی آمد کی اطلاع دینے کے بعد پوچھا۔

’’بابا......!ماں بتا رہی تھی کہ حنان اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے ہمارے گھر آیا ہے‘ تو پھر وہ اس سے پہلے کبھی ہمارے گھر کیوں نہیں آیا؟ آخر ہمارا رشتہ دار ہے وہ.....‘

’یہ سوال جانے کب سے اس کے دماغ میں ہلچل مچا رہا تھا۔حفیظ صاحب نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے اپنی کھلنڈری سی فطرت والی سادہ دل بیٹی کو دیکھا پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں بولے۔’’وہ اس سے پہلے پاکستان میں تھا ہی کب؟ وہ تو حال ہی میں سعودیہ سے لوٹا ہے پہلی دفعہ ہمارے گاؤں میں آیا ہے اور دیکھو سیدھا ہمارے گھر چلا آیا۔ یہ ہوتی ہے بچوں کی اپنے بزرگوں سے حقیقی محبت۔ان کا لہجہ حنان کے لیے بے پناہ محبت لیے ہوئے تھا۔ایمن کا دل خوشی سے لبریز ہوگیا۔

تو اس کا مطلب ہے پھوپھو لوگوں کو بھی ہم سے محبت ہے تو پھر وہ لوگ ہمارے ہاں کیوں نہیں آتے بابا؟‘‘اس نے خاصے پرجوش انداز میں سوال کیا تھا مگر حفیظ صاحب ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔ پھر بات بدلتے ہوئے بولے۔

’’حنان اٹھا ہے کہ نہیں اپنی ماں سے کہو اسے جگا دے تاکہ وہ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھالے نجانے کب کھایا ہوگا اس نے۔‘‘

ایمن اپنے سوال کے جواب میں یہ انتہائی غیر متعلق سا جواب سن کر سخت مایوس ہوئی تاہم اس نے وہاں سے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی اور باپ کا حکم من وعن ماں تک پہنچا دیا تاہم اس مرحلے پر بھی اسے خوب غصہ آیا کہانیوں میں ہیروئنز خود جا کر ہیرو کو نیند سے جگاتی ہیں مگر یہاں تو اس نے ٹھیک سے اپنے اس ڈیشنگ سے ہیرو کو دیکھا بھی نہیں تھا تو پھر اسے تنہائی میں مخاطب کرنے کی نوبت کہاں سے آتی۔

اماں نے ابا کے حکم کی تعمیل میں حنان کو فوراً ہی اٹھا دیا‘ تو وہ سرخ سرخ سی نیند کے خمار سے بسی آنکھوں کے ساتھ وہیں صحن میں چلا آیا‘ جہاں سکھ چین کے پیڑ کے پاس ہی ہینڈ پمپ نصب تھا۔ایمن نے اب اسے بغور دیکھنے کا شرف حاصل کیا‘ بلیک جینز کی پینٹ پر سیاہ شرٹ‘ جس کے اوپر کے دو تین بٹن کھلے ہوئے تھے اور اسی لیے اس کی گردن میں پڑی سونے کی موٹی سی چین واضح نظر آ رہی تھی۔ پاؤں میں قیمتی بوٹ تھے جن کی چمک سفر کے باوجود برقرار تھی۔اس نے کہنیوں تک شرٹ کے بازو فولڈ کیے ہوئے تھے جو اس پر انتہائی سج رہے



تھے‘ دائیں ہاتھ میں بندھی گولڈن کلر کی خوب صورت ریسٹ واچ چیخ چیخ کر اس کی امارت کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ قسم کھا کر کہہ سکتی تھی کہ اس نے اس سے قبل اپنی پوری زندگی میں اتنا خوب صورت مرد کبھی نہیں دیکھا تھا۔دل کے اندر کہیں بے پناہ خوشی کے دیپ جل رہے تھے کہ اسے اتنے خوب صورت مرد کی قریبی کزن ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

’’یہ......واچ پکڑنا پلیز......‘‘

وہ ابا کے حکم پر ہینڈ پمپ چلا کر اسے ہاتھ منہ دھلوا رہی تھی‘ جب اسے محویت سے تکنے کے دوران حنان کی یہ ریکوئسٹ سنائی دی اور چونک کر اس نے فوراً اس کے ہاتھ سے گھڑی لے لی۔ دل تھا کہ اتنی تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا اور وہ ہینڈ پمپ چلاتے ہوئے عجیب ندیدوں کی طرح ماں باپ سے چوری چوری اسے دیکھتی رہی۔منہ پر صابن ملتے ہوئے پھر دونوں ہاتھوں کے پیالے میں پانی بھر کر منہ دھوتے ہوئے گیلے ہاتھوں کو سر میں پھیر کر بال گیلے کرتے ہوئے ہینڈ پمپ پر ہاتھ جما کر ذرا سا جھک کر پاؤں مسل مسل کر دھوتے ہوئے غرض کہ اس کی ایک ایک ادا اس کی آنکھوں میں کھب رہی تھی اور اسے لگا کہ بس یہی وہ لمحہ ہے جب اسے عشق کی دلدل میں اترنا ہے۔

حنان منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوا تو اس نے جلدی سے تولیہ لا کر اسے تھما دیا‘ اس نے سرسری سی ایک نظر اس کے سادا سے سراپے پر ڈالی کر بے نیازی سے تھام لیا اور تھوڑی ہی دیر میں چہرہ اور بازو خشک کر کے واپس اسے پکڑا بھی دیا۔اس روز وہ اس نے آج تک کبھی زندگی میں محسوس نہیں کی تھی۔

رات کے کھانے سے فارغ وہ کر ہو سب لوگ وہیں صحن میں بچھی چار پائیوں پر بیٹھ گئے۔ٹھنڈی ٹھنڈی مست ہوا اس وقت خوب سرور بخش رہی تھی۔اس نے دن ڈھلے ہی صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر دیا تھا‘ جس کی وجہ سے زمین کی حبس بھی کم ہوگئی تھی۔

’’اور سناؤ پتر‘ وہاں شہر میں سب لوگ کیسے ہیں زرینہ اور شہزادہ تو ٹھیک ٹھاک ہیں ناں...‘‘حفیظ صاحب تو امیر کبیر بھانجے کی آمد پر خوشی سے بے حال ہو رہے تھے تاہم رضیہ بیگم کا رویہ البتہ روکھا تھا اور اس بات کو حنان نے خصوصی طور پر نوٹ کیا تھا تب ہی وہ حفیظ صاحب کے سوال پر قدرے افسردہ لہجے میں بولا۔

’’جی انکل‘ مما اکثر آپ لوگوں کا ذکر کرتی ہیں (نجانے اچھے لفظوں میں کرتی ہیں

یا برے لفظوں میں) انہی کی خواہش پر میں یہاں آیا ہوں مگر لگتا ہے آنٹی کو میرا یہاں اس طرح آنا کچھ اچھا نہیں لگا۔''

وہ کبھی بھی بات ادھار رکھنے کا ہرگز قائل نہیں تھا جو بات دل میں ہوتی وہی زبان پر منافقت اور دھوکہ دہی سے اسے شدید نفرت تھی تاہم اس کے یوں کھلم کھلا اظہار نے فوری طور پر رضیہ بیگم کو بوکھلا کر رکھ دیا تب ہی وہ گڑبڑا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے نرم سے لہجے منہ بولیں۔

''نہیں نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بیٹے یہ تمہارا وہم ہے۔

''او کے، ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو بہرحال مجھے یہاں آکر بہت اچھا لگا ہے یہاں کا پرسکون ماحول ہر چیز میں خالص پن سادگی سب کتنا متاثر کن ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بول رہا تھا اور ایمن گھٹنوں پر سر ٹکائے پاگلوں کی طرح دیوانہ وار اسے دیکھے جا رہی تھی، جس میں ایک ہی بات بار بار دہرانے کی بری عادت نہیں تھی۔

''حنان، آپ یہاں کب تک رہیں گے؟'' اپنے دھڑکتے مچلتے دل کو سنبھال کر اس نے ایک دم بے ساختہ سے انداز میں پوچھا تو حنان نے چونک کر اس کی طرف نگاہ کی پھر لبوں پر دھیمی سی مسکان پھیلا کر نرم لہجے میں بولا۔

''جب تک یہاں کام ہے، تک تو مجھے یہیں رہنا ہے۔ دیکھیں، یہ کتنے دنوں پر محیط ہوتا ہے۔'' اس کا انداز قطعی اجنبی تھا۔ ایمن نے پھر دوبارہ اس سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔

اس رات وہ دیر تک جاگی تھی۔ اپنے بستر پر چت لیٹے لیٹے وہ نجانے کب تک حنان کے بارے میں سوچتی رہیں۔ بلاشبہ وہ کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا تھا مگر اس نے تو جیسے اس کی شخصیت کے سحر میں الجھ کر اپنی ذات ہی گروی رکھ دی تھی۔ خوابوں کے سفر میں وہ جانے کہاں کہاں اس کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے گھومتی پھری تھی شاید اسی لیے صبح جب وہ اٹھی تو اس کی آنکھیں قدرے سوجی ہوئی تھیں۔ رضیہ بیگم نے فکرمند ہو کر پوچھا تو وہ بڑی خوب صورتی سے تھکن کا بہانہ کر کے انہیں ٹال گئی۔

''اچھا، جا۔ جا کر حنان کو ناشتے کے لیے بلا لا اور ہاں وہاں نلکے کے پاس ٹب میں پانی بھی بھر کر رکھ دے تاکہ وہ منہ ہاتھ دھو لے۔'' پھر جس وقت اس نے حنان کے کمرے میں پہلا قدم رکھا، اس سے وہاں کھڑا رہنا شدید دشوار ہو گیا۔ وہ کمرے کے درمیان میں بڑے



مزے سے کرسی پر آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر جلدی سے کھڑکیوں پر پڑے پردے اٹھائے اور کھڑکیاں پوری کی پوری کھول دیں۔ نم ہواؤں کے جھونکے تیزی سے اندر آئے۔ روشنی کا احساس ہونے پر حنان نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور خاصی حیرانی سے اس کی وہاں موجودگی کو دیکھا جب کہ ایمن اچانک ہی اس کی خود پر مرکوز سرخ سرخ سی متورم نگاہیں دیکھ کر گڑبڑا سی گئی تب ہی سارے ایکشن بھول کر ایک دم عام سے لہجے میں بولی۔

''اماں آپ کو ناشتے کے لیے بلا رہی ہیں، پلیز نیچے آجائیں۔'' انتہائی عجلت آمیز لہجے میں کہہ کر وہ جونہی پلٹی حنان اپنی جگہ سے فوراً کھڑا ہو گیا۔

''سنو.....'وہ دروازے تک پہنچ گئی تھی جب تک پیچھے سے حنان کی پکار سنائی دی۔ دل ایک مرتبہ پھر بے قابو ہو گیا اور اس نے بے حد گھبرا کر پلٹتے ہوئے حنان کی طرف دیکھا۔

''جی کہیئے۔'' کپکپاتے ہونٹوں سے بمشکل یہ لفظ ادا ہوئے اور وہ جونجانے اسے کیا کہنے کا ارادہ رکھتا تھا، اس کی اس قدر گھبراہٹ پر سر جھٹکتے ہوئے ''کچھ نہیں'' کہا پھر لب بھینچتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔



وہ موٹر چلائے پورے انہماک سے فرش دھو رہی تھی، جب اچانک پنکی نے قدم اندر دھرے تو ایمن نے حسب عادت گھور کر اسے دیکھا۔

اس کے تپے ہوئے انداز پر پنکی کھلکھلا کر ہنس پڑی، پھر اسی طرح ہنستے ہوئے شرارتی انداز میں بولی۔

''تم فی الحال یہ بتاؤ کہ یہ منہ پر بارہ کیوں بجا رکھے ہیں؟''

گیلے فرش کے باعث وہ پائنچے سمیٹ کر آگے بڑھ آئی تو ایمن نے پائپ سمیٹ کر کمر سے بندھے دوپٹے کو کھولا اور اس سے گیلے ہاتھ صاف کرتی قدرے اداس لہجے میں بولی۔

''پنکی! وہ بولتا بہت کم، عجیب پراسرار سے انداز اپنائے رکھتا ہے۔''

''کون'؟'' پنکی کی بے نیازی اپنے عروج پر تھی، تب ہی ابرو اچکا کر بولی تو ایمن بری طرح چڑ گئی، اسی جلے انداز میں بولی۔

''وہی، میرا ہیرو اور کون.....؟''

''اوہ تو یہ مسئلہ ہے، ویسے میں اس کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہو رہی ہوں،

اب اس کا یہ حال ہے تو تم سے شادی کے بعد کیا ہوگا؟'' وہ اسے چڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی' پنکی افسردہ سی شکل بنا کر بولی تو ایمن چونک کر اسے گھورنے لگی۔

''مطلب کیا ہے تمہارا؟ دونوں ہاتھ کولہوں پر دھر کر وہ لڑنے مرنے کو تیار ہوگئی تو اس کی تپی ہوئی صورت دیکھ کر پنکی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''کچھ نہیں' میں کہہ رہی تھی کہ تم کوشش کر کے اس کی یہ عادت چھڑا بھی تو سکتی ہو' پھر اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔ ویسے سچ سچ بتانا یہ والے ہیرو صاحب تمہارے دل کے مندر میں کتنے دن کے مہمان ہیں۔؟'' وہ اس کی پل پل بدلتی فطرت سے بخوبی واقف تھی' تب ہی منہ اس کے کان کے پاس لا کر سرگوشیانہ انداز میں اسے تنگ کرتے ہوئے بولی تو اب کے ایمن کے لبوں پر بڑی بے ساختہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''زیادہ بکواس نہ کیا کرو' میں کیا تمہیں فلرٹ لڑکی نظر آتی ہوں؟ وہ تو کبھی مجھے ڈھنگ کا لڑکا نہیں ملا اس لیے کوششیں جاری ہیں مگر یہ والے ہیرو تو ایک دم فٹ ہیں پھر اپنی ذات برادری کے بھی ہیں لہٰذا شادی وادی ہونے نہ ہونے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ ہاں یہ ہے کہ عفت جی کے ہیرو کی طرح تھوڑے خشک مزاج ہیں' مگر کوئی بات نہیں' میں دھیرے دھیرے سیٹ کرلوں گی تم بتاؤ سیکنڈ ایئر کے بعد کیا ارادے ہیں؟''

''اپنے کیا ارادے ہونے ہیں۔ ہم عورتوں کی بھی بھلا کوئی زندگی ہے؟ نہ کوئی مرضی اپنی نہ فیصلہ آنکھیں پھوڑ پھوڑ کر رات رات بھر جاگ کر کس قدر محنت سے انٹر تک پہنچے ہیں مگر کوئی فائدہ نہیں' ادھر رزلٹ آیا ادھر والدین گھڑی کی مانند سر سے اتار پھینکیں گے جیسے ہماری اپنی کوئی سوچ کوئی مرضی ہی نہیں پتہ نہیں وہ دور کب آئے گا کہ جب یہ دنیا عورت کو بھی ایک جیتا جاگتا انسان تسلیم کرنے لگے گی؟'' پنکی نے سرد آہ بھر کر قدرے اداسی سے کہا تھا اور اس کی بات براہ راست ایمن کے دل پر اثر کر گئی تب ہی تو وہ سر جھکا کر بے حد مایوس لہجے میں بولی۔

''ہاں پنکی' اب دیکھو ناں مرد اگر کسی لڑکی سے محبت کرتا ہے تو اسے چھپانے کی قطعی ضرورت محسوس نہیں کرتا خواہ اس کے ماں باپ کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی تک کو پتہ چل جائے۔ مگر ایک لڑکی ایسا کبھی نہیں کرسکتی وہ اگر کسی کو چاہتی ہے اور اسے وہ نہیں ملتا تو وہ ساری عمر روتی ہے سسکتی ہے مگر لب سے آہ نہیں کرتی' کل کو اگر میری شادی بھی کسی ناپسندیدہ شخص کے ساتھ ہوگئی تو میں کیا کروں گی؟ سچ میں تو مر ہی جاؤں گی۔'' اس کی ہر بات کی تان



اپنی ذات پر ہی آ کر ٹوٹتی تھی' پنکی نے جھکی ہوئی نظریں اٹھا کر ایک پل کے لیے اداسی سے اسے دیکھا پھر جونہی نظر اس کے پیچھے کھڑے حنان رؤف پر پڑی وہ بری طرح گھبرا گئی۔ جانے وہ کب سے ان کے قریب کھڑا ان کی انتہائی پرسنل باتیں سن رہا تھا۔

اسے گم سم سا دیکھ کر پنکی نے گھور کر اسے دیکھتے ہوئے دانتوں تلے زبان دبالی اور آنکھوں آنکھوں میں اشارے سے اسے وہاں حنان کی موجودگی کے بارے میں بتانے لگی مگر وہ عقل میں ماسٹرز اشاروں کی زبان سمجھنے کے قابل کہاں تھی' تب ہی قدرے غصیلے لہجے میں بولی۔

''یہ تمہاری بریکیں کیوں اچانک فیل ہوگئی ہیں کہیں تم پر تو اس چپ گھنے خان کا سایہ تو نہیں پڑ گیا۔''

اس وقت اگر اس کے فرشتوں کو بھی خبر ہوتی کی حنان اس کے پیچھے کھڑا ہے تو شاید وہ بھی سو بار توبہ استغفار کرتے' پنکی نے بے حد گھبرا کر غصے سے اسے گھورا پھر عجیب شرمندہ سی شکل بنا کر جو وہاں سے بھاگی تو پیچھے مڑ کر نہ دیکھا جب کہ ایمن اس کے یوں اچانک بغیر دعا سلام کے فرار ہونے پر ہکا بکا سی کھڑی رہ گئی پھر جونہی اس نے پلٹ کر دروازے کی سمت دیکھنا چاہا' نظر سیدھی اپنے پیچھے کھڑے حنان کے فریش چہرے سے جا ٹکرائی اور وہ حیرت سے گنگ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔

''میں چپ گھنا ہوں.....؟'' چہرے پر حد درجہ سنجیدگی تھی مگر لہجے ہلکا سا تبسم تھا۔ ایمن سے تو نظریں اٹھا کر اس کی سمت دیکھنا دشوار ہوگیا۔

''بائی داوے' یہ چپ گھنا کہتے کسے ہیں' پلیز یہ تو بتا دیجیے.....؟'' دونوں بازو سینے پر لپیٹ کر وہ اس کی متغیر رنگت کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے ہنوز سنجیدہ لہجے میں بولا تو ایمن مارے ندامت کے زمین میں گڑ گئی۔ پتہ نہیں یہ ہیروئنز کیسے پٹ پٹ بول لیتی ہیں ہیرو کے سامنے اس سے نظر اٹھانا محال ہوگیا تھا۔ حنان کچھ دیر اسے یونہی دھیرے دھیرے سے کانپتے' کنفیوز ہوتے دیکھتا رہا پھر سر جھٹک کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تب ایمن نے سرد آہ بھر کر سکون کا سانس لیا۔

حنان اپنے کمرے میں واپس آیا تو دروازہ بند کر کے بیڈ پر گر پڑا پورا جسم تھکن کی شدت سے لے بے حال تھا۔ آنکھیں تھیں کہ جل جل کر تکلیف دینے لگی تھیں ہاتھ پاؤں میں جیسے بالکل بھی جان نہیں رہی تھی۔ بہت ضبط کے باوجود بھی آنسو قطار در قطار اس کی آنکھوں

کے ساحل سے ہجرت کرنے لگے تھے اور وہ ساری دنیا کو اپنے سامنے جھکانے والا بے بسی سے پڑا تکیہ بھگوتا رہا۔کون جانتا تھا کہ وہ یہاں کس لیے آیا تھا؟ اور کسی کی جاننے کی فرصت بھی کہاں تھی؟ اتنا ٹائم ہی نہیں تھا کسی کے پاس کہ کوئی اس کے لیے سوچتا اس کی فکر کرتا کسی کو شاید گمان بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں گاؤں میں رہ رہا ہوگا یہاں ان سیدھے سادھے پرخلوص لوگوں کے بیچ جن سے بظاہر اس نے آج تک کوئی رشتہ نہیں قائم نہیں کیا تھا مگر حقیقت میں انہی لوگوں کے بیچ آ کر اسے دلی سکون ملا تھا۔

کون جانتا تھا کہ اس کی زندگی کی اصل کہانی کیا ہے۔اور صرف اسی کی کیا بلکہ ہر اس شخص ہر اس انسان کی اندر کی کہانی کے بارے میں کوئی نہیں جانتا جو لے پالک ہو کسی سے گود لیا ہو اور بعد میں اپنی گود بھر جانے پر وہ بالکل بے وقعت ہو جاتا ہو یہاں اس دنیا میں قدر اور محبت ہمیشہ دولت کی ہوتی ہے بڑے نام کی ہوتی ہے اونچے حوالے اور اسٹیٹس کی ہوتی ہے انسان کی کوئی قدر و اہمیت نہیں ہوتی اور اس کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ تھا۔

اسے محبتیں کبھی راس نہیں آسکتی تھیں شاید یہی وجہ تھی کی وہ در بدر سکون کے لیے بھٹکتا تھا مگر یہ سکون جانے کس بلا کا نام تھا کہ مل کر ہی نہیں دے رہا تھا۔صرف اسی ایک انمول نعمت کے لیے اس نے لندن‘ امریکہ‘ سویڈن‘ ہانگ کانگ‘ چین‘ سعودیہ اور نجانے کتنے ملک چھان مارے تھے مگر یہ سکون کہیں نہیں ملا تھا۔وہ اکثر گھر میں اپنے ماں باپ اور بہن بھائی سے اپنے غریب رشتہ داروں کی باتیں نیگیٹو پہلو میں سنا کرتا تھا تب ہی اس مرتبہ پاکستان آمد پر وہ اپنے والد صاحب سے بات کر کے سیدھا وہیں چلا آیا کہ اس کے گھر میں ہونے نہ ہونے سے کسی کو قطعی کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔

کوئی نہیں تھا جو یہ سوچتا وہ کیسا ہے کس حال میں ہے؟ کوئی نہیں تھا جو یہ پوچھتا کہ اس نے کھانا کھالیا ہے یا نہیں؟ تب ہی تو وہ خود بھی اپنے آپ سے بے پروا ہو گیا تھا۔اسے اپنا وجود ایک ایسا بیکار بوجھ لگتا جو اس کے سگے ماں باپ نے نجانے کس مصلحت کے تحت ان دولت کے پجاریوں کی جھولی میں ڈال دیا تھا کہ جنہیں پھر قدرت سے سگی اولاد پا کر اس کی ذات کا کوئی خیال ہی نہیں رہا۔

بچپن کے وہ معصوم جذبات سے لبریز تکلیف دہ دن اسے کبھی نہیں بھولتے تھے جب وہ بھوک سے بے حال ہو کر اپنی ماں کے آنچل کو تھامنے کی کوشش میں ان کے پیچھے پیچھے



پھرا کرتا اور وہ اپنے دو سالہ سگے بیٹے کی فکر میں کبھی اس کا دودھ ابالنے میں مصروف ہوتیں تو سا گو دانہ دلیہ کھچڑی یا کوئی اور چیز بنانے میں کہ جسے ان کا منا شوق سے کھائے اور مصروفیت کے ان لمحوں میں خود اس کی بھوک ہمیشہ ماں کے تھپڑوں یا ان کی ڈانٹ سے مٹتی تھی اور وہ روتا نجانے کب سسکیاں بھرتا کہیں نہ کہیں کسی کونے میں بیٹھتا سو جاتا۔

پھر لاشعوری کے اس دور سے نکل کر شعور کے دور نے اسے اور بھی اذیت دی۔زندگی کی ہر معمولی سے معمولی چیز کے لیے نجانے اسے کتنی بار ترسنا پڑا وہ چیز جو خود اس کی مما بابا کے سگے بیٹے کے منہ سے نکلتے ہی اسے دستیاب ہو جاتی تھی اس قیمتی چیز کا تو وہ شاید کبھی خواب بھی نہیں دیکھتا تھا ہمیشہ اپنے استعمال کی چیزوں میں کنجوسی کرتا ایک ایک کاپی کو مہینوں چلاتا اور اس سے اتنا باریک لکھتا کہ بعض اوقات استاد تنگ آ کر اسے کئی کئی گھنٹے کلاس سے باہر کان پکڑوا دیتے تھے مگر اس نے کبھی گھر آ کر نہیں بتایا کہ اس کے ساتھ اسکول میں کیا سلوک ہوتا ہے۔اس کے برعکس اس سے چھوٹا اذان جب بھی کاپیوں پر ٹیچر سے کھلا کھلا صاف لکھنے پر گڈ یا اسٹار لے کر آتا تو خوشی خوشی اپنے ماں باپ کو دکھاتا اور ایسے میں اس کے ماں باپ کے چہروں پر جو خوشی کے رنگ ہوتے تھے‘ وہ دیکھنے لائق ہوتے۔انہوں نے کبھی اس طرف دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ حنان جیب خرچ کے لیے پیسے کیوں نہیں مانگتا؟ اسے پنسل‘ ربڑ‘ کاپیوں کتابوں کی ضرورت کیوں نہیں ہوتی؟ وہ کبھی ٹیوشن رکھنے کے لیے اصرار کیوں نہیں کرتا؟ اور یہ بھی کہ اذان ہوم ورک یا کلاس ورک کے دوران کتنے صفحے پھاڑ کر بار بار ٹرائی کرنے کے بعد اچھا کام کرتا ہے‘ کبھی اس طرف توجہ کرنے کی زحمت محسوس نہیں کی تھی انہوں نے الٹا ایک دن اس کی مما نے اس کے کلاس ورک پر کٹ کے نشانات لگے دیکھ کر اس کی خوب پٹائی کی تھی۔ اسے کام چور‘ نکما‘ نالائق‘ ہڈ حرام‘ اور نجانے کیا کیا القابات دے ڈالے تھے۔

تاہم یہ مسئلہ بھی جلدی ہی حل ہو گیا کیوں کہ پنجم کے امتحان میں جب اس نے خوب محنت کر کے وظیفے کے امتحان میں فرسٹ پوزیشن لی تو یہ جھنجٹ بھی ختم ہو گیا۔کاپیاں کتابیں مفت مل گئیں اور اس کا ذہن ایک دم سے ریلکس ہو گیا۔

پھر زندگی میں اس نے صرف کامیابیاں ہی کامیابیاں سمیٹیں‘ انگلش لٹریچر میں ایم اے کے بعد وہ برطانیہ چلا گیا جہاں سے مزید اعلیٰ تعلیم اور ڈگریوں کے حصول کے بعد اس کی واپسی پورے سات سال بعد ہوئی تھی اور گھر سے باہر گزرے ان سات سالوں نے اسے یکسر

بدل کر رکھ دیا۔ شوخیاں سنجیدگی میں ڈھل گئیں، ہونٹوں پر ہمہ وقت چپ کا قفل لگ گیا اور آنکھوں میں محرومیوں کے مارے' گرم آنسو، رفتہ رفتہ برف بن کر جمنے لگے۔ اب اسے زندگی سے کوئی گلہ نہیں تھا، اس نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

یہاں گاؤں میں زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے اس کی آمد تو فقط ایک بہانہ تھی جب کہ حقیقی معنوں میں وہ یہاں سکون کی تلاش میں آیا تھا۔ جس کی اب ہمہ وقت اسے اشد ضرورت تھی ملکوں کی خاک چھاننے والے کو یہاں ایک سادہ سے گاؤں میں سکون کی وہ انمول نعمت مل گئی تھی جس کی کھوج میں وہ یہاں تک چلا آیا تھا۔



اس روز دن ڈھلے وہ لمبی پرسکون نیند کے بعد جب فریش ہو کر اپنے کمرے سے باہر آیا تو باہر گیٹ کی سمت بڑھتے اس کے تیز دم اچانک کسی کی سسکیوں کی صدا پر ٹھٹک گئے۔ رخ پھیر کر اس نے بڑے بے ساختہ سے انداز میں پیچھے دیکھا پھر نظر جونہی سکھ چین کے نیچے زمین پر پڑی، اس روتی ہوئی نازک سی لڑکی پر پڑی، وہ حیران سا واپس پلٹ کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب چلا آیا جو نجانے کس دکھ میں یوں آنسوؤں کا قیمتی خزانہ خالی کر رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے اور کس نام سے مخاطب کرے تبھی پریشان وئیں اس کے قریب نیچے بیٹھ گیا اور نرم لہجے میں بولا۔

''ایکسکیوزمی...... آپ اس طرح سے کیوں رو رہی ہیں، کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟''

وہ رضیہ بیگم کے ساتھ اس کی کچھ محاذ آرائیوں کا کھلی آنکھوں اور کانوں سے مظاہرہ کر چکا تھا تبھی بے تاثر سے لہجے کہا تو ایمن نے اس قطعی غیر متوقع آواز پر ایک جھٹکے سے سر اوپر اٹھایا اور عجیب شرمندگی سے اسے دیکھا' جو ستارہ سی چمکتی روشن آنکھوں میں، اس کے لیے فکر اور انہماک لیے' جانے کب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے بری طرح بھیگ چکا تھا۔ چھوٹی سی ناک، رو رو کر خوب سرخ ہوئی تھی' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے اپنے رونے کی وجہ کیسے بیان کرے؟ تب ہی آنسو پونچھ کر فقط ایک نظر اس کی آنکھوں میں ڈال کر اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''لگتا ہے آنٹی کی طرح آپ کو بھی میرا یہاں آنا اور مجھ سے بات کرنا پسند نہیں' سوری۔'' اس کی خاموشی پر وہ تھوڑی ہی دیر بعد قدرے مایوس سے لہجے میں بولا تو ایمن نے گڑبڑا کر بوکھلاتے ہوئے اسے دیکھا، پھر عجیب اداس سے انداز میں بولی۔



''ن' نہیں تو ...... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے' وہ...... وہ دراصل میں' میں تو عمر نواز کی اچانک ڈیتھ پر رو رہی تھی۔'' بھیگی پلکیں اٹھا کر وضاحتی انداز میں اپنے رونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے اس نے اس خوبرو سے ہیرو کی طرف دیکھا جو استفہامیہ نگاہوں سے اس کی نامکمل وضاحت پر قدرے الجھ کر اسے دیکھ رہا تھا۔

''عمر نواز' کوئی عزیز ہے آپ کا......؟'' ستارہ سی آنکھوں میں اب بھی فکر نمایاں تھی۔ ایمن نے سسکی بھرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر...... کوئی دوست تھا......'' جانے وہ کیوں اس قدر تفتیش پر اترا ہوا تھا۔ ایمن سے وضاحت کرنا مشکل ہو گیا۔

''ن' نہیں ......وہ ...... وہ تو عمیرا جی کا ہیرو تھا' امر بیل کا ہیرو، ان کا ناول تھا ناں امر بیل، اس میں' بہت اچھا تھا لیکن بالکل اچانک ڈیتھ ہو گئی اس کی۔ پچھلے دو سالوں سے پڑھ رہی تھی میں ان کو' کتنا دل لگ گیا تھا اس کردار سے۔'' اس کے اداس سے وضاحتی انداز پر حنان کا بڑا بے ساختہ قہقہہ پڑا تھا۔ ایمن نے حیران نگاہوں سے اسے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے دیکھا۔

''او مائی گاڈ' یو آر ریئلی اے فولش گرل۔''

کس قدر حسین لگ رہا تھا وہ ہنستے ہوئے، ایمن تو ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہ گئی۔

''پاگل! کوئی بے جان کرداروں کی موت پر بھی اس قدر روتا ہے' ہاؤ فنی......'' اس سے اپنی ہنسی پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔ ایمن نے اس لمحے کس قدر شرمندگی محسوس کی۔

''آئی ایم سوری' میں آپ کو ہرٹ کرنا نہیں چاہتا مگر مجھے بے حد عجیب لگا ہے کہ کوئی لفظی کردار کے لئے اس قدر حساس بھی ہو سکتا ہے' جب کہ لوگ تو یہاں زندہ کرداروں کی کوئی پروا نہیں کرتے۔''

عجیب اداس سے انداز میں اس نے کہا۔ پھر کچھ دیر اس کی بھیگی پلکوں کی سمت دیکھنے کے بعد وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا گھر سے باہر نکل گیا۔



کٹھن ہے زندگی کتنی
سفر دشوار کرنا ہے
کبھی پاؤں نہیں چلتے

کبھی رستہ نہیں ملتا
ہمارا ساتھ دے پائے
کوئی ایسا نہیں ملتا
گزاروں بھی تو کیسے یہ
روز و شب نہیں کٹتے
مگر مجھ کو مرے مالک
کوئی شکوہ نہیں تجھ سے
میں جاں پر کھیل سکتا ہوں
میں ہر دکھ جھیل سکتا ہوں
اگر تو آج ہی کر دے ''محبت ہمسفر میری''

شام کے دھندلکے دھیرے دھیرے گہرے ہو رہے تھے اور وہ پورے انہماک سے اپنے کمرے میں بیٹھا اپنی پرسنل ڈائری لکھنے میں محو تھا' جب دروازے پر ہلکی سی ناک کر کے ایمن دودھ کا گلاس لیے اس کے کمرے میں چلی آئی۔

''آپ نے دوپہر کا کھانا کیوں نہیں کھایا؟'' ٹیبل پر گلاس رکھنے کے بعد اس نے دھیمے لہجے میں کہا تو حنان نے اچھنبے سے اس کی طرف دیکھا، جسے اس کی فکر تھی، اس کی پروا تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی کے لہجے میں اپنے لیے اپنائیت کا احساس پایا تھا' تب ہی سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بس ایسے ہی، بھوک نہیں تھی۔''

''بھوک کیسے لگے گی، ہر وقت نہ جانے کن کن سوچوں میں گرفتار رہتے ہیں۔'' وہ فوراً قدرے خفا خفا سے لہجے میں بولی تو حنان لبوں پر اُمڈنے والی دھیمی سی بے ساختہ مسکراہٹ دبانے میں ناکام رہا۔ ''آپ کو میرا سوچنا بُرا لگتا ہے......؟'' وہ مسکرایا تھا۔

آج فرسٹ ٹائم وہ اس نازک سی لڑکی کو بغور دیکھ رہا تھا جو زبان کی تیز ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد خوبصورت بھی تھی۔ ایمن کا من چاہا کہ کہہ دے ''حنان! بات میرے اچھا یا برا لگنے کی نہیں ہے، بات تمہاری سے خدا نے تمہیں ہر اختیار دیا ہے' تو کیا تمہارا اتنا سا فرض بھی نہیں بنتا کہ تم اپنا خیال رکھو، اپنی فکر کرو۔'' مگر اس وقت وہ یہ سب اس سے نہیں کہہ پائی،



کہہ بھی نہیں سکتی تھی' تب ہی بات بدلتے ہوئے بولی۔

''وہ......وکیل صاحب کے گھر' شہر سے گھر والوں کا فون آیا تھا آپ کے لیے آج دوپہر میں ہی' ان کی بیٹی بتا کر گئی ہے۔ انہیں پتہ نہیں تھا کہ آپ یہاں ہمارے گھر آئے ہوئے ہیں ورنہ وہ اسی وقت آپ کو بلا لیتیں، اب شام کو یہ فون آئے گا آپ کہیں جانا مت، کیوں کہ بابا تو گھر میں نہیں ہیں، پھر ہم آپ کو کہاں ڈھونڈتے پھریں گے؟'' اس کی حلیمی اور نرم مزاجی سے حوصلہ پا کر وہ اس کے ساتھ بات کرنے کی جرأت کر پائی تھی۔ حنان اس کے بات بدلنے پر سخت بیزار ہوا، پھر دھیمے سے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے اس کی جھکی پلکوں کو بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ رسالے پڑھنے کے علاوہ بھی کوئی کام وام کرتی ہیں یا نہیں؟''

اس کا انداز ایسا تھا کہ ایمن کو پل کے پل میں شدید غصہ آیا، وہ اسے اتنی نکمی لڑکی سمجھتا ہوگا، اس کا تو تصور بھی نہیں تھا اسکے پاس، تب ہی ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ناراضی سے اسے دیکھتے ہوئے جتانے والے انداز میں بولی۔

''میں اتنی پھوہڑ نہیں ہوں، جتنی آپ مجھے سمجھ رہے ہیں، پورے 645 نمبر لے کر اے ون گریڈ سے میٹرک پاس کیا ہے میں نے، اور اب انشاء اللہ سیکنڈ ایئر بھی فرسٹ ڈویژن سے ہی کلیئر کروں گی، دیکھنا آپ......''

اس کے یوں اچانک جذباتی ہو جانے کو' حنان نے کسی قدر حیرانی سے دیکھا۔ پل میں دھوپ، پل میں چھاؤں جیسی یہ لڑکی ہر گزرتے دن کے ساتھ اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

''مگر میں نے کب کہا کہ آپ پھوہڑ ہیں، رسالے پڑھنا کوئی بری بات نہیں، بشرطیکہ آپ ان میں اچھی باتوں کو سنجیدگی سے پک کریں، بہر حال کون سا رسالہ پڑھتی ہیں آپ؟''

اس کے سرخ سرخ سے ناراض چہرے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے وہ قدرے دھیمے انداز میں بولا تو ایمن گویا نہال ہو گئی، تب ہی پٹ سے جواب دیا۔

''آنچل!''

''کیوں، کوئی خاص بات ہے اس میں؟'' پین بند کر کے ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ دلچسپی سے بولا۔

''بالکل' بہت سی خاص باتیں ہیں، سب سے پہلی خاص بات تو یہ ہے کہ اس

پرچے میں نئے پرانے ہر ریڈر کو یکساں محبت ملتی ہے' آپ محنت سے، وقت نکال کر خط لکھیں اور آپ کو نظر انداز کر دیا جائے، ایسا تو تصور بھی نہیں ہے اس میں۔ دوسرا اس پرچے کی کہانیاں، ایک دم طبیعت فریش کر دیتی ہیں اور تیسری انفرادیت یہ ہے کہ اس میں کہانیوں کے ہیروز بڑے ڈیشنگ ہوتے ہیں۔'' آخری بات اس نے چٹخارہ لے کر کہی تھی۔ حنان کو بے ساختہ ہی اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

''آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟'' فوراً ہی ہاتھ کمر پر جما کر وہ لڑاکا انداز میں بولی تو حنان نے بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پا کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں، بس یونہی، ہیروز سے آپ کے دل چسپی کے انداز پر ہنسی آ گئی تھی۔ بہرحال آئندہ وقت ملا تو میں بھی یہ پرچہ پڑھوں گا اور دیکھوں گا کہ واقعی اس پرچے میں کیسے ہیروز ہوتے ہیں، جن کا ذکر آپ اتنے دل چسپ انداز میں کر رہی ہیں۔''

''ہاں ضرور پڑھیے گا، مگر برائے مہربانی، ہیروز کے بارے میں پڑھ کر کہیں خود کو ہیرو سمجھنے کی غلطی مت کر لیجیے گا۔ اللہ نگہبان.....'' خاصا تنک کر اس نے جواب دیا تھا اور پھر رضیہ بیگم کی ڈانٹ کے خوف سے فوراً ہی کمرے سے باہر نکل آئی۔ رضیہ بیگم کچن میں رات کے کھانے کی تیاری میں جتی ہوئی تھی، وہ حنان کے کمرے سے نکل کر سیدھی گلاب اور موتیا کی باڑ کے قریب چلی آئی جن کی معطر خوشبو، ٹھنڈی ہواؤں نے پورے صحن میں پھیلا رکھی تھی۔

حفیظ صاحب سکول کے کسی کام سے پاس ہی شہر میں گئے ہوئے تھے، تب ہی وہ بستر وغیرہ لگانے سے بے فکر تھی کیوں کہ ایک وہی تھے، جو کھانا کھانے کے تھوڑی دیر بعد بستر سنبھال لیتے تھے۔

وہ پہلو میں مچلتے دل کو تھپکتے ہوئے مسلسل حنان کے تصور میں کھوئی رہی، اس کی خوب صورتی، سلجھا ہوا لہجہ، اچھی عادات، سب نے اسے بے حد انسپائر کیا تھا۔ ایسے ہی ہیرو کے تو خواب دیکھتی تھی وہ۔ ابھی وہ اسی کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ وکیل صاحب کے گھر سے حنان کے لئے فون کا پیغام آ گیا' جو ایمن نے رضیہ بیگم کی اجازت کے بعد فوراً اس تک پہنچا دیا۔

''آنٹی! مجھے وکیل صاحب کے گھر کا علم نہیں ہے، اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو آپ کا احسان ہوگا مجھ پر۔'' اپنے کمرے سے نکل کر وہ سیدھا کچن میں ان کے پاس چلا آیا تھا مگر رضیہ بیگم نے بڑی سہولت سے معذرت کر لی۔



''مگر میں تو روٹی بنا رہی ہوں بیٹے' تمہارے ماموں آتے ہی کھانا کھائیں گے۔'' ان کا انداز قطعی سرد تھا۔ ایمن نے اس پل حنان کے لیے کسی قدر دل گرفتگی محسوس کی تھی' خود حنان کو ان کی سرد مہری سے دلی چوٹ پہنچی تھی' تاہم وہ اب کسی بھی رشتے سے امیدیں لگانے والا حنان نہیں رہا تھا' تب ہی تو سر جھکا کر خاموشی سے ان کا واضح انکار سنا اور چپ چاپ قدم دہلیز کی سمت بڑھا دیئے کہ اب اسے راستے میں کسی اور سے ہی وکیل صاحب کے گھر کا پوچھنا تھا۔

''ایمن! تم جاؤ اس کے ساتھ اور دیکھو، پانچ منٹ کے اندر اندر گھر واپس آ جانا، زیادہ اپنائیت جتانے کی ضرورت نہیں ہے اس سے سمجھیں تم.....؟'' پتہ نہیں انہیں حنان سے اس قدر چڑ کیوں تھی؟ مگر ایمن فی الحال اس چکر میں الجھنا نہیں چاہتی تھی، تب ہی جلدی سے ''اچھا اماں'' کہہ کر دروازے کی سمت لپکی کہ حنان گھر کی دہلیز پار کر کے باہر نکل چکا تھا۔

حنان کو رضیہ بیگم کے اس درجہ اجنبی رویے پر دلی تکلیف پہنچی تھی، تب ہی وہ بے حد اداس سا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہا تھا کہ اچانک اس نے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنی، پھر پلٹ کر پیچھے دیکھا تو ایمن کو تیز تیز قدم اٹھاتے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔

''اف' کتنا تیز چلتے ہیں آپ.....؟ پتہ نہیں پاؤں ہیں کہ پہیئے، منٹ میں اتنی دور نکل آئے، میرا تو سانس پھول گیا، آپ تک پہنچتے پہنچتے۔'' پھولے ہوئے سانسوں کو ہموار کرتی وہ قدرے شکایتی انداز میں بولی تو حنان نے ایک سنجیدہ سی نظر اس پر ڈالی کر رخ پھیر لیا۔

''آ.....آپ کو اماں کے انداز نے تکلیف دی ہے ناں' تو دیکھیں ان کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ آپ پلیز ان کی کسی بات کو کبھی دل پر مت لیا کریں، پلیز.....'' وہ جان گئی تھی کہ حنان کے دل کو رضیہ بیگم کے انداز سے چوٹ پہنچی ہے تب ہی ملتجی سے انداز میں بولی تو حنان نے اپنے بڑھتے قدم روک کر ایک نظر اپنے پہلو میں کھڑی، اس اداس سی خوب صورت لڑکی کو دیکھا، جسے نجانے اس کا اتنا خیال کیوں تھا؟

''مگر میں نے کب کہا ہے کہ مجھے آنٹی کی کسی بات سے تکلیف پہنچی ہے؟'' اس کے ندامتی انداز کو محسوس کر کے وہ بے حد سپاٹ لہجے میں بولا تو ایمن نے سکون کا سانس لیتے ہوئے تشکر سے اسے دیکھا۔

''بس یونہی مجھے لگا کہ آپ نے شاید ان کے لہجے کو مائنڈ کیا ہے، حالانکہ وہ شروع سے ایسی ہی ہیں، اب مجھے ہی دیکھ لیجیے بالکل سگی بیٹی ہوں ان کی، مگر جب بھی مجھ سے بات کرتی ہیں

تو لگتا ہے میں ان کی سگی بیٹی نہیں ہوں اور تو اور دوستوں کا بھی لحاظ نہیں کرتیں، مگر کیا کروں' ماں ہیں ناں لہٰذا اب جیسے تیسے گزارہ تو کرنا ہی پڑے گا ان کے ساتھ۔'' وہ نان اسٹاپ بولتی رہی اور حنان دھیمے دھیمے مسکراتے ہوئے اس کی روداد سنتا رہا۔ تب ہی باتوں باتوں میں وکیل صاحب کا گھر آ گیا تو اس کی زبان کو بھی بریک لگ گئی' پھر حنان تو فون سننے کے لیے وکیل صاحب کی کھلی ہوئی بیٹھک میں داخل ہو گیا جب کہ وہ اندر گھر میں ان کی بیوی اور بیٹی کے پاس چلی گئی۔

فون لاہور سے شہزاد رؤف صاحب کا تھا، جس میں انہوں نے حنان کو اپنی بڑی بیٹی کی بات پکی ہونے کی خوش خبری سنائی تھی اور حنان سے کہا تھا کہ اگر اس کے لیے ممکن ہو تو وہ شہر آ جائے تاکہ منگنی کی باقاعدہ رسم میں اس کی بھی شمولیت ہو جائے مگر حنان چونکہ ایسے جھمیلوں سے دور بھاگتا تھا' سو اس نے بڑی سہولت سے معذرت کر لی اور تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

فون بند کر کے تھوڑی دیر وکیل صاحب کے ساتھ گفت و شنید کے بعد وہ جب بیٹھک سے باہر نکلنے لگا تو اس نے وکیل صاحب سے ایمن کو باہر بھیج دینے کو کہا تھا مگر اب وہ پچھلے دس منٹ سے وہیں کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا اور وہ تھی کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی، تب مجبوراً اسے دروازے پر دستک دینا پڑی اور جواب میں تھوڑی ہی دیر بعد وہ ہنستی کھلکھلاتی گھر سے باہر نکل آئی۔

''ہو گئی بات......؟ کیا کہہ رہے تھے آپ کے گھر والے......؟'' وہ اسے دیکھتے ہی تیز تیز بولتی چلی گئی' اور حنان چل پڑا تھا تو اس کے برابر ہونے کی کوشش میں تقریباً بھاگتے ہوئے اس نے سوال کیا۔ جواب میں حنان نے رک کر خاص خفگی سے اسے گھورا اور وہ چونکہ اس کی خفگی کا مفہوم سمجھ چکی تھی، تب ہی کھلکھلاتے ہوئے بولی۔

''اُو سوری' وہ کیا ہے کہ میں وکیل صاحب کی بیٹی سے ''میں نے پیار کیا'' فلم کی اسٹوری سننے لگ گئی تھی' واہ کیا زبردست فلم ہے۔ کیا محبت ہے ہیرو ہیروئن کی' ویسے آپ فلمیں دیکھتے ہیں کیا......؟''

وہ کہاں اس کی خفگی کو خاطر میں لانے والی تھی، حنان غصے سے اسے دیکھتے ہوئے سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا تو قدرے گھبرا کر وہ بھی اس کے پیچھے لپکی' مگر برا ہو قسمت کا کہ گلی میں معمولی سا کھڈ ہونے کے باعث اس کا پاؤں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور وہ اگلے ہی پل



لڑکھڑا کر دھم سے نیچے گر گئی۔

''دیکھا جلد بازی کا نتیجہ' لے کے پاؤں تڑوا دیا میرا' غصہ نجانے کس کا ہے' نکال مجھ پر رہے ہیں' جیسے میں باندی ہوں ان کی......''

حنان نے جونہی پلٹ کر اسے دیکھا وہ زمین پر دھرنا دیئے بیٹھی' بلند آواز میں شروع ہو گئی۔ ناچار اسے چند قدم پیچھے آ کر اسے سہارا دیتے ہوئے اٹھانا پڑا۔

''اف' مجھ سے تو چلا ہی نہیں جا رہا، اب میں کیا کروں......؟'' معصوم سی شکل بنا کر وہ عاجزانہ انداز میں بولی تو حنان نے آرام سے اس کا تھاما ہوا ہاتھ چھوڑ دیا، پھر ریلیکس انداز میں بولا۔

''کرنا کیا ہے' یہیں بیٹھی رہو' جب درد کم ہو جائے تو گھر چلی آنا......''

ایمن کو ہرگز اس سنگدلی کی امید نہیں تھی، تب ہی اس کے اجنبی انداز پر جلتی بھنتی، بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی

''ایک تو ان کے کام آؤ، اوپر سے پاؤں تڑواؤ' سچ کہتے ہیں کہنے والے' یہ پردیسی لوگ، کسی کے ہمدرد نہیں ہوتے، انہیں تو صرف چوٹ پہنچانا آتی ہے، مرہم لگانا نہیں......'' وہ بلند آواز میں بڑبڑاتی رہی اور حنان بے ساختہ مسکراتے ہوئے چپ چاپ چلتا رہا۔

وہ لوگ گھر پہنچے تو رضیہ بیگم کا موڈ بے حد خراب تھا، تب ہی حنان سے تو انہوں نے کچھ نہیں کہا مگر ایمن کے خوب لتے لیے، تاہم وہ ہمیشہ کی طرح ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتے ہوئے ڈھیٹ بنی رہی۔

اگلے روز حنان صبح کو بیدار ہوا تو ایمن نے اس کے جاگنے سے قبل ہی غسل خانے والے ٹب میں پانی بھر کر رکھ دیا تھا۔ تولیہ' صابن اور کنگھا بھی سلیقے سے رکھ دیا' پھر یونہی نجانے من میں کیا آئی کہ صابن اٹھا کر غسل خانے کے پھسلن فرش پر اچھی طرح مسل دی اور گنگناتے ہوئے کچن میں رضیہ بیگم کے ساتھ ناشتے کی تیاری کرانے لگی۔ دل کے اندر ہی اندر حنان کو پیش آنے والے متوقع واقعہ کا سوچ کر اس کے قہقہے پھوٹ رہے تھے مگر برا ہو قسمت کا کہ اس کے کمرے سے نکلنے سے قبل ہی حفیظ صاحب نہانے کے لیے چل دیئے اور جونہی پہلا قدم اندر غسل خانے میں دھرا، دھڑم سے پھسل کر پانی والے ٹب پر آ گرے۔ وہ تو خدا کا شکر کہ انہیں کوئی چوٹ نہیں لگی وگرنہ ایمن کی درگت یقینی تھی۔

پھر ایمن کو غسل خانے میں جونہی کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی، وہ کھلکھلاتے

ہوئے کچن سے باہر بھاگی، ارادہ حنان کا مذاق اڑانے کا تھا، مگر اگلے ہی لمحے حفیظ صاحب غسل خانے سے برآمد ہوئے اس کی ہنسی کو فوراً بریک لگ گئے۔ کس قدر شرمندگی سے اس نے کپڑوں سمیت بھیگے ہوئے حفیظ صاحب کو دیکھا اور چپ چاپ سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر بکھرے ندامت کے رنگوں کو دیکھتے ہی وہ سمجھ گئے تھے کہ شرارت ان کی بیٹی کی ہے، تب ہی تو کوئی تماشہ کیے بغیر چپ چاپ ملامتی نظروں سے انہوں نے ایمن کو دیکھا اور اندر کمرے میں واپس چلے گئے۔ مارے شرمندگی اور افسوس کہ ایمن سے تو نظر اٹھانا مشکل ہو گیا تھا۔

''چچ.....چچ.....چچ' دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے، کبھی کبھی خود بہت بڑا نقصان اٹھاتے ہیں۔'' حنان نجانے کب وہاں آ کھڑا ہوا تھا۔ ایمن نے جھٹکے سے سر اٹھا کر غصے سے اسے دیکھا، جس کی ستارہ سی روشن آنکھوں میں تبسم کی ہلکی سی چمک تھی، پھر اگلے ہی پل وہ اسے خفگی سے گھورتی، اندر حفیظ صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ رہ رہ کر اسے حنان پر شدید غصہ آ رہا تھا جو جان بوجھ کر کمرے سے نہیں نکلا تھا اور جواب میں حفیظ صاحب کے ساتھ وہ ٹریجڈی ہو گئی جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پھر اسی جرم کی سزا میں اس نے رضیہ بیگم سے آنکھ بچا کر حنان کی چائے کی پیالی میں تین چمچ بھر بھر کر نمک کے ڈال دیئے اور چمچ سے اچھی طرح حل کر کے ناشتے کی ٹرے میں رکھ دیا۔ حنان نہا دھو کر تیار ہو کر صحن میں آیا تو ایمن نے جھٹ پٹ ناشتے کی ٹرے لا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ اس کے انداز سے وہ سمجھ تو گیا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے تاہم ایمن پر اپنا شک ظاہر نہ کیا اور پراٹھے کے دو چار نوالے لینے کے بعد اس نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ ایمن اس دوران بے قراری سے دوپٹے کا پلو مروڑتی اس کے چائے پینے کا انتظار کرتی رہی' پھر جب حنان نے چائے کا پہلا گھونٹ بھرا تو نمک کی کڑواہٹ سے اسے کھانسی آ گئی اور اس کی غلافی آنکھوں میں پل کے پل ڈھیر سارا پانی جمع ہو گیا۔ ایمن اس شرارت پر کھل کھلا کر ہنسنا چاہتی تھی مگر نجانے کیوں اسے حنان کی حالت دیکھ کر، بے حد ندامت ہوئی اور وہ فوراً پانی لینے کے لیے کچن کی طرف بھاگی اور جب پانی کا گلاس لا کر اسے تھما نے کی کوشش کی تو حنان نے پانی پینے سے صاف انکار کر دیا اور پھر سے چائے کا کپ اٹھا کر ں سے لگا لیا مگر اس بار ایمن نے جھپٹ کر اس کے ہاتھوں سے کپ چھین لیا۔ پھر ساری ئے کیاری میں گرا کر اس کے لیے پھر سے چائے بنانے لگی۔

یہ ٹھیک تھا کہ وہ نٹ کھٹ، لاابالی لڑکی تھی، یہ بھی ٹھیک تھا کہ اسے ہر خوب صورت لڑکا'



بے حد اچھا لگتا تھا اور وہ اس کے ساتھ محبت کے خواب دیکھتی تھی، مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ یہ سب صرف انجوائے کے لیے کرتی تھی، دو دن ایک لڑکے کے لیے آنسو بہا کر وہ دوسرے کے پیچھے پڑ جاتی اور پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد محبت محبت کا کھیل ختم ہو جاتا کیوں کہ چند روز کے بعد ہی اسے کوئی اور خوب صورت لڑکا اپنا ہیرو لگنے لگتا تھا اور یوں اسے آج تک کبھی اپنی کسی حرکت کا افسوس یا اس پر شرمندگی کا احساس نہیں ہوا' مگر آج پہلی مرتبہ، نجانے کیوں اسے حنان کے چپ چاپ کڑوی چائے پینے پر بے حد ندامت اور دکھ ہوا تھا اور وہ اپنے اس احساس کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھی۔

دوپہر تک وہ اسی احساس کی گرفت میں رہی کہ اچانک پنکی اس کی طرف آ دھمکی، پھر اسے چپ چاپ اور اکیلی بیٹھے دیکھ کر بشاشت سے بولی۔

''یا اللہ' تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے ایک شیطان کی آنت نے دنیاداری سے کنارہ کشی کر کے، عقل کا راستہ پکڑا، ویسے دیوی جی، یہاں اکیلے اکیلے درخت کے نیچے بیٹھ کر، کون سے منتر پھونک رہی ہیں آپ.....'' بلند آواز میں چہکتی وہ اس کے پاس آ بیٹھی اور اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر اسے ہوش کی دنیا میں لائی تو ایمن نے حسب عادت گھور کر اسے دیکھا، پھر اسے تنبیہ کرنے والے انداز میں تپ کر بولی۔

''دیکھو پنکی' میں اس وقت بے حد سیریس موڈ میں ہوں، اگر اس وقت تم نے کچھ الٹا سیدھا بولا ناں تو اچھا نہیں ہو گا۔ او کے۔'' اس کے جارحانہ انداز کو پنکی نے ہنس کر ہوا میں مکھی کی طرح اڑایا اور قطعی بے نیازی سے بولی۔

''اللہ رے' یہ شان اور شان بے نیازی، ویسے محترمہ! مجھے بھی تمہارے منہ لگنے کا کوئی شوق نہیں ہے، وہ تو میں تم سے یہ پوچھنے آئی تھی کہ آج رات کو ناہید کی مہندی پر چلنا ہے کہ نہیں، کیوں کہ شانو کی معرفت، ابھی کچھ دیر قبل ہی مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ ناہید کی مہندی، اس کی خالہ کر رہی ہیں اور اس کی خالہ کے ماشاء اللہ سے تین پڑھے لکھے، ہینڈسم' نوجوان بیٹے ہیں جو ناک پر مکھی تک بیٹھنے نہیں دیتے، اب تم سوچ لو کہ تمہاری کیا مرضی ہے۔''

وہ جو اس وقت اس کی بے وقت آمد پر خاصی بیزار ہو رہی تھی، تین عدد ہیروز کا سن کر ایک دم چوکنا ہو گئی۔

''تم..... سچ کہہ رہی ہو نا.....؟'' بے یقینی سے لہجے میں اس نے پوچھا۔

''لو' مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں تم سے جھوٹ بولوں' تمہیں چلنا ہے تو چلو'

نہیں چلنا تو مت چلو، کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔'' وہ جانتی تھی کہ ایمن اب ہرگز رکنے والی نہیں ہے، تب ہی رعب سے بولی تو ایمن نے فٹافٹ اثبات میں سر ہلا دیا۔

''گڈ' یہ ہوئی ناں بات۔ ویسے تمہارے وہ چپ گھنے ہیرو صاحب کا کیا حال ہے، آج کل دکھائی نہیں دے رہے۔'' اس کے اقرار پر خوش ہوتے اسے اچانک ہی حنان کا خیال آیا تو پوچھ بیٹھی۔

''دکھائی کہاں سے دیں گے تمہیں؟ گھر پر ٹکیں گے تو دکھائی دیں گے ناں؟ پتہ نہیں سارا سارا دن کہاں نکلے رہتے ہیں۔'' وہ سخت بیزار تھی، تب ہی دل جلے لہجے میں بولی تو پنکی نے چونک کر مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''اندر دل وادی میں سب خیریت تو ہے ناں؟ وہ کیا ہے کہ تمہارے اس دل جلے لہجے سے مجھے اس ہیرو سے تمہاری دل چسپی کی بو آ رہی ہے۔''

''دل چسپی' اور وہ بھی اس گھنے سے؟ میری عقل کیا گھاس چرنے گئی ہے، جو میں اس گھونچو میں دل چسپی لوں گی، پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے کبھی کبھی تمہاری عقل کو، ارے، اس جیسے سو ہیرو، میرے حسن پر قربان، چار دن کی چاندنی ہے بس.....'' گردن تفاخر سے اکڑا کر بولی تو پنکی واقعی اس سے مرعوب ہوگئی۔

''اچھا' اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر اس کو دیکھتے ہی سٹی کیوں گم ہو جاتی ہے تمہاری؟'' اس کے مغرور لہجے سے مرعوب ہونے کے باوجود وہ خاصے کڑک لہجے میں بولی۔

''میری سٹی کیوں گم ہوگئی، میں کوئی ڈرتی ہوں اس سے وہ تو بس مہمان ہونے کا لحاظ آجاتا ہے وگرنہ ایسے ہیرو تو صبح و شام آگے پیچھے پھرتے ہیں میرے۔''

وہ جب شو مارنے پر آتی تھی تو انتہا کر دیتی تھی۔ پنکی کو کچھ روز پہلے کا واقعہ یاد آ گیا، تب ہی قدرے جھک کر آہستگی سے بولی۔

''آہستہ بولو' اگر اس دن کی طرح وہ تمہارے ہیرو صاحب آج بھی اچانک آ ٹپکے تو میری تو خیر نہیں، میں نے تو پہلے ہی اتنے دنوں کے بعد ادھر کا رخ کیا ہے۔''

پنکی کو اپنا چند روز پہلے سر پر پاؤں رکھ کر فرار ہونا بخوبی یاد تھا، ایمن نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ انداز خالص پنکی کا مذاق اڑانے والا تھا، مگر کھل کھلا کر ہنستے ہوئے پل کے پل میں جونہی نظر اٹھا کر اس نے سامنے دیکھا، اس کے تو گویا ہوش اڑ گئے۔ حنان بالکل سامنے ہی کھڑا بڑے پرسکون



انداز میں دونوں بازو سینے پر باندھے خاصی دل چسپی سے انہیں بڑھکیں مارتے ہوئے سن رہا تھا اور اسے یوں سکون سے متبسم سا کھڑا دیکھ کر ایمن کی تو اوپر کی سانس اوپر، اور نیچے کی سانس نیچے ہی رہ گئی۔ پتہ نہیں وہ ان کی انتہائی پرسنل گفتگو میں سے کیا کیا سن چکا تھا۔

''ک.....کون ہے.....؟'' اسے اچانک یوں گم سم سا دیکھ کر پنکی کا تو دل بیٹھ گیا۔ پھر بھی ہمت کر کے' ڈرتے ڈرتے اس نے ایمن کی نظر کی سمت میں پیچھے مڑ کر دیکھا تو اپنے پیچھے کھڑے حنان پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کا رنگ ایک دم فق ہوگیا۔

''اوہ، تمہارا یہ ہیرو تو ضرور کسی دن ہارٹ اٹیک کروا کے بے موت مارے گا مجھے.....'' اس نے ایمن کے کان میں سرگوشی کی، پھر زبردستی لبوں پر دوستانہ سی مسکراہٹ پھیلا کر حنان کی سمت دیکھا اور احترام سے اسے سلام کر کے کسی خرگوش کی مانند دوڑ لگا دی۔ مگر افسوس کہ راستے میں ہی اندھا دھند بھاگتے ہوئے وہ صحن میں رکھی لوہے کی بالٹی سے جا ٹکرائی اور دھڑم سے فرش پر گر پڑی۔ حنان جو اس کے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے پر ہی مسکرا اٹھا تھا، اب یوں ایک دم سے فرش نشین ہونے پر کھل کھلا کر ہنس پڑا جب کہ دبی دبی سی مسکراہٹ ایمن کے لبوں کو بھی چھو گئی' اور اس کے اس انداز نے پنکی کو خوب جلایا، تب ہی وہ چھلی ہوئی کہنی کو دوپٹے سے صاف کرتی، لڑکھڑا کر اٹھی اور ناراضی سے بھرپور ایک کڑی نظر، ہنستی ہوئی ایمن کے چہرے پر ڈال کر چھپاک سے باہر نکل گئی۔

اس کے گھر سے باہر جاتے ہی تھکا تھکا سا حنان، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ایمن کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ پھر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر، خاصی دل چسپی سے اس کا گھبرایا گھبرایا سرخ چہرہ دیکھتے ہوئے متبسم لہجے میں بولا۔

''میں.....گھونچو ہوں.....؟''

وہ جو بے تابی سے انگلیاں مروڑتی اس کے سر سے ٹلنے کا انتظار کر رہی تھی، اس کے سوال پر ایک دم سے بوکھلا سی گئی۔

''ن.....نہیں.....وہ.....وہ میں تو مذاق کر رہی تھی.....''

پتہ نہیں وہ چپ گھنا کب سے کھڑا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ ایمن کی تو آج حقیقی معنوں میں بولتی بند ہوگئی تھی۔

''بہت عجیب مذاق کرتی ہیں آپ۔ بہرحال اور کون کون سے القاب سوچ رکھے

ہیں میرے لیے، پلیز آج وہ بھی بتا دیجئے۔'' وہ اس کی گھبراہٹ کو بھرپور انجوائے کر رہا تھا۔
ایمن سے تو جان چھڑانا مشکل ہوگئی، تب ہی عجیب شرمندہ سی نظروں سے اسے بس ایک نظر
دیکھا، پھر ''سوری'' کہہ کر جو وہاں سے بھاگی تو پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ حنان کے بھرپور بے
ساختہ قہقہے نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔



پنکی اور ایمن کا انٹر کا رزلٹ آؤٹ ہوگیا تھا اور وہ پورے گھر میں تتلی کی مانند اڑی
پھر رہی تھی کیوں کہ اس نے دعویٰ کے مطابق فرسٹ ڈویژن سے ایف اے کلیئر کیا تھا اور پنکی
نے تھرڈ ڈویژن سے، مگر پھر بھی وہ بھرپور خوشی سے خوب بھینچ بھینچ کر اس سے گلے ملی تھی۔
رضیہ بیگم نے فرطِ جذبات میں اس کی پیشانی چوم کر، پورے محلے میں مٹھائی تقسیم کی اور ایمن کو
انعام کے طور پر اس کی پسند کا سوٹ لے کر دیا۔ حفیظ صاحب کی خوشی بھی دیدنی تھی، اپنے حلقہ
احباب میں بڑے فخر سے انہوں نے اپنی بیٹی کی قابلیت کا تذکرہ کیا اور ایمن کو پورے پانچ سو
روپے بطور انعام دیئے۔

شام کو جب حنان گھر آیا تو اسے بھی انہوں نے ہی یہ خوش خبری سنائی تھی، جسے سن
کر اسے بھی دلی خوشی ہوئی تھی۔ تب ہی اس نے ایمن کی تلاش میں نظریں دوڑائیں مگر اس
وقت وہ اسے کہیں نظر نہ آسکی تھی، تب ہی بس ذرا سا مسکرا کر وہ حفیظ صاحب سے اس کی
ذہانت اور قابلیت کی تعریف کرنے لگا۔

پھر شام کو جب وہ اس کے لیے چائے لے کر آئی تو اسے کپ تھماتے ہوئے
خاموش نہ رہ سکی، تب ہی ایک ادا سے بولی۔

''ابا نے آپ کو میرے رزلٹ کا تو بتا ہی دیا ہوگا' دیکھ لیجئے میں نے
پورے 740 نمبر فرسٹ ڈویژن سے انٹر کلیئر کر لیا، اب جلدی سے میرا انعام نکالیے۔'' فری
انداز میں وہ اس کے سر پر سوار تھی۔ حنان نے مسکرا کر خوش دلی سے اس کا یہ انداز دیکھا، پھر
اٹھ کر اپنی پرسنل الماری کی طرف گیا اور اس میں سے کرن رباب نقوی کی ''روگ جو ٹھہرا''
شاعری پر مشتمل بک لا کر ایمن کے ہاتھ پر دھری۔

''یہ لو' تمہاری کامیابی پر میری طرف سے' فی الحال یہی خوب صورت گفٹ پیش
ہے، یقیناً تمہیں پسند آئے گا۔''



شہد رنگ، ستارہ سی روشن آنکھوں میں، بے پناہ خوشی اور محبت کے دیپ جل رہے
تھے، ایمن تو کتاب تھام کر اس کی غلافی آنکھوں میں ہی دیکھتی رہ گئی۔

''کیا ہوا گفٹ پسند نہیں آیا؟'' اسے گم سم سا یک ٹک اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ مترنم
لہجے میں بولا تو ایمن نے فوراً سے پیشتر نفی میں سر ہلا دیا' پھر سر جھکا کر آہستگی سے بولی۔

''گفٹ تو بہت انمول ہے' مگر...... شاید میری تقدیر' اتنی اچھی نہ ہو۔'' پتہ نہیں وہ کیا
بیان کرنا چاہ رہی تھی' حنان نے دھیمے سے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر اس کے سر پر ہلکی سی چپت
لگاتے ہوئے دھیرے سے ''پگلی'' کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایف اے کا رزلٹ آؤٹ ہوتے ہی پنکی کے گھر والوں نے اس کی شادی کے دن
طے کر دیئے تو ایمن کا دل اداسی سے بھر گیا۔ پنکی اس کے بچپن کی اکلوتی فرینڈ تھی، اب ایک
دم سے اس کی دائمی جدائی اسے شدید دکھ سے دوچار کر رہی تھی، تب ہی وہ یہ خبر سنتے ہی اندر
ہی اندر رو پڑی تھی۔ اس وقت بھی وہ اداس سی گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی تھی، جب حنان
دھیرے دھیرے چلتا اس کے پہلو میں آ بیٹھا اور مدھم لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا بات ہے ایمن، صبح سے دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت اپ سیٹ ہو' کہیں پنکی سے تو
جھگڑا نہیں ہوگیا......'' اس کے اپنائیت بھرے لہجے پر ایمن نے دھیرے سے اپنا سر اٹھایا، تو
نجانے کتنے ہی آنسو کی پلکوں سے لڑھک کر گالوں پر بکھر گئے۔ حنان کا دل جیسے کسی نے مٹھی
میں لے لیا۔

''ارے تم رو رہی ہو...... مگر کیوں......؟ پلیز مجھے بتاؤ کہ کیا بات ہے؟'' اس کے بے
دردی سے بہتے آنسوؤں نے اسے حقیقی طور پر دلی تکلیف دی تھی، تب ہی وہ یوں بے چین ہوا تھا۔

''ایمن پلیز مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا ہے' کیوں اس طرح رو رہی ہو تم......؟'' وہ حد
درجہ فکر مندی سے بولا تو ایمن کو بھی شاید اپنی حماقت کا احساس ہوگیا، تب ہی ہتھیلی کی پشت
سے آنسو پونچھتی، بھیگتے ہوئے اداس لہجے میں بولی۔

''عائشہ خالہ نے پنکی کی شادی کے دن رکھ دیئے ہیں، اب تھوڑے ہی دنوں میں
وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے گی، میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

'اوگاڈ' میں سمجھا پتہ نہیں کیا بات ہوگئی، تم تو واقعی بہت پاگل لڑکی ہو۔'' اس کی دکھی
روداد سن کر وہ قدرے متبسم لہجے میں بولا تو ایمن نے بے حد افسوس سے اس کی سمت دیکھا پھر

ناراض لہجے میں بولی۔

''ہاں' آپ تو ایسے ہی کہیں گے' اگر آپ کو کسی سے اتنا پیار ہوا اور وہ آپ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائے، تب میں آپ سے پوچھوں کہ پاگل پن کیا ہوتا ہے......''

اس کے خفا خفا سے لہجے پر حنان نے خاصی دل چسپی سے اس کی بھیگی ہوئی لانبی پلکوں کو دیکھا' پھر خاصے سنجیدہ انداز میں بولا۔

''ایسی بات نہیں ہے ایمن' دراصل ایک نہ ایک دن تو سب کو کہیں نا کہیں جانا ہی ہوتا ہے، اب ہم سب کے لیے آنسو ہی بہاتے رہیں تو سوچو، ہماری تو پوری زندگی آنسوؤں کی نذر ہوگئی ناں، اور پھر میں سمجھتا ہوں کہ اپنے دکھ کو اشتہار بنا کر ہمدردیاں سمیٹنا بھی قطعی اچھی بات نہیں ہے، اب تم ہی بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟'' وہ خالص دوستانہ انداز میں بولا تو ایمن نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

''گڈ' چلو اب اٹھو اور اچھی طرح منہ ہاتھ دھولو' دیکھو تمہارا کاجل کیسے پورے چہرے پر پھیل آیا ہے۔'' اس کے آرام سے مان جانے پر وہ خاصے فریش لہجے میں بولا' پھر مسکراتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

پنکی کی رخصتی کا دن قریب آیا تو ایمن کی سج دھج دیکھنے لائق تھی، وہ تو سچ مچ اس کا مسحور کن سا حسن دیکھ کر مبہوت ہوگیا۔ شادی کی ساری تقریب میں وہ ایمن کے ساتھ ساتھ رہا اور گاؤں کی اس منفرد سی شادی کو خوب انجوائے کیا۔ وہ دونوں دن ڈھلے گھر واپس لوٹے تو حفیظ صاحب اسی کے منتظر تھے۔

''آؤ آؤ بیٹا' میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' اسے دیکھتے ہی وہ پریشانی سے بولے تو حنان فکر مند سا ہو کر ان کی طرف بڑھا، پھر متجسس سے لہجے میں پوچھا۔

''خیریت' آپ پریشان کیوں ہیں انکل......؟''

''وہ...... بیٹا' ابھی کچھ دیر پہلے شہر سے تمہاری ماں کا فون آیا تھا' اس نے بتایا ہے کہ تمہارے والد صاحب کی طبیعت اچانک بہت خراب ہوگئی ہے۔ تمہیں فوراً شہر بلوایا ہے اس نے۔'' اطلاع فراہم کرتے ہوئے وہ خود بہت پریشان لگ رہے تھے۔ حنان نے اسی وقت اپنی واپسی کی تیاری شروع کر دی کہ وہ شروع سے ہی اپنے والد صاحب سے بہت اٹیچ تھا۔ مگر اسے یوں آناً فاناً تیاری پکڑتے دیکھ کر ایمن کے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ پہلو میں دھڑکتا دل ایک



دم سے کتنا ہوا محسوس ہوا مگر وہ چاہ کر بھی جاتے ہوئے اس سے ایک لفظ تک نہ کہہ پائی اور وہ اپنی ڈھیروں یادیں چھوڑ کر جس طرح اچانک ان لوگوں کے گھر آیا تھا' ویسے ہی واپس چلا گیا۔

وہ کیا گیا' ایمن کو لگا جیسے اس کے جینے کا مقصد ہی ختم ہوگیا ہو، ہرا بھرا پھول پودوں سے مہکتا گاؤں ایک دم سے ویران ہوگیا۔ جب تک وہ یہاں تھا، ایمن کو اس کے لیے اپنی روح میں پنپتی اسکی شدید محبت کا احساس ہی نہ ہو سکا اور اب جب کہ وہ چلا گیا تھا تو اس کی ہنستی کھیلتی زندگی، ایک دم سے ٹھہری ہوئی جھیل کی مانند ہوگئی۔ مسکراہٹ لبوں پر کھلنا ہی بھول گئی تھی اور اس کی اسی اداسی کے پیش نظر حفیظ صاحب نے ارادہ نہ ہونے کے باوجود اسے کالج میں آگے پڑھنے کے لیے ایڈمیشن لے دیا۔

پھر جس روز اس نے دوبارہ سے کالج جوائن کیا، مارے خوشی کے پاؤں زمین پر دھرنا ہی بھول گئی۔ بار بار رضیہ بیگم اور حفیظ صاحب کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کے گال چومتے ہوئے وہ خوشی سے بے حال تھی۔ حفیظ صاحب صبح سکول کے لیے نکلتے وقت اسے ساتھ ہی بٹھا لیتے تاہم واپسی کے لیے انہوں نے کالج وین لگوادی تھی، جو گاؤں کی سڑک تک اسے ڈراپ کر کے جاتی۔ پھر سڑک سے گھر تک کا راستہ تو فقط چند ہی قدموں پر محیط تھا، سواسے کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔

کالج میں پھر سے ایڈمیشن کے بعد شروع کے کچھ روز تو اس کے خوب ہی بور گزرے' کیوں کہ ایک تو پڑھائی کا سلسلہ ابھی جاری نہیں ہوا تھا، دوسرا کوئی ایسی دوست بھی نہ رہی تھی کہ جس کے ساتھ گپ شپ میں، وقت گزرنے کا احساس نہ ہوتا۔ اس روز بھی وہ بور سی کالج کے لان میں بیٹھی، تنکوں سے کھیل رہی تھی جب ایک پیاری سی نٹ کھٹ لڑکی بالکل اچانک ہی اس کے پاس آ بیٹھی اور خاصی اپنائیت سے بولی۔

''ہیلو مس' آئی ایم ماہ رخ شاہ' اینڈ یو......؟'' شہادت کی انگلی اٹھا کر اس نے ایمن کی طرف سوالیہ انداز میں اشارہ کیا تو بے ساختہ ہی اس کے منہ سے نکل گیا۔

''ایمن حفیظ۔''

''اچھا نام ہے۔ کون سی کلاس میں ہیں آپ؟''

''تھرڈ ائیر۔'' ایمن نے مختصر جواب پر ہی اکتفا کیا، جب کہ وہ پرجوش لہجے میں خوشی سے بولی۔

''میں بھی اسی کلاس میں پڑھتی ہوں، ابھی کل ہی ایڈمیشن ہوا ہے میرا۔ یہاں کالج میں اور تو کسی سے جان پہچان نہیں' آپ کو یہاں تنہا بیٹھے دیکھا تو ادھر ہی چلی آئی۔ آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا؟'' وہ لڑکی بھی اسی کی طرح بولنے کی بے حد شوقین تھی' ایمن نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تھینک یو' ویسے مجھ میں ہزار خوبیوں کے ساتھ ایک بہت بڑی خامی یہی ہے کہ میں ہر کسی سے فری بہت جلد ہو جاتی ہوں' اور اکثر اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ بائی دا وے' کیا آپ مجھ سے دوستی کرنا پسند کریں گی؟'' یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ بھی آگے بڑھا دیا تو ایمن نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس کا ہاتھ اپنائیت سے تھام لیا کہ ایسے وقت میں ایک دوست کی ضرورت تو بہر حال اسے بھی تھی۔

''تھینکس کہ آپ نے مجھے مایوس نہیں کیا' ویسے انشاء اللہ وقت کے ساتھ ساتھ آپ میری دوستی پر ناز کریں گی۔ بہر حال پہلے جان پہچان کا مرحلہ طے ہو جائے تو میرا نام تو میں آل ریڈی آپ کو بتا چکی ہوں، باقی میرے ڈیڈ، شہر کے بہت بڑے بڑے بزنس مین ہیں۔ پہلے ہم لوگ لاہور میں رہتے تھے مگر اب حال ہی میں یہاں شفٹ ہوئے ہیں، وہ بھی صرف بھیا کی وجہ سے، ان کا لاہور میں دل ہی نہیں لگتا اور بھئی لگے بھی کیوں' ان کی ہونے والی مسز جو یہاں رہتی ہیں، سو ہمیں بھی فورس کر کے یہاں لے آئے۔ ویسے میرے بھیا، پاک بحریہ میں بڑے ڈیشنگ سے کیپٹن ہیں اور صرف چھٹیوں میں ہی گھر آتے ہیں، ان کے جانے کے بعد تو لائف ایک دم بور ہو جاتی ہے۔ خیر، میں اپنی فیملی کا تعارف کرا رہی تھی، تو ڈیڈی کا تو بتا ہی چکی ہوں، مما بھی کم معروف نہیں، بہت بڑی سوشل ورکر ہیں۔ مجھ سے بڑے دو بھائی ہیں اور ایک چھوٹا ہے، بہت ہی تنگ کرتا ہے مجھے' کیا تمہارا بھائی بھی تمہیں پریشان کرتا ہے؟'' اس کے طویل تعارف کی ٹانگ اس سوال پر آ کر ٹوٹی تو وہ جو انہماک سے اسے پٹر پٹر بولتے ہوئے سن رہی تھی، ایک دم سے چونک کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

''میرا کوئی بھائی نہیں ہے، میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہوں۔''

''اوہ' آئی ایم سوری...... بہر حال اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرے بھائی تمہارے بھی تو بھائی ہی ہوئے ناں، اب تم بتاؤ، تمہاری فیملی میں کون کون ہے اور تمہارے پاپا کیا کرتے ہیں؟'' وہ آج ہی جان پہچان کے سارے مرحلے طے کر لینا چاہتی تھی، سو قدرے



شارپ انداز میں بولی تو ایمن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے اپنی فیملی کے بارے میں کیا بتائے؟ ہو سکتا ہے وہ اس کی کلاس کے بارے میں جان کر اس سے دوستی کرے ہی نا، اب کچھ نہ کچھ تو بتانا ہی تھا، سو سنجیدہ لہجے میں بولی۔

''ہمارے گھر میں صرف میں اور میرے امی، ابو ہی رہتے ہیں۔ اماں بھی میری طرح اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں سو نانا نانی کے بعد اب ان کا کوئی نہیں، اور بابا ویسے ہی اپنے امیر رشتہ داروں، بہن بھائیوں سے الگ ہو گئے، سو اپنی چھوٹی سی دنیا ہے اور ہم اسی میں خوش ہیں۔''

''زبردست، الگ تھلگ رہنے کا بھی اپنا ہی مزہ ہے، یہ نہیں کہ ہر وقت گھر میں کھچڑی ہی پکی رہے، جیسا کہ ہمارے گھر میں ہوتا ہے۔ بڑے بھیا تو خیر گھر میں ٹکتے ہی نہیں مگر اس کے باوجود میرا' عدی، نوشی اور مانی کا جو جھگڑا چلتا ہے، اس سے پورا گھر توبہ مانگتا ہے۔ عدی کا تو بتایا ہے ناں میں نے' میرا چھوٹا بھائی ہے، اور نوشی، مانی وغیرہ میرے انکل کے بچے ہیں، چونکہ ہماری جوائنٹ فیملی ہے تو خوب ہی پھڈے بازیاں ہوتی ہیں۔'' اس مختصر سے تعارف پر وہ پھر سے پرجوش ہو کر تالی پیٹتے ہوئے بولی تو ایمن نے سکون کا ٹھنڈا سانس بھرا کہ اس نے اس کی غربت کو خاطر میں نہیں لیا تھا، تب ہی مسکرا کر اسے نان اسٹاپ بولتے ہوئے سنتی رہی۔

اس روز وہ گھر واپس آئی تو رضیہ بیگم سے ماہ رخ کی خوب ہی تعریفیں کیں، پورا دن وہ بس اسی کی باتیں کرتی رہی اور رضیہ بیگم چپ چاپ اسے یوں مسرور سا دیکھتی رہیں کہ بالآخر ان کی لاڈلی بیٹی نے گم سم تو رہنا چھوڑا۔



''ایمن' پرسوں ہمارے گھر میں میلاد ہے' کیا تم آ سکو گی؟'' کافی دن کے بعد جب ان کی دوستی خوب مضبوط ہو گئی تو ایک روز ماہ رخ نے اس سے پوچھا اور جواب میں وہ مایوسی سے سر نفی میں ہلا کر رہ گئی۔

''کیوں...... کیوں نہیں آؤ گی تم......؟ تم میری دوست ہو یار اور میں بڑے مان سے تمہیں انوائیٹ کر رہی ہوں۔'' ماہ رخ کو اس کے انکار سے اچھا خاصا دھچکا لگا تھا مگر ایمن جانتی تھی کہ اسے گھر سے کبھی ایسی کوئی پرمیشن نہیں ملے گی تب ہی معذرتی انداز میں بولی۔

''آئی ایم سوری ماہ رخ' میں تمہیں ہرٹ کرنا نہیں چاہتی مگر میں جانتی ہوں،

میرے بابا کبھی مجھے کالج سے کہیں اور جانے کی پرمیشن نہیں دیں گے اس لیے پلیز، اب اس ٹاپک پر مزید بحث مت کرو۔''

ماہ رخ اس کی عزیز ترین دوست بن چکی تھی، وہ قطعی اسے دکھ پہنچانا نہیں چاہتی تھی مگر اپنے گھر والوں کی عادت کا بھی اسے بخوبی پتہ تھا، سوانکار کرنا پڑا۔

''اٹس او کے، لیکن اگر میں انکل سے بات کروں اور وہ مان جائیں تو پھر......؟''

''پھر مجھے تمہارے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہیں۔'' ماہ رخ کے امید افزا جملے پر اس نے کہا اور اپنی کتابیں سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی کہ اگلے پریڈ کا ٹائم ہو چکا تھا۔

اگلے روز ماہ رخ چھٹی کے بعد وین میں بیٹھ کر اس کے ساتھ ہی اس کے گھر چلی آئی اور پورا دن وہیں گزارا۔ شام کو حفیظ صاحب سے ایمن کے سلسلے میں کچھ اس سلیقے سے بات کی کہ وہ نہ صرف اسے میلاد کے لیے پرمیشن دینے پر رضا مند ہو گئے بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ اگر کسی روز وین لیٹ ہو جائے یا نہ آئے تو وہ ماہ رخ کے ساتھ اس کے گھر جا سکتی ہے۔

ایمن تو خوشی سے نہال ہو گئی تھی، خود ماہ رخ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بار بار حفیظ صاحب اور رضیہ بیگم کے ہاتھ تھام کر وہ نہایت عقیدت سے ان کا شکریہ ادا کرتی اور انہیں بھی لازمی اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی۔ پھر شام کے کھانے کے بعد حفیظ صاحب اسے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ شہر جانے والی بس پر بٹھا آئے۔

وہ گھر واپس آئے تو ان کی زبان ماہ رخ کی تعریفیں کرتی نہ تھک رہی تھی۔ خود رضیہ بیگم کو بھی وہ بے حد اچھی لگی تھی اور انہوں نے دل ہی دل میں سوچا تھا کہ کاش ان کے کوئی بیٹا ہوتا تو وہ ضرور اسے ہی اپنی بہو بناتیں۔

اگلے روز ایمن کالج سے چھٹی کے بعد ماہ رخ کے ساتھ ہی ان کے گھر چلی آئی۔ محل جیسا شان دار گھر، دور سے ہی اپنی قیمت اور خوب صورتی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ایمن تو گھر کی شان و شوکت دیکھ کر ہی ماہ رخ سے بری طرح متاثر ہو گئی۔ پھر اندر سے تو اس کی خوب صورتی اور بھی دوبالا تھی۔

وہ لوگ طویل راہداری سے گزر کر جونہی وسیع لاؤنج میں پہنچے، قہقہوں اور شور وغل کے ایک بڑے طوفان نے ان کا سامنا کیا۔ لاؤنج کے بیچ و بیچ، نجانے کون کون سی نسل کی قومیں بیٹھی تھیں اور اپنی موج مستیوں میں بری طرح گم تھیں۔ ایمن تو وہیں دروازے کے



درمیان کھڑی رہی جب کہ ماہ رخ، بیگ قریبی صوفے پر پھینک کر تیزی سے آگے بڑھی اور ''اذان بھائی'' پکارتے ہوئے ایک ہینڈسم سے لڑکے کے گلے لگ گئی۔

''آپ نے بتایا کیوں نہیں کہ آپ آج یہاں تشریف لانے والے ہیں، میں کالج سے چھٹی کر لیتی۔'' وہ اب بڑے ناز سے اٹھلا کر اسی نوجوان سے کہہ رہی تھی اور جواب میں وہ اسے ساتھ لگائے بڑی محبت پاش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''ہاں، تمہاری جیسی بھتنی کو انفارم کر دیتے تاکہ بعد میں تم چھٹی کر کے ہمارا جینا دوبھر کر دیتیں۔'' قریب ہی کھڑا کوئی لڑکا عجیب دل جلے انداز میں بولا تھا اور اس کے ساتھ ہی پورا لاؤنج قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ایمن اس وقت وہاں الگ تھلگ کھڑی خود کو بڑا چغد سا محسوس کر رہی تھی، تب ہی ایک نازک سی لڑکی کی نظر اس پر پڑی اور اس نے ماہ رخ سے سوال کیا۔

''ماہ، یہ محترمہ کون ہیں بھئی؟ بیچاری کب سے وہاں اکیلی کھڑی ہیں.....'' انداز ایسا تھا کہ ایمن کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا۔ تاہم ماہ رخ، بے حد ندامت کا اظہار کرتی اس کے قریب آئی، پھر اس کا ہاتھ تھام کر ان لوگوں کے قریب لاتے ہوئے بولی۔

''میڈم! یہ میری بے حد عزیز فاسٹ فرینڈ ایمن ہے، جس کا میں تم لوگوں سے ذکر کرتی ہوں اور یہ یہاں میرے ساتھ آج محفلِ میلاد میں شمولیت کے لیے آئی ہیں، کیوں ہو گئی تسلی......؟'' قدرے کٹیلے انداز میں وہ اس لڑکی سے مخاطب ہوئی تھی، پھر اسے خاموش کروا کے، رخ ایمن کی طرف پھیرتے ہوئے معذرتی انداز میں بولی۔

''آئی ایم ریئلی سوری ایمن، ایکچولی اذان بھیا کی اچانک آمد پر مارے خوشی کے مجھے تمہارا دھیان ہی نہیں رہا۔ بہر حال یہ سب لوگ تو میری زبانی، تمہارا ذکر سن سن کر تم سے بخوبی واقف ہیں، البتہ تم انہیں جان لو، اذان بھیا کا ذکر تو میں تم سے کر ہی چکی ہوں، باقی یہ عدی ہے، یعنی عدنان، میرا سب سے چھوٹا بھائی اور یہ آفت کی پرکالہ محترمہ نوشی صاحبہ، یعنی نوشین، نوشی ہم پیار سے کہتے ہیں اور یہ ہمارے عمان صاحب ہیں، اس گھر کے سب سے چالاک اور سیاسی انسان، جنہیں ہم پیار سے مانی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔'' خاصے کھلنڈرے انداز میں وہاں موجود کچھ لوگوں کا تعارف کرا کے وہ دھیمے سے مسکرائی تو ایمن کو بھی لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیلا کر سب سے ہیلو ہائے کرنی پڑی۔

''ایکسکیوزمی، کیا ہم آپ کو پیار سے ایمی کہہ سکتے ہیں؟'' وہاں موجود ایک لڑکے

نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے قدرے شوخ انداز میں کہا تو کچھ دبی دبی ہنسی کی آوازوں نے بخوبی اس کا ساتھ دیا۔ ایمن نے بے حد کنفیوز ہو کر ماہ رخ کی طرف دیکھا جو خود بھی مسکرا کے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''میرا خیال ایمن تمہیں' اگر ان لوگوں کا ہنسی مذاق برا لگا ہے تو ان کی طرف سے میں تم سے ایکسکیوز کرتی ہوں، اصل میں ہماری تو ہر وقت جوک کرنے کی عادت سی بن گئی ہے۔ شاید اسی لیے، یہ تمہیں اپنا سمجھتے ہوئے تمہارے ساتھ ایسے پیش آئے۔ بہر حال تمہیں برا لگا ہو تو پلیز ان کی طرف سے میں تم سے معذرت چاہتی ہوں۔ آئی ایم ریئلی سوری۔'' وہ فوراً ہی منت سماجت پر اتر آئی تو ایمن نے قدرے شرمندہ ہو کر اپنائیت سے اس کے ہاتھ تھام لیے' پھر دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''اٹس او کے ماہ رخ' میں تم سے ناراض تو نہیں ہوں۔''

''تھینک یو' تھینک یو سو مچ' چلو آؤ میں تمہیں اپنا کمرہ دکھاؤں۔'' وہ فوراً ہی بات سمیٹ کر سرشار لہجے میں بولی تو ایمن نے بھی اس کا ہاتھ تھام کر قدم اس کی ہمراہی میں آگے بڑھا دیئے۔ تاہم اذان کی سنجیدہ نگاہوں نے دیر تک اس سادہ سی مگر بے حد پرکشش لڑکی کا پیچھا کیا۔ وہ لڑکیوں پر لٹ مرنے والا نوجوان نہیں تھا مگر اس لڑکی میں ضرور ایسی کوئی بات تھی کہ جو اسے چونکا گئی تھی۔

محفل میلاد کا آغاز ہوا تو بے اختیار ہی اس کی نگاہیں اس کے سادہ سے سراپے کی تلاش میں بھٹک گئیں جو عورتوں کے درمیان کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ دل کے ہاتھوں بے حد مجبور ہو کر وہ ماہ رخ کے کمرے کی طرف چلا آیا کہ جہاں اس کی موجودگی کے ففٹی پرسنٹ چانسز موجود تھے۔

وہ کمرے کی دہلیز پر پہنچا تو اندر سے ایمن کی انتہائی افسردہ سی ابھرتی آواز نے اس کے قدم وہیں روک دیئے، جو نجانے ماہ رخ کے کس سوال کے جواب میں اداسی سے کہہ رہی تھی۔

''ہاں ماہ رخ، میرے اندر بھی تمہارے ہی جیسی انتہائی بولڈ اور نٹ کھٹ سی لڑکی رہتی تھی، میری زبان بھی اتنی ہی تیزی سے فراٹے بھرتی تھی، میں بھی طنزیہ سے طنزیہ بات کو چٹکیوں میں اڑانے کا فن رکھتی تھی، مگر وہ سب میرا ماضی تھا ماہ رخ' اور یہ جو تم اس ایمن کو دیکھ رہی ہو، یہ میرا حال ہے، ہو سکتا ہے کسی کی محبت، مجھے میرا ماضی لوٹا دے، مگر فی الحال تو میں اداسیوں میں قید ہوں اور جانے کب تک یونہی قید رہنا ہے مجھے......'' وہ بھرپور مایوس لہجے میں



بول رہی تھی اور اذان کا دل جیسے سکڑتا جا رہا تھا۔ کیا ہوا ہو گا اس لڑکی کی زندگی میں کہ جس نے اسے ہنسنا ہی بھلا دیا۔ کسی بھی شخص کے لیے بھلا خود کو یکسر بدل لینا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے؟ جس طرح آئینہ ٹوٹ کر دوبارہ جڑنے کی کوشش میں ہزاروں دراڑیں سمیٹ لاتا ہے، بالکل ویسے ہی جب کسی دکھ میں کسی انسان کی شخصیت ٹوٹ کر دوبارہ تشکیل پاتی ہے تو اس کے اندر بھی ہزار دراڑیں رہ جاتی ہیں، جو لمحہ بہ لمحہ اسے اذیت دیتی رہتی ہیں۔

''کیا میں اس موم کی گڑیا کو اس کا ماضی لوٹا سکوں گا؟'' یہ سوال وہیں دروازے کے باہر کھڑے اس کے اندر گونجا تھا اور وہ ''ہاں'' یا ''ناں'' کی کشمکش میں الجھا وہیں سے واپس پلٹ آیا۔

''چلو ایمن' باہر میلاد شروع ہو چکا ہے تم نعت پڑھو گی ناں؟'' وہ منہ ہاتھ دھو کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بال سمیٹ رہی تھی، جب ماہ رخ نے لاڈ سے ایمن سے کہا اور جواب میں اس نے دوپٹہ سلیقے سے سر پر جماتے ہوئے آہستہ سے سر اثبات میں ہلا دیا۔ پھر محفل میں جب اس کی نعت پڑھنے کی باری آئی تو اس کی روح تک میں ایک عجیب سا سرور اتر گیا اور وہ مدھر آواز میں پڑھنے لگی۔

''تجھ پر میں لاکھ جان سے قربان یارسول ﷺ
بر آئیں میرے دل کے بھی ارمان یارسول ﷺ

اس کی مترنم آواز جونہی بلند ہوئی، ماحول میں یکدم سے خاموشی چھا گئی۔ وہاں موجود سبھی امیر خواتین خاصے انہماک سے اسے نعت پڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھیں جو سفید لباس میں ماہ رخ کے پہلو میں بیٹھی، نہایت دھیمے مگر پرجوش سروں میں حبیب خدا کی مدحت بیان کر رہی تھی۔

'' دنیا سے اور کچھ نہیں مطلوب ہے مجھے
لے جاؤں اپنے ساتھ میں ایمان یارسول ﷺ

وہ جو بڑی عجلت میں اندر آیا تھا، ایک دم آواز پر ٹھٹک کر رک گیا۔ پھر نظر جونہی اس صبیح چہرے پر پڑی، وہ گم سم سا دیوانہ وار، اس کی لرزتی ہوئی پلکوں اور شفاف چہرے پر بکھرے نور کے ہالوں کو دیکھتا رہ گیا۔ یہ لڑکی تو اسے اپنے گھر پہلی آمد پر ہی اچھی لگی تھی، پھر اس وقت تو اس کا پرنور حسن واقعی دیکھنے لائق تھا۔ اس روز فقط چند ہی لمحوں میں اس نے اپنی زندگی کا وہ بڑا فیصلہ کر لیا، جو وہ پچھلے تین سالوں سے کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اس وقت وہ قطعی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے ایمن حفیظ سے محبت ہو گئی ہے یا اس کا عشق وارد ہو گیا ہے اس

کے دل پر' مگر ہاں' وہ اسے اچھی ضرور لگی تھی۔ اتنی اچھی کہ اس نے فقط چند ہی لمحوں میں اسے اپنا ہم سفر بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

'' اس شوق میں کہ آپ کے دامن سے جا ملے
میں چاک کر رہا ہوں گریبان یارسول ﷺ

اپنی مسحور کن آواز میں ہولے ہولے لرزتے ہوئے جسم اور بھیگی پلکوں کے ساتھ مدحتِ مصطفیٰ ﷺ میں پوری طرح گم، وہ اسے دھیرے دھیرے اپنے دل کے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوئی، تب ہی وہ مطمئن سا وہاں سے باہر چلا آیا۔

پھر اس نے اپنے جہاز پر واپس جانے سے قبل زرینہ بیگم اور ماہ رخ کو اپنے حتمی فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ ساتھ ہی یہ ریکوئسٹ بھی کر دی کہ وہ سعدیہ شیرازی کے گھر والوں سے معذرت کر لیں۔

زرینہ بیگم کی چونکہ جان تھی اس میں، پھر وہ ویسے بھی اولاد کے معاملے میں بہت نرم مزاج خاتون تھیں، سو انہوں نے بنا کچھ بھی کہے، خاموشی سے سعدیہ شیرازی، جو کہ اذان کی سابقہ منگیتر تھی، کے گھر والوں سے نہایت شائستگی کے ساتھ معذرت کر لی اور اگلے ہی سنڈے کو ماہ رخ کے ساتھ ایمن کے گاؤں روانہ ہو گئیں۔

پھر جب دروازے کھلنے پر انہوں نے حفیظ صاحب کا چہرہ دیکھا تو خوشی حیرت کے خوش گوار احساس سے مغلوب، وہ گنگ ہی رہ گئیں۔ حفیظ صاحب ان کے سگے چچازاد تھے مگر شادی کے بعد کچھ ایسے غائب ہوئے کہ پھر دکھائی ہی نہ دیئے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد شہزاد صاحب اپنے بیوی اور بچے کے ساتھ شہر آ گئے اور یوں وہ شہر کی ہی ہو رہیں۔ حفیظ صاحب کب گاؤں میں آئے اور بیس سال تک کس حال میں رہے انہیں کچھ خبر نہ ہو سکی۔ البتہ آج بیس سال کے بعد اپنے اکلوتے چچازاد بھائی کو دیکھ کر وہ واقعی خوشی سے بے قابو ہوئی تھیں۔ خود حفیظ صاحب بھیگی ہوئی آنکھوں سے، انہیں اتنے سالوں کے بعد دیکھ رہے تھے جنہوں نے بیٹے کو تو ملنے کے لیے بھیج دیا تھا مگر خود نہیں آئی تھیں۔ اب انہیں کیسے معلوم ہوتا کہ حنان تو انہیں بتا کر ہی نہیں آیا تھا۔ انہیں ہی کیا، وہ تو کسی کو بھی بتا کر نہیں آیا تھا، ماسوائے شہزاد صاحب کے، اور انہیں بھی اس نے اصل بات نہیں بتائی تھی، صرف یہی کہا تھا کہ ایک دوست کے پاس جا رہا ہوں، کالج کے زمانے کا بہت اچھا دوست ہے میرا' اور وہ بھلا



کہاں کہیں جانے سے روکتے تھے اسے، سو خوشی خوشی اجازت دے دی، مگر اس وعدے پر کہ وہ وہاں جاتے ہیں اپنا ایڈریس اور نزدیکی فون نمبر ضرور لکھ بھیجے تاکہ وہ اس سے وقت بوقت رابطہ کر سکیں اور حنان نے ان کے اس حکم کی تعمیل وکیل صاحب کے گھر کا فون نمبر، رضیہ بیگم سے لے کر انہوں ارسال کر دیا تھا۔

طویل عرصے کے بعد حفیظ صاحب اور زرینہ بیگم کے مابین تمام گلے شکوؤں کا میل دھلا تو ہر طرف گویا جلترنگ سے بج اٹھے۔ ماہ رخ کو جونہی پتہ چلا کہ ایمن اس کی کزن ہے، وہ تو خوشی سے گویا پاگل ہی ہو گئی۔ خود ایمن کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا مگر جب اسے زرینہ بیگم کی آمد کا اصل مقصد پتہ چلا تو اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔ دل کے اندر کسی کو یاد کر کے، درد کی ایک شدید لہر اٹھی اور وہ سسک کر رہ گئی۔ کوئی نہیں تھا کہ جس سے وہ اپنے دل کا درد بیان کرتی' جس کو بتاتی کہ اسے حنان احمد رؤف سے بے پناہ محبت ہے' وہ زندگی کے طویل سفر میں صرف اسی کا دائمی ساتھ چاہتی ہے، اپنی زندگی کے ہر لمحے میں صرف اسی کا انتظار کرتی ہے۔ کسی سے بھی تو نہ کہہ سکی وہ یہ سب' اور اس کی زندگی کا فیصلہ ہو گیا۔ مارے خوشی کے حفیظ صاحب کے پاؤں تو زمین پر ہی نہیں ٹک رہے تھے کہ انہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے پیچس محل سے گھر اور شہزادے جیسے لڑکے کا خواب دیکھا تھا۔ آج اللہ پاک کے کرم سے ان کا یہ خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔ رضیہ بیگم بھی اپنی لاڈلی بیٹی کے محفوظ مستقبل پر دل سے خوش تھیں۔ صرف وہی کیا' زرینہ بیگم' ماہ رخ، سب لوگ ہی خوش تھے۔ بس ایک اس کی آنکھوں میں ہی ساون جھڑی لگ گئی تھی اور دل کے اندر خزاں رُت آ کھڑی تھی۔



یہ بات سب کو بتانا بہت ہی مشکل ہے
کہ تیرا لوٹ کے آنا بہت ہی مشکل ہے
بتا نہ پاؤں گی شاید کبھی بھی میں اُس کو
کہ اُس کو دل سے بھلانا بہت ہی مشکل ہے
خوشی میں کھیلنے والے کو کیا خبر اس کے
غموں کا بوجھ اٹھانا بہت ہی مشکل ہے
اَنا بھی تن کے کھڑی درمیان میں ہوتی ہے

گئے ہوؤں کو منانا بہت ہی مشکل ہے
میں تیری راہ میں صدیوں کھڑی رہوں گی مگر
صدائیں دے کے بلانا بہت ہی مشکل ہے
یہ جس مقام پہ لایا ہے آج عشق' مجھے
یہاں سے لوٹ کے جانا بہت ہی مشکل ہے

کرن رباب نقوی کی ''روگ جو ٹھہرا'' اس کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ اب اس کے اس انمول گفٹ اور حسین یادوں کے سوا اس کے پاس رہ بھی کیا گیا تھا؟ حفیظ صاحب نے اس کے تھرڈ ائیر کے امتحان کے فوراً بعد اس کے شادی کے دن رکھ دیئے اور وہ اپنی تقدیر کے اس فیصلے پر پنجرے میں قید' بے بس پنچھی کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

یہ وہ لڑکی تھی، جسے ہر خوب صورت لڑکا اپنا ہیرو لگتا تھا مگر آج حالات ایسے دوراہے پر لے آئے تھے کہ بنا مانگے ہی اسے ایک امیر کبیر' پڑھا لکھا، ہینڈسم سا لڑکا مل رہا تھا مگر وہ بری طرح رو رہی تھی۔

اس نے ایک مرتبہ پنکی سے کہا تھا کہ اگر اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوگئی تو شاید وہ تو مر ہی جائے گی، مگر آج ایسا ہی ہو رہا تھا اور وہ کچھ نہ کر پا رہی تھی۔ حنان کی محبت ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی جا رہی تھی اور وہ بن پانی کی مچھلی کی مانند، تڑپتی، جلد سے جلد اس کی واپسی کی منتظر تھی۔ جو پچھلے ایک سال سے شہزاد رؤف صاحب کے ہمراہ نیو پارک میں سیٹل تھا اور اس نے وہیں سے اذان کو اس کی منگنی پر مبارک باد کے ڈھیروں پیغام بھیجے تھے۔

تقدیر بھی کتنا عجیب کھیل' کھیل رہی تھی ان کے ساتھ، وہ ابھی تک یہی سوچ رہا تھا کہ زرینہ بیگم کو ایمن کے لیے کیسے راضی کرے کیوں کہ اس کے مطابق انہیں اپنے غریب رشتہ داروں سے کوئی مطلب نہیں تھا اور ادھر ایمن یہ سوچ سوچ کر رو رہی تھی کہ وہ اس کے پیار کو سمجھ کیوں نہ سکا؟ کیوں قدر نہیں کی اس کی محبت کی اور سب کچھ جانتے بوجھتے بھی کوئی ایکشن لیے بنا ان دونوں کی منگنی کو مبارک باد دے دی۔

''تو کیا واقعی تمہیں مجھ سے پیار نہیں تھا حنان؟'' بے حد دکھ سے اس نے سوچا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

ان کے تھرڈ ائیر کے پیپرز تیزی سے قریب آ رہے تھے اور ہر گزرتے دن



کے ساتھ ایمن کی امید بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے ہر پل ہر لمحے حنان کی واپسی کا انتظار تھا۔ مگر اس کا یہ انتظار، انتظار ہی بن کر رہ گیا اور وہ ایگزیم دے کر فارغ بھی ہوگئی۔ رضیہ بیگم تو بات طے ہوتے ہی اس کے جہیز کی رہی سہی تیاری میں بری طرح مصروف ہوگئی تھیں مگر وہ کسی کام میں ان کا ہاتھ نہ بٹاتی کہ جب دل ہی راضی نہیں تھا تو وہ ان خوشیوں کو کیسے مناتی؟

ماہ رخ کے روز چکر لگتے اور وہ اسے ساتھ لے جا کر زبردستی شاپنگ کرواتی، زرینہ بیگم نے آہستہ آہستہ حفیظ صاحب کو قائل کر لیا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر شہر ہی آ جائیں کیوں کہ ایمن کے بیاہ کے بعد تو ویسے بھی ان کا کوئی نہیں تھا گاؤں میں۔ پھر ان کی جاب بھی تو شہر میں ہی تھی لہٰذا ان کے اصرار پر حفیظ صاحب نے اپنا گھر اور زمین دونوں فروخت کر ڈالیں، تو اس صدمے سے ایمن بیمار پڑ گئی۔ وہ گھر جہاں وہ بچپن سے پلی بڑھی تھی، سکھ چین کا وہ درخت، جس سے وہ اپنا ہر راز شیئر کرتی تھی اور اس کے قریب ہی لگی گلاب اور موتیا کی باڑ، جہاں وہ اور پنکی گھنٹوں باتیں کرتے تھے' پھر وہ ہینڈ پمپ، جو اس کے دل میں حنان کی محبت کا احساس جگاتا تھا، ایک گہرا درد بن کر رہ گئے تھے۔



شام کو ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہوائیں ماحول کو عجیب پرسکون سا بنا رہی تھیں۔ اس کا بخار ٹوٹ چکا تھا مگر کمزوری ابھی باقی تھیں۔ حفیظ صاحب آج کل شہر میں کسی اچھے سے مکان کی تلاش میں مصروف رہتے تھے، تب ہی دیر سے گھر آتے اور وہ سارا سارا دن نڈھال سی چارپائی پر پڑی رہتی۔ اس وقت بھی گلاب اور موتیا کے کنج کے پاس چارپائی ڈالے وہ اپنے پچھلے دنوں کی حسین مگر اداس یادوں میں گم تھی، جب مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد رضیہ بیگم اس کے قریب چلی آئیں، پھر چارپائی پر اس کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے محبت بھرے نرم لہجے میں بولیں۔

''ایمن! نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے بیٹے' چلو اٹھو جلدی سے نماز ادا کرو۔''

وہ کبھی بھی اس پر یہ ظاہر کر کے کہ انہیں اس کے کھوئے کھوئے، بے چین رہنے کی اصل وجہ معلوم ہے' اسے مزید شہ نہیں دینا چاہتی تھیں۔ تب ہی یہ لاپرواانداز اپنا رکھا تھا۔ ورنہ ایک ماں تو اپنی اولاد کی آنکھیں پڑھ کر اس کے دل کا حال جان جایا کرتی ہے، تو پھر وہ کیسے حقیقت سے بے خبر رہ سکتی تھیں۔ مگر انہیں ہر حال میں اپنی بیٹی کی بھلائی عزیز تھی وہ اس کی وقتی محبت کے جذبات میں، اس کے مستقبل کو داؤ پر نہیں لگا سکتی تھیں، پھر انہیں اذان بھی حنان کے

مقابلے میں از حد عزیز تھا کیوں کہ وہ ان کا اپنا خون تھا جب کہ حنان یتیم خانے سے اڈاپٹ کیا ہوا لاوارث لڑکا تھا، جس کے خون کے بارے میں کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی تھی کہ وہ کیسا تھا؟

اذان سے ایمن کا ملاپ نہ بھی ہوتا، تب بھی وہ کسی قیمت پر اپنی اکلوتی بیٹی کو اس کے سپرد نہ کرتیں کہ وہ خاندانی خون پر گہرا اعتماد رکھنے والی خاتون تھیں، تب ہی تو حنان ہزار کوشش کے بعد بھی ان کا دل نہ جیت سکا تھا۔ پھر وہ نماز کے معاملے میں بھی شروع ہی سے بہت سخت تھیں لہٰذا اس وقت بھی اسے کمزوری کے باوجود نماز پڑھنے کی تلقین کی تو ایمن نے بیزاری سے انہیں دیکھا، پھر قدرے سست لہجے میں بولی۔

''امی میری ہمت نہیں ہو رہی، عشاء میں قضا ادا کرلوں گی۔''

''خبردار جو آئندہ ایسے کہا تو' تیرے دل کی مرضی، خدا کے حکم اور خوشی سے بڑھ کر ہے......؟ ارے بے وقوف، یہ تیری نہیں شیطان کی کوشش ہے، جو تجھے اللہ کی محبت سے غافل کر دینا چاہتا ہے۔ عقل کے ناخن لے اور خدا سے اپنی محبت کے تعلق کو مضبوط بنائے رکھ' کیوں کہ اسی میں تیری اور تیرے ماں باپ کی بھلائی ہے' چل اب اٹھ اور فوراً وضو کر کے نماز ادا کر۔'' اسے سختی سے ڈپٹ کر وہ وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئیں تو ایمن بے دلی سے اٹھ کر' وضو کرنے چل دی۔ پھر جب وضو کر کے مصلے پر آ کھڑی ہوئی تو جانے کب سے رکے گرم سیال نگینے رخساروں پر پھوٹ پڑے اور وہ خدا سے گڑگڑا کر اپنے دل کے سکون کی دعا مانگتی رہی، نماز قضا کرنے کے' اپنے تھوڑی دیر پہلے کے ارادے پر توبہ استغفار کرتی رہی۔ پھر نماز کی ادائیگی کے بعد جونہی اس نے دعا' کے لیے ہاتھ پھیلائے، حنان کے ساتھ کی دعا، کسک بن کر دل سے نکلی اور وہ دربارِ الٰہی میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پھر جب دعا ختم کر کے اس نے مصلےٰ سمیٹا تو واقعی اس کی روح پر چھایا دکھ اور بیزاری کا غبار قطعی طور پر چھٹ چکا تھا اور وہ ایک دم سے ہلکی پھلکی سی ہوگئی تھی۔

پھر اگلے کچھ ہی روز میں وہ گاؤں سے شہر شفٹ ہوگئے۔ آتے وقت ایمن اپنے گھر کی ایک ایک چیز سے لپٹ کر خوب روئی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ گاؤں چھوڑنے سے قبل وہ ایک بار پنکی سے ضرور مل لیتی مگر وہ سسرال گئی تھی لہٰذا اس کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہوسکی اور وہ اپنے آدھے دکھ وہیں گاؤں کے اندر اپنے گھر کی دیواروں میں دفن کر کے بقیہ آدھے دکھ اپنے دل میں لیے ہمیشہ کے لیے شہر چلی آئی۔



وقت کا کام گزرنا ہے تو یہ گزرتا رہتا ہے مگر انسان امید کی ڈوریوں میں بندھا ہر لمحے کڑھتا رہ جاتا ہے، کچھ ایسا ہی حال ان دنوں ایمن کا تھا، ہر آہٹ، ہر دستک پر چونک جاتی مگر ایک وہ صورت دکھائی نہ دیتی کہ جو دل کے اندر نجانے کب کس لمحے جم گئی تھی۔

پھر وہ دن بھی آ گیا کہ جب اس کا امید سے بندھا ہر تصور' ہر خیال کانچ کے کسی کھلونے کی مانند ٹوٹ گیا اور وہ خالی خالی سے لٹے پٹے دل کے ساتھ مایوں بیٹھ گئی، کوئی اس وقت' اس کے دل سے پوچھتا کہ زندہ رہ کر مر جانا کیا ہوتا ہے؟ کسی کو پا کر کھو دینے کا درد کیسا ہوتا ہے؟

رضیہ بیگم کی آنکھیں بار بار اکلوتی بیٹی کی جدائی پر بھیگ بھیگ جاتیں مگر قدرت کے دستور کو بدلنا ان کے بس میں کہاں تھا؟ سو دل کو سمجھا کر رہ جاتیں۔ پھر جب وہ مایوں بیٹھی تو ان کا خود پر ضبط قائم نہ رہ سکا اور وہ اسے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

''اماں! ایک بات کہوں آپ سے؟'' ان کے محبت بھرے والہانہ انداز پر وہ دل کا دکھ ان سے شیئر کرنے کی ہمت کر بیٹھی، تب ہی دھیمے لہجے میں پوچھا۔ جواب میں رضیہ بیگم' آنسو پونچھ کر استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''ماں! کیا میری شادی اذان کی بجائے حنان سے نہیں ہوسکتی؟'' مشکل سے ہی سہی مگر اس نے دل کی بات ان پر عیاں کر دی تھی جسے سن کر رضیہ بیگم کا رنگ ایک پل میں متغیر ہوگیا۔

''نہیں۔'' نہایت ٹھوس لہجے میں انہوں نے جواب دیا۔

''مم......مگر کیوں اماں' حنان بھی تو زرینہ پھوپھو کا ہی بیٹا ہے، پھر اس سے میری شادی کیوں نہیں ہوسکتی؟'' وہ صدمے کی شدت سے چلائی مگر رضیہ بیگم نے مطلق پروا نہ کی اور اسی انداز میں بولیں۔

''کیوں کہ میں ایسا نہیں چاہتی۔''

''مم......مگر کیوں' کیوں نہیں چاہتیں آپ؟'' وہ بری طرح روہانسی ہوگئی تھی۔

رضیہ بیگم کا چہرہ ایک دم سپاٹ ہوگیا۔

''کیوں کہ وہ تمہاری زرینہ پھوپھو کا سگا بیٹا نہیں ہے' ساری عمر یورپی ملکوں کی خاک چھانی ہے اس نے' تم کیا سمجھتی ہو وہاں انگریزوں کے بیچ رہ کر وہ شریف رہا ہوگا؟ پھر اسے اگر تم سے محبت ہوتی یا تمہاری ذرا سی بھی پروا ہوتی تو وہ یوں بیگانہ بن کر نہ بیٹھا رہتا وہاں' فوراً آ کر زرینہ سے بات کرتا اور تمہیں اپنا لیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ اسے تمہاری

کوئی پروا نہیں ہے' وہ پھول پھول منڈلانے والا بھنورا ہے' تمہاری طرح بے وقوف نہیں جو جان کو روگ لگا کر بیٹھ جائے۔'' رضیہ بیگم کے لہجے میں کڑوا سچ تھا، ایمن چپ کی چپ رہ گئی۔

ساری بات تو اسی ایک مدعا پر آخر ختم ہو جاتی تھی پھر وہ کسی سے کیا گلہ کرتی؟

محبت کوئی زبردستی کا سودا تھوڑی ہوتا ہے کہ جسے ہم دل سے چاہیں اسے زبردستی اپنا بھی لیں' یہ تو دلوں کے معاملے ہوتے ہیں' جذبات اور احساسات کی کہانی ہوتی ہے' پھر بھلا وہ کیا کرتی؟

اذان اس کے ساتھ رشتہ جڑ جانے پر بے حد مسرور تھا۔ بہانے بہانے سے گھر آتا' اس کی راہ روکنے کی کوشش کرتا یا پھر ٹیلی فون کھڑکا دیتا' حالانکہ جن دنوں ڈیوٹی پر ہوتا، ان دنوں میں بھی وہ اسے چین لینے نہ دیتا اور اس کی یہ پرخلوص دیوانگی قطعی اس قابل نہیں تھی کہ اسے دکھ پہنچایا جاتا' تبھی وہ جو اس سے صاف صاف بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، ہمیشہ اسے روبرو پا کر چپ کی چپ رہ جاتی۔

نکاح نامے پر دستخط کرتے ہوئے اس کے ہاتھ بری طرح کانپے تھے' تڑپ کر اس نے آخری امید بھری نظروں سے رضیہ بیگم کی طرف دیکھا تھا مگر وہاں ان کی آنکھوں میں صرف اور صرف اذان کو اپنانے کی تنبیہ تھی، تب بری طرح بلکتے ہوئے اس نے اپنا آپ اذان رؤف کے نام لکھ دیا۔

دل سینے کی دیواروں سے دھاڑیں مار مار کر رویا تھا، آنکھیں یوں سلگ رہی تھیں گویا ریت بھر آئی ہو ان میں اور وہ کہ جس نے اپنا ایک ایک لمحہ حنان احمد کے نام لکھ چھوڑا تھا' آج فقط کچھ ہی لمحوں میں اس کی پوری کی پوری ذات اذان احمد کے نام ہو گئی اور وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔

اذان تو اذان' ماہ رخ کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ ہاں اگر کسی کی دنیا لٹی تھی تو وہ حنان احمد تھا' جو ابھی صرف چند گھنٹے قبل ہی نیویارک سے پاکستان پہنچا تھا' اپنے بھائی کی خوشیوں میں شریک ہونے مگر اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بھائی کی خوشیاں شیئر کرتے کرتے وہ خود دکھوں کی گہری دلدل میں اتر جائے گا۔

کس قدر شاک لگا تھا اسے یہ خبر سن کر کہ اذان احمد رؤف کی شادی سعدیہ شیرازی سے نہیں بلکہ خود اس کی اپنی محبت ایمن حفیظ سے ہوئی ہے۔ اس نے تو تصور میں بھی یہ نہیں سوچا تھا مگر کاتب تقدیر نے حقیقت میں یہ سب کر دیا۔ وہ جان ہی نہ سکا کہ محبت کا بھی ایک موسم ہوتا ہے جو آ کر گزر جائے تو دل ہمیشہ کے لیے ویران رہ جاتے ہیں تقدیر اس کے ساتھ



اتنا بھیانک مذاق بھی کر سکتی ہے، اسے آج سے پہلے اس کا گمان تک بھی نہ تھا۔

'' حنان بھائی! آپ کو ایمن بھابھی کیسی لگیں؟''

وہ گم سم سا سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا' جب ماہ رخ اس کے پاس آ کر کھنکتے ہوئے لہجے میں بولی۔ جواب میں وہ یوں چونکا جیسے کسی نے خواب سے جگایا ہو' تب ہی منہ سے بے ساختہ پھسل گیا۔

''بہت پیاری۔'' اور اس کے اس مختصر سے کمنٹس پر ماہ رخ کھل کھلا کر ہنسی تھی۔

'' دیکھ لیجئے میری پسند ہے۔ میں ہی اسے فرسٹ ٹائم یہاں اس گھر میں لائی تھی اور وہ سب کو پسند آ گئی۔'' وہ چہکتے ہوئے کہہ رہی تھی اور حنان عجیب کھوئے کھوئے سے انداز میں اس کی سمت دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

'' ہاں' وہ پیاری ہی اتنی ہے کہ جو دیکھے اسے چاہنے لگے مگر وہ ملی تو صرف نصیب والوں کو ہے' محبت کو پا لینا ہر کسی کے نصیب میں تو نہیں لکھا ہوتا......''

'' حنان! آؤ بیٹے' دلہن کو مبارک باد دو اور منہ دکھائی بھی......''

وہ چونکہ اس گھر کا سب سے بڑا بیٹا اور ایمن کا جیٹھ بن چکا تھا' لہٰذا زرینہ بیگم دور سے ہی بولتے ہوئے آئیں پھر اسے یہ حکم صادر کر کے ماہ رخ کے ذمے کوئی کام لگانے لگیں اور وہ جو پتھر بنا کھڑا تھا' ان کے حکم پر اذان کے بیڈروم کی طرف بڑھا تو قدم گویا من من کے بھاری ہو گئے' آنکھیں تھیں کہ مارے جلن کے سرخ ہو گئی تھیں۔ کتنی دیر کر دی تھی اس نے محبت کے اظہار میں، کتنا بے فکر ہو کر بیٹھا رہا تھا وہ......اور آج اسی دیر، اسی بے فکری کی اسے کڑی سزا مل رہی تھی۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک اور دل بھی تو خون کے آنسو رو رہا تھا' ''ایمن حفیظ'' کا دل' جو اس وقت رو رو کر شدت سے دعا مانگ رہی تھی کہ کاش وہ یہاں اس گھر میں اذان کی بجائے حنان کے حوالے سے آتی، وہی اس کا گھونگھٹ اٹھاتا مگر ساری خواہشیں بھلا پوری ہونے کے لیے کہاں ہوتی ہیں؟

پھر جس وقت وہ اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اسے سجے سنورے انداز میں سیج پر بیٹھے دیکھا' اسے لگا کہ اس کا دل لہولہو ہو گیا ہو' پتہ نہیں کون لوگ ہوتے ہیں جو محبت دان کرتے ہیں، اس کی تو روح تک گھائل ہو رہی تھی، کمرے میں مدھم آہٹ پڑی' ایمن کے دل کی

دھڑکنیں بری طرح منتشر ہو گئیں، ہاتھ کانپنے لگے اور اسے لگا کہ بس ابھی کچھ ہی لمحوں میں اس کی جان نکل جائے گی۔

پھر جس وقت حنان بیڈ پر اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھا اور ٹوٹے ہوئے شکستہ لہجے میں بولا۔

''شادی مبارک ہو ایمن۔'' تو اس کی مانوس آواز سن کر اسے لگا گویا اس کے قریب ہی کہیں بم بلاسٹ ہو گیا ہو۔ پنکی اگر اس وقت اس کے پاس ہوتی تو کتنا مذاق اڑاتی اس کی دیوانگی کا اور حیران ہوتی اس کی بالکل سچی محبت پر۔ حنان نے صرف ایک نظر اس پر ڈالی تھی اور وہ اس دیوانی سی لڑکی کی جھیل جیسی گہری آنکھوں کے اداس آنسوؤں میں ڈوب گیا جو گھونگھٹ الٹنے عجیب پھٹی پھٹی سی حیران نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں کسی کانچ کے برتن کی طرح محبت کا دکھ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔ حنان سے اپنے دل پر قابو پانا دشوار ہو گیا۔

''آ...... آپ پہلے کیوں نہیں آئے......؟''

وہ جو اس سے ہزاروں شکوے کرنا چاہتی تھی، اس کے سینے پر سر رکھ کر تڑپتے ہوئے ادھوری محبت کا ماتم کرنا چاہتی تھی، اسے سامنے پا کر صرف یہی جملہ کہہ سکی اور جواب میں حنان نے افسردگی سے سر جھکا دیا۔

''میں بزی تھا ایمن، اسی لیے نہیں آ سکا......''

''مم...... میری منگنی پر بھی نہیں، کیوں......؟ کیا آپ کی مصروفیت، میری زندگی سے بڑھ کر تھی......؟

حنان سے خود اپنا ہی بھرم رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔

''مجھے ہر پل، ہر لمحے آپ کا انتظار رہا، ہر آہٹ پر یہ لگا کہ ابھی آپ آئیں گے اور مجھے والدین سے مانگ لیں گے مگر آپ نہیں آئے اور دیکھیں آج میں بن موت مر گئی۔''

اس کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں اور لہجہ غم کی شدت سے زخمی ہو گیا تھا۔ کیسا انکشاف کیا تھا اس نے کہ حنان کے اندر کی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ محبت صرف اسی نے کی ہے مگر یہاں تو داستان ہی کچھ اور تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ محبت میں پاگل اس نڈھال سی لڑکی کو کیا کہے؟ اور کیسے کہے؟ کہ وہ خود اپنا جمع شدہ حوصلہ کھو بیٹھا تھا۔

''ا...... اذان بہت اچھا لڑکا ہے ایمن، بہت خوش رکھے گا تمہیں......'' بمشکل خود کو



سنبھال کر اس نے کہا تھا۔

''ہاں وہ اچھا لڑکا ہے، مگر مجھے خوش نہیں رکھ سکتا کیوں کہ میری خوشیاں آپ کے پاس گروی پڑی ہیں۔'' جواب میں حنان نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

''پلیز بی ریلیکس ایمن، ضروری تو نہیں ہے کہ انسان جسے چاہے اسے پا بھی لے۔''

کس دل سے وہ اسے سمجھا رہا تھا یہ صرف وہی جانتا تھا، ایمن نے ہمیشہ کی طرح اس کے سلجھے ہوئے انداز پر تڑپ کر اسے دیکھا۔

''ہاں، آپ ایسے ہی کہیں گے، جانتی ہوں میں، آپ کو کسی سے محبت ہوئی ہوتی تو پتہ چلتا کہ دل ٹوٹنے پر کتنی تکلیف ہوتی ہے، میں آج تک صرف بے جان کرداروں پر روتی رہی تھی مگر دیکھیں، آج میں اپنے ہی زندہ کردار پر رو رہی ہوں اور کوئی میرا دکھ بٹانے والا نہیں۔''

وہ بچوں کی مانند بلک اٹھی تھی، حنان سے اسے اور خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

''میں اسی لیے تو کہتا تھا کہ فرضی کرداروں میں مت ڈھالو خود کو، حقیقت اور افسانے میں بڑا فرق ہوتا ہے ایمن پلیز، حقیقت کو قبول کرنا سیکھو۔ زندگی خدا کی امانت ہے، جو اس نے مقررہ وقت کے لیے ہمیں سونپی ہے، پلیز اس کی قدر کرو اور اسے آنسوؤں میں ضائع مت کرو اور ہاں یہ لو، تمہاری منہ دکھائی کے لیے میری طرف سے یہ گفٹ، ٹیک کیئر......'' پینٹ کی پاکٹ سے نازک سے نگینوں والا بریسلیٹ نکال کر اسے تھماتے ہوئے وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولا اور بنا اس کی طرف دیکھے کمرے سے باہر نکل گیا۔



اپنی ہی دھن میں رہتی تھی
اک لڑکی شوخ اور چنچل سی
پھولوں سے باتیں کرتی تھی
تتلی کے رنگ پکڑتی تھی
اک دھنک تھی اس کے آنچل پر
پھر جانے کیا طوفان آیا
تتلی کے رنگ بکھر گئے
آنچل کے رنگ اُتر گئے

سپنوں کے جگنوں ماند پڑے
جب پوچھا کسی نے اسے لڑکی
کیوں تم نے یوں چپ سادھی ہے
وہ کچھ نہ بولی بس رودی
اور خاک پر ہاتھ کی انگلی سے
اک لفظ ''محبت'' لکھ ڈالا

اذان نے جس وقت کمرے کی دہلیز کے اندر قدم رکھا' ایمن گھٹنوں پر سر رکھے زاروقطار رو رہی تھی۔ وہ اسے والدین سے جدائی کے آنسو ہی سمجھا، تب ہی تو چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے بالکل سامنے آ بیٹھا' پھر اپنائیت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''پلیز بی ریلکس ایمن' سب ہی لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے، سب کو ہی ایک نہ ایک دن اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر آنا پڑتا ہے مگر اتنا تو کوئی لڑکی نہیں روتی کہ جتنا تم رو رہی ہو، میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں مگر پلیز اس وقت تم چپ ہو جاؤ کیوں کہ میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔'' اس کی گمبھیر دھیمی آواز پر ایمن نے اگلے ہی پل سر اٹھا کر آنسو پونچھ لیے تھے۔

''گڈ' یہ ہوئی ناں بات' بس آج تک تم نے جتنا من چاہا' آنسو بہا لیے مگر آج کے بعد تمہارا ایک ایک آنسو میری امانت ہے اور اگر تم اس امانت میں خیانت کرو گی تو میں روزِ جزا تم سے حساب لے لوں گا' سمجھیں.....'' اپنے ہاتھوں سے اس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ پر محبت لہجے میں بولا تو ایمن بس خالی خالی سی نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی جو بے حد خوب صورت تھا مگر اس کے دل کا مکین نہیں تھا۔

''ایمن! میں نے آج تک زندگی میں صرف خوشیاں اور محبت ہی کشید کی ہے' میں نے جس وقت اپنے اللہ سے جو چاہا ہے' اس نے مجھے دیا ہے' جس کے لیے میں اس پروردگار کا بے حد شکر گزار ہوں مگر اس کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ میں دکھ شیئر نہیں کر سکتا۔ تمہیں جب بھی میری یا کسی کی بھی کوئی بات بری لگے تم بر ملا مجھ سے کہہ سکتی ہو۔ میں کھلے ذہن و دل کا مالک ہوں، عورت پر حکمرانی کے خمار سے شدید نفرت ہے مجھے' ہاں مجھ سے کبھی جھوٹ مت بولنا کیوں کہ میں دھوکہ دہی سے شدید الرجک ہوں۔ یہاں اس شہر میں، میں سعدیہ شیرازی کے لیے آیا تھا کیوں کہ وہ میری کزن ہونے کے ساتھ ساتھ میری منگیتر بھی تھی مگر جب میں نے



تمہیں دیکھا تو مجھے تم بے حد اچھی لگیں اور میں نے سوچا کہ اگر سعدیہ شیرازی سے شادی کر بھی لوں گا تو تمہیں نہ پانے کا دکھ ہمیشہ میرے دل میں رہے گا اور یہ اس بے قصور لڑکی کے ساتھ یکسر بے انصافی اور اس پر ظلم ہو گا کہ جو میرے لیے اپنا گھر بار' اپنے والدین، سب کچھ چھوڑ کر آئے گی اور بس اسی لیے، میں نے اس سے رشتہ ختم کر دیا کیوں کہ میں منافقت قطعی برداشت نہیں کر سکتا۔ بہر حال آج سے ہم اپنے اس پیارے سے نئے بندھن کی بنیاد سچائی، خلوص اور ایک دوسرے پر بے پناہ اعتماد کے ساتھ رکھیں گے اور کبھی اپنے دل کی بات ایک دوسرے سے نہیں چھپائیں گے، ٹھیک ہے.....؟'' محبت سے اس کا ہاتھ تھامے وہ بولتا رہا اور وہ سن سی بیٹھی خالی خالی سے ذہن کے ساتھ اسے بولتے ہوئے سنتی رہی۔ وہ رات محبت کی رات تھی، خوشبوؤں اور خوابوں کی رات تھی، ارمانوں بھری ایک ایسی رات تھی کہ جس کا تصور ہر لڑکی کے دل کی دھڑکنیں منتشر کر دیتا ہے مگر وہی رات حنان اور ایمن کی آنکھوں کے لیے ہزار صدیوں پر محیط ہو گئی۔ اذان نے اس سے کیا کہا، کیا چاہا، وہ کچھ نہ سن سکی۔ نظر کے کینوس پر اگر کوئی منظر تھا تو وہ اس کے اپنے ارمانوں کی لاش تھی، جس پر بیٹھی وہ بے دردی سے روتی ہوئی بلک بلک کر بین کر رہی تھی۔

پھر جب اگلے دن کا سورج نکلا تو وہ ہوش کی دنیا میں آئی اور اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اب ایمن حفیظ نہیں ایمن اذان ہے۔ اس کی شادی کے ہنگامے خاصی حد تک ماند پڑ چکے تھے، دعوتوں اور سیر سپاٹو کا طویل سلسلہ بھی اب قدرے تھم چکا تھا۔ تب ہی اذان نے اپنی ڈیوٹی جوائن کر لی اور وہ زرینہ بیگم کے ساتھ کچن کی طرف آ گئی کہ ماہ رخ بھی اپنی سٹڈی کے سلسلے میں ہوسٹل جا چکی تھی جبکہ وہ تو ایف اے کے پیپرز کے بعد دوبارہ پڑھائی کو انجوائے ہی نہ کر سکی۔ کالج لائف کا سارا حسن جیسے ان دو سالوں میں ہی سمٹ گیا تھا۔



حنان کو پچھلے دو تین روز سے شدید بخار آ رہا تھا اور وہ سارا دن اپنے کمرے میں نڈھال سا پڑا رہتا' یوں تو زرینہ بیگم اس کی کافی کیئر کرتی تھیں پھر رات میں شہزاد صاحب بھی اس کے ساتھ کافی وقت گزارتے مگر نجانے کیا بات تھی کہ وہ سنبھل ہی نہیں رہا تھا۔

ایمن چونکہ نئی نویلی دلہن تھی، پھر اذان کے ہوتے ہوئے وہ حنان پر توجہ کر بھی نہیں سکتی تھی، تب ہی دل پر ضبط کا بند باندھے رہی مگر اب جب کہ اذان جا چکا تھا تو وہ خود کو حنان

کا خیال رکھنے سے روک نہ پائی اور اس روز زرینہ بیگم سے پوچھ کر اس کے لیے سوپ بنا کر وہ اس کے کمرے میں چلی آئی جو بیڈ پر کمبل لپیٹے پڑا' بے حد نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔ ایمن کا دل کٹ کر رہ گیا' تب ہی وہ تڑپ کر آگے بڑھی۔

''حنان! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی......؟'' اس کی جلتی ہوئی پیشانی پر جونہی اس نے اپنا سرد ہاتھ رکھا، حنان کے اندر تک جیسے قرار کی ایک شدید لہر دوڑ گئی۔ پٹ سے آنکھیں کھول کر اس نے ایمن کو دیکھا، پھر دھیمے سے مسکرا کر خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

''مگر مجھے کیا ہوا ہے' میں تو ایک دم سے ٹھیک ٹھاک ہوں' ہاں یہ ٹمپریچر پتہ نہیں کیوں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا ہے اتر ہی نہیں رہا......''

''اترے گا کیسے' آپ اتنی تو لاپروائی برتتے ہیں، نہ ٹھیک سے کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں' مگر اب ایسا قطعی نہیں ہوگا، اگر آپ نے اپنا خیال نہ رکھا تو میں سارے گھر والوں کو بتا دوں گی کہ آپ کو میری شادی ہونے کا صدمہ پہنچا ہے' تب سارے گھر والے آپ سے پوچھ گچھ کریں گے اور آپ کو اقرار کرنا ہی پڑے گا اور پھر اذان کہے گا، ایمن تم میرے بھائی کا پیار ہو، جاؤ آج سے میں نے تمہیں......''

''نہیں' کبھی خواب میں بھی ایسا مت سوچنا ایمن' تم صرف اذان کی محبت ہو اور سدا اسی کی محبت کی چھاؤں میں رہنا ہے تمہیں، تمہاری زندگی میں میری حیثیت تو ایک مسافر کی تھی، جو تھوڑے سے دنوں کے لیے آیا اور واپس چلا گیا۔ ہاں میں تمہیں تمہاری انگیج منٹ پر وش نہ کر سکا کیوں کہ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ اذان کی باقاعدہ منگنی تم سے ہوئی ہے اس کی چونکہ میری پھوپھو زاد کزن، سعدیہ شیرازی سے بات چل رہی تھی تو میں یہی سمجھا کہ اسی کے ساتھ باقاعدہ منگنی ہوئی ہے اس کی، پھر گھر والوں نے مجھے مکمل تفصیل کہاں بتائی تھی جو مجھے حالات کا علم ہوتا' اب خدا نے تمہیں ہمیشہ کے لیے اس گھر کی بہو بنا کر بھیج دیا ہے تو اپنا مان، ہمیشہ سلامت رکھنا اور بھول جانا کہ تم نے کبھی کسی حنان نامی لڑکے سے محبت بھی کی تھی، اذان بہت اچھا لڑکا ہے، میں شروع سے جانتا ہوں اسے، بہت پیار کرتا ہے وہ تم سے، پلیز کبھی اس کا دل مت دکھانا، وہ صرف ہنسنا جانتا ہے، اس نے کبھی آنسوؤں کا درد نہیں سہا، لہٰذا پلیز تم اسے، اس درد کی پہچان کبھی کروانا بھی مت، اور جہاں تک میرا سوال ہے تو میں ہمیشہ تمہارا دوست بن کر رہوں گا، یہیں اسی گھر میں ہم اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کا خیال رکھیں گے مگر پلیز تم اس سے ہٹ کر کبھی کچھ مت



سوچنا کیوں کہ اسی میں اب تمہاری بھلائی ہے۔''

ایک دم سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا تو ایمن سخت اذیت کے عالم میں لب کاٹتے ہوئے اسے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔ پھر ایک جھٹکے سے وہاں سے اٹھی اور مزید ایک لفظ بھی کہے بنا کمرے سے باہر نکل گئی۔ حنان کی اداس آنکھوں نے دہلیز تک اس کا پیچھا کیا' پھر دوبارہ پلکیں موند کر سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا کہ اب اسے ایمن کو سمجھانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

اذان چھٹیوں پر ایک مرتبہ پھر گھر آیا ہوا تھا مگر اس بار اسے ایمن کے طرز عمل نے شدید دکھ سے ہمکنار کیا۔ وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہ رہا ہوتا اور ایمن ''حنان کے لیے سوپ بنانا ہے'' کہہ کر اس کے پاس سے اٹھ جاتی' وہ اسے اپنے لیے کھانا لانے کا کہتا تو وہ حنان کے کپڑے پریس کرنے میں مصروف پائی جاتی، کہیں باہر جانے کا موڈ ہوتا تو وہ حنان کے ساتھ لڈو' کیرم یا ایسا ہی کوئی کھیل، کھیلنے میں مصروف ہوتی، وہ اتنی مشکل سے صرف اس کیلئے چند دن کی چھٹی لے کر آیا تھا مگر اسے اس بات کا کوئی احساس ہی نہ تھا۔ وہ اجنبیوں کی طرح دیکھتا رہ جاتا اور وہ کبھی حنان کے لیے چائے بنا رہی ہے کبھی اسے گھمانے لے جا رہی ہے تو کبھی اس کے کپڑے اپنے ہاتھوں سے پریس کر رہی ہے جب کہ اذان اپنے تمام کام خود ہی کرتا تھا اور ایمن نے کبھی اسے ایسا کرنے سے منع نہیں کیا تھا۔

اس روز بھی اس نے بڑے پیار اور چاہ سے ایمن سے اپنی پسندیدہ ڈش چکن پلاؤ بنانے کی فرمائش کی تھی مگر جب وہ ٹیبل پر آیا تو وہاں ایک بھی ڈش اس کی پسند کی نہیں تھی، اوپر سے وہ کمال بے نیازی کا مظاہرہ کرتی حنان سے کھانا کھانے کے لیے اصرار کر رہی تھی۔ اسے ایک ایک ڈش ہاتھ میں لے کر کہہ رہی تھی۔

''حنان! یہ بریانی لو ناں پلیز، صرف تمہارے لیے میں نے بنائی ہے' تمہیں پسند ہے ناں، پلیز کھالو......'' کبھی سلاد کی ڈش اٹھاتی اور ملتجی انداز میں کہتی۔

''یہ سلاد کیوں نہیں کھا رہے ہو تم، پتہ بھی ہے کہ سلاد صحت کے لیے کتنی اچھی ہے' پھر بھی نہیں کھا رہے، حالانکہ اتنی کمزوری ہو چکی ہے آپ کے اندر۔''

اذان اس روز بنا کچھ کھائے ہی ٹیبل سے اٹھ گیا تھا مگر ایمن نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں اور اس کا اسے کس قدر دکھ ہوا تھا، یہ صرف وہی جانتا تھا۔ پھر اس کے اگلے ہی

روز جب اسے شدت سے چائے کی طلب ہو رہی تھی اور وہ ایمن سے کہہ آیا تھا کہ اسے چائے بنا کر کمرے میں دے جائے مگر آدھے گھنٹے کے بعد بھی جب وہ چائے لے کر نہیں آئی تو وہ خود کمرے سے باہر نکل آیا اور سامنے ہی اسے ایمن دکھائی دے گئی مگر چائے بناتے ہوئے نہیں بلکہ حنان کے سر میں زیتون کے تیل کی مالش کرتے ہوئے اور اس وقت اسے ایمن پر کس قدر غصہ آیا تھا۔ وہ اس کا ہلکا سا اظہار بھی نہ کر سکا اور خون کے گھونٹ پیتے ہوئے واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پھر شام کو جب ایمن کمرے میں آئی تو وہ جو کتاب کے مطالعے میں گم تھا، اسے دیکھ کر کتاب بند کر کے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا، پھر نہایت سرد انداز میں بولا۔

''یہ سب کیا ہے ایمن، میں کتنے ہی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ حنان کے سامنے تمہارے لیے، میری کوئی حیثیت نہیں۔ پلیز مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے، تم میرے ساتھ شادی پر خوش بھی ہو یا نہیں......؟''

اس کے الجھے ہوئے انداز پر ایمن نے سر اٹھا کر صرف ایک نظر اسے دیکھا، پھر دوبارہ رخ پھیر کر خشک لہجے میں بولی۔

''اس گھر میں، تمہارے علاوہ بھی میری کچھ ذمہ داریاں ہیں اذان، اب ساری عمر ممی ہی تو ذمہ داریاں نہیں نبھاتی رہیں گی ناں' میرا بھی کچھ فرض بنتا ہے اور بس میں وہی نبھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

''اور میرا حق ایمن......؟'' قدرے اداس لہجے میں دکھی ہو کر اس نے پوچھا تھا۔

''آپ کو آپ کا حق مل رہا ہے اذان' میں نے جان بوجھ کر کبھی آپ کی طرف سے غفلت نہیں برتی ہے۔ مگر آپ سے ہٹ کر بھی کچھ لوگوں کو میری ضرورت ہے اور اس صورت میں کہ جب ماہ رخ بھی یہاں نہیں ہے' یہ ضرورت اور بڑھ جاتی ہے مگر آپ کو خود سے ہٹ کر کسی کا احساس ہو' تب ناں......'' سخت کڑوے لہجے میں اس نے کہا تھا۔ اذان تو گم سم سا اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا اور وہ آرام سے بیڈ پر جا کر لائٹ آف کر کے سو گئی، اس پوری رات وہ جاگا تھا اور اس پوری رات کے ایک ایک لمحے میں یہ سوچ اس پر حاوی ہوئی تھی کہ ایمن اس شادی پر قطعی خوش نہیں ہے۔

تب ہی اگلے دن کے نکلتے سورج کے ساتھ کے ہی اس نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ حالانکہ اس کی چھٹیاں ابھی باقی تھیں، پھر گھر والوں نے بھی اس کے رک جانے پر کتنا اصرار



کیا تھا مگر وہ سنی ان سنی کرتا، ڈھیروں بہانے بنا کر، وہاں سے واپس چلا آیا کہ جس کے لیے سو جتن کر کے آیا تھا، جب وہی اس کے آنے پر خوش نہیں تھی تو وہ مزید کس کے لیے وہاں ٹھہرتا۔

اور ایمن نے اس کے یوں چپ چاپ واپس لوٹ جانے کو بھی قطعی کوئی اہمیت نہیں دی۔ ہاں مگر حنان نے بہت محسوس کیا، اسے لگا کہ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کے لیے جو قربانی دی ہے، اسے خود ہی اپنے ہاتھوں ضائع کر رہا ہو۔ ایمن کا کیا تھا، وہ تو پیار میں پاگل ایک دیوانی لڑکی تھی، جسے حنان کو سامنے پا کر اور کسی کا کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ کتنی ہی بار رضیہ بیگم اور زرینہ بیگم بھی دبے دبے لفظوں میں اسے سمجھاتی رہی تھیں مگر وہ ہر نصیحت، ہر ہدایت ایک کان سے سنتی اور دوسرے سے نکال دیتی۔

اذان نے چھٹیوں میں بھی گھر آنا بہت کم کر دیا کیوں کہ گھر آ کر بھی ایسے ماسوائے دکھ کے اور کچھ نہیں ملتا تھا۔ بہت جلد وہ جان گیا تھا کہ ایمن، حنان کو اس پر ترجیح کیوں دیتی ہے؟ اور اس راز کی حقیقت نے اسے ایمن سے مزید دور کر دیا۔ کبھی کبھی تو اسے اپنا آپ بھی گناہ گار لگتا کہ جس نے دو محبت کرنے والوں کے دلوں پر جدائی کی قیامت ڈھا دی تھی مگر پھر جب وہ اپنی بے خبری کا سوچتا تو اسے خود پر ترس آنے لگتا' اس سارے قصے میں اس کا قصور بھلا کہاں نکلتا تھا؟ اس نے تو صرف ایک لڑکی کو چاہا اور اسے اپنا لیا مگر تقدیر نے محبت دے کر بھی اسے خوشیاں نہیں دی تھیں۔

اور پھر اچانک ہی اس نے اپنی زندگی کا طرز بدل لیا، جب ایمن کو اس کی پروا نہیں تھی تو وہ اس کے لیے کیوں سوچتا' تب ہی اس نے ''سحر بخاری'' سے راہ و رسم بڑھانے شروع کر دیئے تھے اور اب وہ مہینوں گھر کی شکل نہ دیکھتا۔ حالانکہ اس کی نئی نئی شادی تھی مگر جب محبت ہی نہیں تھی تو وہ خالی جسم کا کیا کرتا؟

ادھر بہت سوچنے کے بعد حنان نے بالآخر ملک سے باہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ساری عمر وہ اپنے وطن سے دور اجنبی فضاؤں میں اپنوں کی محبت نہ ملنے کے دکھ میں بھٹکا تھا مگر آج اسے کسی بہت عزیز اپنے کی محبت سے دامن چھڑانے کے لئے ملک بدر ہونا پڑ رہا تھا اور شاید یہی اس کی زندگی تھی۔

ایمن تو اس کے یوں اچانک باہر جانے کا سن کر دنگ ہی رہ گئی۔ پھر اس کے آگے ہاتھ جوڑے، اس کی منتیں کیں، اپنی محبت کے واسطے دیئے، وعدے کیے کہ وہ جو کہے گا ایمن

ویسا ہی کرے گی مگر حنان اس جذباتی زیلیے کے بہاؤ میں نہ آیا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اب یہاں مزید رکنا سراسر نقصان دہ ہے۔

زرینہ بیگم اور ماہ رخ کو بھی اس کے باہر جانے کا دکھ تھا۔ انہوں نے بھی حنان کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنے ارادے پر ڈٹا رہا اور ایک مرتبہ پھر ایمن کی زندگی ویران کر گیا۔

وہ جو اذان احمد رؤف کے نام سے منسوب تھی، حنان کے بچھڑنے پر یوں بلک بلک کر روئی کہ جیسے ڈار سے بچھڑی کونج روتی ہے مگر حنان پر قطعی اس کے آنسوؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔

زندگی اسے سہانے خواب دیکھنے کی اتنی بڑی سزا دے گی' یہ ایمن نے کبھی سوچا تھا۔ وہ جاتے جاتے اپنے ساتھ ہی ایمن کی ہر خوشی، اس کا قرار، اس کی مسکراہٹ لے گیا اور وہ ایک دم زندہ لاش سی بن کر رہ گئی۔

اذان اب جب بھی گھر آتا' اس پر بھولے سے بھی نظر ڈالنا گوارہ نہ کرتا اور ایک یا دو دن رہ کر واپس چلا جاتا، وہ تو ہر طرف سے اکیلی ہو کر رہ گئی تھی اور ایسے میں اسے کسی کے ہمدرد کندھے کی اشد ضرورت تھی کہ جس پر سر رکھ کر وہ اپنے اندر کے سارے آنسو بہا ڈالتی۔

زندگی اپنی ویرانیوں کے ساتھ، یونہی رواں دواں تھی کہ ایک روز مارکیٹ میں شاپنگ کے دوران اسے پنکی مل گئی۔ ایک طویل عرصے کے بعد دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بے حد حیران ہوئیں۔ ایمن تو اس سے لپٹ کر رو ہی پڑی، تب پنکی نے بڑی نرمی سے اسے خود سے الگ کیا، پھر حال احوال پوچھا تو اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور وہ تمہارے ہیرو، حنان صاحب کا کیا حال ہے؟ اب بھی ویسے ہی ہیں یا بدل گئے......؟''

یہ وہ سوال تھا جو ایک مرتبہ پھر ایمن کی آنکھوں میں آنسوؤں کو کھینچ لایا اور وہ کوئی جواب نہ دے پائی۔ بس پنکی کو اپنے گھر کا کارڈ تھما دیا اور اس کا حال احوال پوچھنے لگی۔

جس کے جواب میں پنکی نے اسے بتایا کہ وہ یہاں اس شہر میں فقط تین، چار دنوں کے لیے اپنی ایک دوست کی شادی میں شرکت کے لیے آئی ہے، بصورت دیگر اس کے شوہر کی پوسٹنگ کراچی میں ہے اور وہ بھی اس کے ساتھ آج کل کراچی میں ہی رہتی ہے۔ تب دیر کافی ہونے کے باعث وہ پنکی کو لازماً گھر آنے کی تاکید کرتی واپس چلی آئی اور پنکی وعدے کے



مطابق جانے سے فقط چند گھنٹے قبل اس کی طرف چلی آئی۔ اس کا شوہر اسے دروازے سے ہی ڈراپ کر کے چلا گیا۔ ایمن تو اسے اپنے گھر میں دیکھ کر کھل اٹھی، لہٰذا خوب خوشی کا اظہار کیا۔ رضیہ بیگم آج ہی ایمن سے مل کر گئی تھیں اگر وہ بھی پنکی سے مل لیتیں تو بہت خوش ہوتیں تاہم زرینہ بیگم نے بھی اس کی آمد کو دل کی گہرائیوں سے وش کیا تھا اور خوب آؤ بھگت کی تھی۔

ہر چیز سے فارغ ہو کر جب وہ ایمن کے بیڈ روم میں داخل ہوئی تو پہلا قدم اندر رکھتے ہی چونک گئی کیوں کہ سامنے ہی بیڈ کے قریب کارنر اسٹینڈ پر ایمن کی شادی کی تصویر دھری تھی مگر اس کے ساتھ دولہا کے روپ میں حنان رؤف نہیں تھا، تب ہی وہ بے حد دیوانگی سے پلٹی اور ایمن سے شادی کی تصویر کے بارے میں استفسار کیا تو وہ سرد آہ بھر کر اداسی سے بولی۔

''ہاں یہی سچ ہے پنکی، میری شادی حنان رؤف سے نہیں بلکہ ان کے چھوٹے بھائی اذان رؤف کے ساتھ ہوئی ہے اور دیکھو آج تمہاری ہر خوب صورت لڑکے پر مرمٹنے والی شوخ و چنچل دوست، کیسے ریت کی دیوار کی مانند دھیرے دھیرے ڈھے رہی ہے۔'' بے حد تھکا ہوا لہجہ تھا اس کا' پنکی تو حیرت سے گنگ اسے دیکھتی ہی رہ گئی، تب ایمن نے اسے تمام صورت حال سے باخبر کر دیا اور وہ سچائی جان کر از حد دکھی ہوئی۔

''ایمن! تمہارے ساتھ جو ہوا، بہت برا ہوا، مگر اس سے بھی برا تم خود اپنے ساتھ کر رہی ہو، شاید تم جانتی نہیں ہو کہ محبت بھی ریت کی مانند ہوتی ہے جو ایک مرتبہ ہاتھ سے پھسل گئی تو پھسل گئی، پھر لوٹ کر دوبارہ مٹھی میں کبھی نہیں آتی۔ حنان نے تمہاری زندگی سے نکل جانے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ ہنڈرڈ پرسنٹ درست ہے، مگر تم نے اپنے لیے جو تنہائیاں چنی ہیں وہ ایک دم گھاٹے کا سودا ہیں۔'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ناصحانہ انداز میں کہے جا رہی تھی اور ایمن چپ چاپ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے سن رہی تھی۔

''ایمن! قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے شوہر کے بہت سے حقوق واضح کیے ہیں، یہاں تک ارشاد فرمایا ہے کہ اگر ایک رات بھی شوہر اپنی بیوی سے ناراض ہو گیا اور اسی حالت میں اس کی موت ہو گئی تو وہ عورت تب تک بخشی نہیں جائے گی کہ جب تک اس کا شوہر اسے معاف نہ کر دے، پھر تم مجھے بتاؤ کہ تم زندگی سے اپنے لیے کیا وصول رہی ہو؟ حنان تمہیں حاصل نہیں ہو سکا اور اذان کو حاصل کر کے بھی تم کھو رہی ہو' یہ کہاں کی دانش مندی ہے...... سوچو کل کو حنان کی مانند' اذان بھی تم سے چھن گیا تو تم کیا کرو گی......؟ کہاں جاؤ گی اپنا شکستہ

وجود لے کر ......؟ ایمن میری جان، اس دنیا میں انسان کو سب کچھ ہی نہیں مل جاتا، بہت سی
چیزیں رو رو کر مانگنا پڑتی ہیں تب کہیں جا کر وہ حاصل ہوتی ہیں اور بہت سی چیزوں کے لیے
عمر بھر تڑپنا پڑتا ہے مگر وہ پھر بھی حاصل نہیں ہوتیں اسی کا نام زندگی ہے، یہی تقدیر ہے انسان
کی اور پھر کھلی آنکھوں سے دیکھے گئے سپنے تو کبھی بھی پورے نہیں ہوتے، ہمیشہ الٹ ملتا ہے ان
کا۔ پھر تم کیوں اپنی زندگی کے یہ خوب صورت دن بیوقوفی میں ضائع کر رہی ہو
ایمن؟ پلیز مت کرو ایسا، عقل کے ناخن لو اور آنے والے وقت کا خیال کرو، خدانخواستہ ایسا نہ
ہو کہ کل تم اپنے طرزِ عمل پر پچھتاؤ، مگر وقت تمہارے ہاتھ سے نکل جائے۔'' پنکی کا سانس
پھول چکا تھا، وہ جونہی سانس لینے کو رکی، ایمن بول پڑی۔

''میں نے صرف حنان کو چاہا ہے پنکی، صرف اسی کے ساتھ کی دعائیں مانگی ہیں،
اب جب وہی میری تقدیر میں نہیں ہے تو میں کسی اور کا ساتھ کیسے قبول کر سکتی ہوں۔ ہاں میں
ایسا کر بھی لیتی ہوں جو اگر حنان کو مجھ سے محبت نہ ہوتی مگر وہ مجھے، مجھ سے زیادہ چاہتا ہے تو
پھر کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ساری عمر کڑھ کڑھ کر جینے کی بجائے میں اذان سے ڈائیورس لے کر
حنان کو اپنا لوں تا کہ ہم دونوں کی زندگی میں پھر سے بہار آ جائے۔''

اتنا سمجھانے کے باوجود بھی وہ اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹی تو پنکی نے
اسے مزید سمجھانے کا ارادہ ترک کر دیا اور گہری سانس بھر کر قدرے تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تمہاری مخلص دوست ہونے کے ناتے تمہیں درست راستے کے بارے میں
آگاہی دینا میرا فرض تھا، سو میں نے پورا کیا، آگے جیسے تمہاری مرضی، زندگی تمہاری ہے تم
جیسے چاہو اسے بسر کرو، ہاں ایک آخری بات جو میں پہلے تمہیں قطعی بتانا نہیں چاہتی تھی مگر اب
اسے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے لہٰذا تمہیں بتا رہی ہوں، میں تمہارے شوہر اذان احمد کو
بہت اچھی طرح جانتی ہوں، وہ میرے شوہر کے بہت اچھے دوست ہیں اور اسی حوالے سے
ہمارے گھر آتے رہتے ہیں، پھر شہباز بھی مجھے ان کے بارے میں کافی کچھ بتاتے رہتے ہیں،
تمہیں شاید معلوم نہ ہو، وہ کراچی میں آج کل ایک لڑکی سحر بخاری کے ساتھ بہت دیکھا جا رہا
ہے اور وہ لڑکی قطعی اچھی لڑکی نہیں ہے، ہوسکتا ہے وہ اذان کو دکھ کی گہری دلدل میں ڈبو دے،
تمہیں اگر اس کا ذرا سا بھی خیال ہے تو پلیز اسے دکھوں کے سمندر میں غوطہ زن ہونے سے
بچا لو، یہ میری ریکوئسٹ ہے تم سے......''



مدلل انداز میں وہ اسے ایک مرتبہ پھر سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی پھر جب
باہر اس کا شوہر شہباز اسے واپس لینے کے لیے آ گیا تو وہ نہایت محبت سے اسے گلے لگا کر
ہمیشہ خوش رہنے کی دعائیں دیتی واپس چلی گئی۔

تب اس رات ایمن نے دیر تک اپنے بارے میں سوچا' اپنے آئندہ مستقبل کے
بارے میں سوچا اور یہ طے کیا کہ اب اُسے اپنی زندگی کی ڈولتی ہوئی ناؤ کو کسی ایک کنارے پر
لگا ہی دینا چاہیے کیوں کہ یوں امید اور ناامیدی کے درمیان گھٹ گھٹ کر جینا تو واقعی کوئی
دانش مندی نہیں تھی۔

اور پھر اسی رات ایمن نے حنان کے نام ایک آخری خط لکھا، نہایت دکھ اور دل
گرفتگی کے عالم میں' کانپتی ہوئی انگلیوں کے ساتھ، جو ٹھیک دس دن کے بعد حنان کو مل گیا اور
اتنے بہت سے دنوں کے بعد ایمن کا خط پا کر وہ تو حیران ہی رہ گیا۔ سخت تذبذب کے عالم
میں، جلدی سے لفافہ چاک کر کے اس نے خط باہر نکالا اور اپنی بے تاب نگاہیں لفظوں پر تیزی
سے دوڑائیں۔

''حنان!

آپ اسے میری زندگی کی سب سے بڑی بھول کہیں یا میری دیوانگی، مگر میری
زندگی کا سچ یہی ہے کہ میں نے آپ سے پیار کیا ہے، دل کی گہرائیوں سے ٹوٹ کر چاہا ہے
آپ کو اپنی ہر خوشی، ہر محبت بھرا لمحہ صرف آپ کو دان کیا ہے میں نے، آپ سے ہٹ کر کبھی
کسی کو نہیں سوچا، مگر بدلے میں مجھے سوائے کرب کے اور کچھ بھی نہیں ملا۔ آنسو ہی آنسو پیئے
ہیں آپ کے پیار میں، ہاں میں افسانوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی تھی، ہاں میں نے کھلی
آنکھوں سے سہانے خواب دیکھنے کی حماقت کی ہے، مگر اس کی اتنی بری سزا تو نہیں تھی حنان کہ
جتنی بڑی سزا آپ نے مجھے دے ڈالی ہے۔ میں اب تھک گئی ہوں حنان سراب کے پیچھے
بھاگتے بھاگتے نڈھال ہو گئی ہوں، پلیز میرے درد کو سمجھنے کی کوشش کریں اور مجھے صرف اتنی
بات بتا دیں کہ کیا اپنی زندگی کے کسی بھی لمحے میں، آپ نے مجھ سے محبت کی ہے......؟ کیا
کبھی مجھے میری طرح ہی چاہا ہے؟ پلیز مجھے بتا دیں حنان، میں آپ کے لیے سب کچھ چھوڑ
دوں گی، سارے حالات اپنے حق میں کر لوں گی، مگر مجھے آپ کا ساتھ چاہیے حنان، پلیز
میرے سوال کا جواب جلد سے جلد دے دیجئے، میں اس کے بعد کبھی آپ کو تنگ نہیں کروں

گی، یہ میرا وعدہ ہے آپ سے……‘‘ وہ جوں جوں اس کی تحریر پڑھتا جا رہا تھا، اس کے اندر سناٹے اتر رہے تھے۔ آنسو نجانے کب پلکوں کی باڑ توڑ کر گالوں سے پھسلتے ہوئے کاغذ میں جذب ہو گئے، پھر کتنی ہی دیر وہ روشنیوں کے خوب صورت شہر میں سرد ہواؤں کے سامنے کھڑا اس کے لفظوں کو سوچتا رہا اور اس کا دل مچل مچل کر اس سے یہ کہتا رہا کہ وہ سب کچھ بھول دے، ایمن کا ہاتھ تھام لے مگر اس نے دل کے کہنے پر اس کی ضد پر کان نہیں دھرے، کیوں کہ ساری عمر وہ اپنوں سے دوران کی محبت کو ترستا رہا اور اب جب کہ تقدیر نے اسے انہی اپنوں کے لیے کچھ قربان کرنے کا موقع دیا تھا تو کیا وہ خودغرض بن جاتا؟ کیسے بن سکتا تھا وہ خودغرض؟ وہ کہ جس کی اپنی کوئی پہچان ہی نہیں تھی، وہ جو یتیم خانے میں روکھے سوکھے ٹکڑوں پر پلنے والا ایک لاوارث بچہ تھا، جس کی نہ ماں کا پتہ تھا نہ باپ کا، جو اگر اسی ماحول میں رہتا تو شاید تا عمر حقیقی زندگی کے خوب صورت لمس کی پاسنگ کو بھی محسوس نہ کر سکتا مگر شہزاد رؤف اور زرینہ بیگم نے اسے اس گھٹن کے ماحول سے نکال کر خوشیوں بھری پر آسائش زندگی دی۔ پورے چار سال تک اس کے خوب ناز اٹھائے اور اسے ہر وہ چیز مہیا کی جس کا وہ صرف خواب دیکھ سکتا تھا۔ پھر اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی، اچھے سے اچھا لباس پہنایا، اپنا نام دیا، پہچان دی اور معاشرے میں سر اٹھا کر عزت سے جینے کا مان دیا تو پھر وہ کیسے خودغرض بن سکتا تھا؟ کیسے محض اپنے دل کی خوشی کے لیے ان سب کی خوشیوں کو آگ لگا دیتا، ان کی عمر بھر کی مہربانیوں کا صلہ خودغرضی کی صورت میں لوٹا دیتا انہیں، کیا وہ نہیں جانتا تھا اس کے لیے، ان اپنوں کی کیا اہمیت تھی؟ پھر رضیہ بیگم کی آنکھوں میں جھلکتی اپنے لیے خود ساختہ نفرت سے وہ کیسے منہ موڑ سکتا تھا؟ پھر اگر وہ ایمن کو اپنا بھی لیتا تو شاید اسے کبھی خوش نہیں رکھ سکتا تھا کیوں کہ اس کے اس قدم سے نہ تو خود اس کے اپنے گھر والے خوش ہوتے اور نہ ہی ایمن کے، پھر وہ کس برتے پر محض جذبات میں آ کر اپنی اور اس کی دونوں کی زندگی داؤ پر لگا دیتا؟ کیا وہ دونوں عمر بھر کے لیے اپنوں کی محبت کھو کر ایک خوش حال اور مطمئن زندگی گزار سکتے تھے؟ شاید کبھی نہیں اور پھر محبت ہمیشہ ہی جذبات کا نام کب ہوتی ہے؟ بعض اوقات کچھ فیصلے مصلحت کے تحت بھی کرنے پڑ جاتے ہیں، محبت کو قائم رکھنے کے لیے اور اس وقت اسے ایسا ہی کوئی فیصلہ ترتیب دینا تھا۔

تب ہی ایک طویل عرصے کے بعد اس نے اپنی کلاس فیلو مارگریٹ جانسن سے دوبارہ رابطہ کر لیا جو پچھلے کئی سالوں سے دیوانہ وار اسے چاہتی رہی تھی اور اس کی محبت میں



اسلام قبول کر کے خود کو مکمل طور پر ایک مشرقی لڑکی کے روپ میں ڈھال لیا تھا۔ حنان کی زندگی میں اگر ایمن کے بعد کسی لڑکی کی کوئی قدر و اہمیت تھی تو وہ مارگریٹ جانسن تھی کہ جس نے عشق میں پاگل ہو کر اپنی پہچان، اپنا نام، اپنے طور طریقے، سب کچھ بدل ڈالا مگر وہ پچھلے کئی سالوں سے اسے مسلسل نظر انداز کر رہا تھا تاہم اب اسے حالات کو بدلنا تھا، ایمن کو اپنی بے وفائی کا یقین دلانے کے لیے اس کا کسی سے بھی شادی کرنا بے حد ضروری تھا، سو اس نے دل کے کہنے پر مارگرٹ جانسن کو اب جس کا اسلامی نام عائشہ تھا، کا ہاتھ تھام لیا اور وہیں نیویارک میں ایک سادی سی تقریب ارینج کر کے بنا کسی کو اطلاع دیئے اس سے نکاح کر لیا۔

ادھر ایمن کا ایک ایک دن جیسے کانٹوں پر گزر رہا تھا، روز وہ حنان کے جواب کا انتظار کرتی اور روز اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اب تو وہ انتظار کر کر کے بھی تھک گئی تھی، اذان مہینوں گھر نہ آتا اور جب آتا تو صرف ایک یا دو دن ٹھہرتا، پھر واپس چلا جاتا۔ گھر میں قیام کے دوران بھی وہ مسلسل سحر بخاری کے ساتھ رابطے میں رہتا اور ایمن خون کے گھونٹ پیتی، جلتی کڑھتی رہ جاتی۔ وہ اسے بلانا تو درکنار، اس پر ایک نظر تک ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ اتفاقاً اگر سامنا ہو بھی جاتا تو یوں اجنبی بن کر سائیڈ بدل لیتا کہ جیسے اسے بالکل بھی جانتا نہ ہو۔ وہ اس کا کوئی کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی کوشش کرتی تو وہ اس کا ہاتھ جھٹک دیتا، گویا مکمل لاتعلقی تھی، ایمن تو عجیب دوراہے میں پھنس گئی تھی نہ حنان کوئی جواب دے رہا تھا اور نہ اذان اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دل مندر میں اُداسیوں نے ڈیرے ڈال لیے اور وہ خوشیوں کا منہ دیکھنے کو ترس گئی۔

اُس روز موسم صبح ہی سے خاصا ابر آلود ہو رہا تھا، وقفے وقفے سے بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ حنان کے جواب سے تو وہ کب کی مایوس ہو چکی تھی اور اب گزرتے ہر دن کے ساتھ اس کے اندر اذان کو کھو دینے کا احساس ملال بن کر اسے ہوش و حواس سے بے گانہ کر رہا تھا۔ وہ ہر روز اسے خواب میں سحر بخاری کے ساتھ گھومتے پھرتے، ہوٹلنگ کرتے دیکھتی اور جب آنکھ کھلتی تو اپنی بے بسی اور تقدیر کی بے رحمی پر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی۔

ان کا گھر بالکل روڈ پر واقع تھا اور روڈ کے دوسری جانب، مسز شاہدہ رحمٰن کا بنگلہ تھا، جو بے حد نائس خاتون تھیں۔ ایمن کی ان سے کافی علیک سلیک ہو چکی تھی لہٰذا وہ جب بھی بے حد اداس ہوتی تو ان کے پاس چلی جاتی پھر ان کے ساتھ باتوں کے دوران اسے وقت کے

گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔

اس روز ان کی طبیعت کافی ناساز تھی، لہٰذا وہ دوپہر کے کھانے کے بعد' زرینہ بیگم سے اجازت لے کر ان کی طرف چلی آئی، پھر شام کے بعد جب بارش کا زور مزید بڑھ گیا تو وہ ان کے ہاں سے اٹھ کر گھر واپس چلی آئی اور لاؤنج میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

نظر کے بالکل سامنے ہی بیڈ پر اذان بیٹھا تھا اور زرینہ بیگم کے ساتھ گفتگو میں مشغول تھا۔ اسے آتے دیکھا تو ماتھے پر شکنیں ڈال کر اٹھتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلا گیا جہاں بیڈ کے قریب ہی کارنر اسٹینڈ پر اس کی اور ایمن کی شادی کی تصویر لگی تھی اور اس تصویر میں وہ کھل کھلا کر ہنس رہا تھا جب کہ ایمن یوں اداس کھڑی تھی جیسے ٹھہرے پانیوں کی اداس جھیل، اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ تصویر اٹھالی اور دیر تک اسے گہری دلچسپی سے دیکھتا رہا، میرون لہنگا کرتے میں، نفاست سے کی گئی تیاری کے ساتھ وہ کوئی جنت کی حور ہی لگ رہی تھی۔

''تو تمہاری زندگی میں میری کوئی اہمیت نہیں ایمن، میرا ہونا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تمہارے لیے۔'' نہایت اداسی کے ساتھ اس کے احمریں لبوں پر انگلی پھیرتے ہوئے دل گرفتگی سے سوچا تھا کہ اسی پل وہ دروازہ کھول کر کمرے کے اندر چلی آئی، اذان نے سرسری سی نظر اٹھا کر اسے دیکھنا چاہا مگر اس کے وجود سے اپنی نگاہ چاہنے کے باوجود نہیں ہٹا پایا۔ آف وائیٹ کاٹن کے کپڑوں میں ملبوس وہ اس وقت بری طرح بھیگی ہوئی تھی اور اس کے باریک کپڑے اس کے حسین نشیب و فراز کو چھپانے کے لیے ناکافی ثابت ہو رہے تھے۔ اذان کی خود پر جمی گہری بے باک نگاہوں نے اسے شرم سے پانی پانی کر دیا' تب ہی وہ جلدی سے وارڈ روب کی طرف بڑھی اور جو بھی سامنے آیا، اپنا سوٹ نکال کر واش روم میں گھس گئی۔

اس روز اس نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ اذان سے معافی مانگ کر اسے منالے مگر پھر نجانے کیوں وہ اپنے اندر اتنی ہمت ہی جمع نہ کر پائی اور ہر بار اس کے لب کچھ کہنے کی کوشش میں محض کپکپا کر رہ جاتے۔ اس پوری رات ایک ہی بیڈ پر لیٹے وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے رہے تھے مگر دونوں ہی ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کی جرأت نہ کر پائے۔

یہاں تک کہ صبح کی سپیدی نمودار ہوگئی اور اذان سلگتی آنکھوں کے ساتھ چپ چاپ اٹھ کر واش روم میں گھس گیا۔ ایک ان کہی سی خلیج ان دونوں کے درمیان حائل ہوگئی تھی، فاصلے



تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے اور ایمن اپنے دل کی شدتوں سے بے حال، پاگل ہونے کو تیار تھی۔ اذان ہمیشہ کی طرح ایک مرتبہ پھر اس کے پاس آیا اور آ کر چپ چاپ چلا گیا تاہم وہ ہمیشہ کی طرح چاہنے کے باوجود اس سے ایک لفظ تک نہ کہہ سکی۔

پھر اس روز جب اسے ہلکا ہلکا بخار تھا اور وہ انتہا سے بڑھ کر اپنے اندر کمزوری محسوس کر رہی تھی، اسے ایک طویل عرصے کے بعد حنان کا خط ملا' زرینہ بیگم کسی ضروری کام کے سلسلے میں رضیہ بیگم سے ملنے گئی تھیں اور وہ گھر میں اکیلی تھی۔

کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے خط تھاما تھا، دل تھا کہ پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہو رہا تھا اور وہ عجیب غیر ہوتی حالت کے ساتھ حنان کا بھیجا ہوا نفیس سا خط چاک کر رہی تھی، پھر جونہی لفافہ چاک کر کے اس نے اندر سے مواد نکالنا چاہا، مختلف پوز کے ساتھ کھینچی گئی تصویریں، پل کے پل اس کے ارد گرد بکھر گئیں اور وہ گم سم سی عجیب پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے اطراف میں بکھری ہوئی وہ خوب صورت سی تصویریں دیکھنے لگی کہ جن میں دولہا بنا حنان احمد ایک نہایت خوب صورت لڑکی کے ساتھ مختلف پوز میں والہانہ محبتیں لٹاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ٹکر ٹکر دیکھتی ہی رہ گئی، ابھی تھوڑی دیر پہلے سینے میں مچلتا دل جیسے ایک دم سے تھم سا گیا، ساعتیں تھیں کہ برف ہوگئیں اور وہ صدمے کی شدت سے گنگ، عجیب ٹوٹے ہوئے انداز میں وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ کاغذ کا ایک نفیس سا پھڑ پھڑاتا ہوا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھا اور اب وہ خالی خالی سی نگاہیں تصویروں سے ہٹا کر اس کاغذ کے ٹکڑے پر دوڑا رہی تھی، جہاں نہایت نفاست سے خوب صورت ہنڈ رائیٹنگ میں لکھا تھا۔

''ایمن!

طویل عرصے کے بعد تمہارے سوالوں کا جواب دے رہا ہوں، ہو سکے تو اس گستاخی کے لیے مجھے معاف کر دینا، اصل میں، میں اپنی وائف مسز عائشہ حنان کے ساتھ ہنی مون ٹرپ کے لیے گیا ہوا تھا۔ تم لوگوں کو بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر مطلع نہیں کر سکا جس کی میں تم سب سے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے تمہارا پورا خط پڑھا اور بار بار پڑھا اور اسے پڑھ کر میں بے حد حیران ہوا ہوں کہ تم خوامخواہ میں اپنی زندگی کو امتحان کیوں بنا رہی ہو؟ آج میں حتمی طور پر تمہیں یہ بات سمجھانا چاہتا ہوں کہ پانی کی تلاش میں، سرابوں کے پیچھے بھاگنے والے ہمیشہ دکھ اٹھاتے ہیں مگر میں تمہیں یہ دکھ اٹھانے نہیں دینا چاہتا، اس لیے آج تمہیں سب کچھ سچ بتا رہا ہوں۔

دیکھو ایمن، یہ ٹھیک ہے کہ تم بہت اچھی لڑکی ہو، دنیا کا کوئی بھی شخص تم سے محبت کر سکتا ہے، تمہیں چاہ سکتا ہے مگر بے حد معذرت کہ وہ میں کبھی نہیں ہو سکتا کیوں کہ میں نے ہمیشہ تمہیں صرف ایک اچھی دوست، ایک اچھی لڑکی مانا ہے اور ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا ہے تمہیں۔ مگر نجانے کیوں اور کب تم میری اس نظر کو میری محبت سمجھ بیٹھیں اور میں آج تک تمہاری غلط فہمی دور نہیں کر سکا، شاید اس لیے کہ میں تمہارے پیار کو اس قدر سیریس نہیں سمجھا تھا یا پھر شاید اس لیے کہ میں تمہیں دل ٹوٹنے کے درد سے بچانا چاہتا تھا، تمہیں بے جان کرداروں کے لیے بری طرح سے روتے ہوئے دیکھ کر ایک جان دار کردار کے لیے رونے سے بچانا چاہتا تھا مگر آج حالات ایسے دوراہے پر آ گئے ہیں کہ مجھے تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنا پڑ رہا ہے۔ دیکھو ایمن' محبت صرف جسم کو پا لینے کا نام کبھی نہیں رہا، اگر تمہارے بقول تمہیں مجھ سے محبت ہے تو وہ کبھی تمہارے دل سے ختم نہیں ہو سکتی، خواہ تم کسی کے ساتھ بھی زندگی گزارو، وہاں یہ محبت دل کے اندر دب کر ہی رہے تو زیادہ بہتر ہے، زندگی میں ہر انسان بہت سی چیزوں کی خواہش کرتا ہے مگر اسے ملتا صرف وہی ہے جو اس کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے اور سمجھ لو کہ میں تمہارے نصیب میں نہیں تھا وگرنہ تمہیں ضرور مل جاتا۔

ایمن! میں نے صرف ایک ہی لڑکی کو چاہا ہے اور صرف اسی سے محبت کی ہے اور وہ لڑکی ایمن حفیظ نہیں بلکہ مارگریٹ جانسن ہے جو اب میری بیوی مسز عائشہ حنان ہے، جس نے میرے لیے اپنا گھر بار، اپنے والدین اپنا مذہب، سب کچھ چھوڑ دیا۔ کیا کوئی اور لڑکی اتنی بڑی قربانی دے سکتی تھی؟ شاید کبھی نہیں، میں اپنی محبت کو پا کر بے حد خوش ہوں اور تم سے بھی ریکوئسٹ کرتا ہوں کہ افسانوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت میں جینا سیکھو کیوں کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہے، اذان بہت محبت کرنے والا لڑکا ہے۔ اسے کھونے کی حماقت مت کرو، مزید میں اپنی خوشیوں کو کھونا نہیں چاہتا، اس لیے تم سے گزارش ہے کہ پلیز آئندہ اس طرح سے، میری پرسنل لائف میں دخل اندازی مت کرنا کیوں کہ میں اپنی وائف کو بہت چاہتا ہوں اور تمہاری وجہ سے میری زندگی میں کوئی مسئلہ پیدا ہو، یہ میں نہیں چاہتا، تم اذان کے ساتھ اپنی زندگی خوش گوار انداز میں گزارو اور ماضی کو بھول جاؤ کیوں کہ اب یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ آگے جیسے تمہاری مرضی، خدا حافظ۔ گھر میں سب کو سلام کہنا، جلد ہی ہم لوگ پاکستان وزٹ پر آ رہے ہیں، تب تک کے لیے اللہ نگہبان۔



تمہارے لیے ہمیشہ دعا گو، حنان رؤف۔"

وہ جیسے جیسے تحریر پڑھتی گئی، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا گیا۔

آنکھیں تھیں کہ ضبط کی شدت سے سرخ ہو گئیں، دل تھا کہ کرب کے بار سے پھٹا جا رہا تھا اور وہ خود نڈھال سی بیٹھی، روتی جا رہی تھی۔ بالکل اس معصوم سے بچے کی مانند، کہ جو اپنا من پسند کھلونا ٹوٹ جانے پر' پھوٹ پھوٹ کر بے بسی سے روتا ہے۔ آج اس کے دل کا خوب صورت کھلونا بھی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا اور وہ یہ تکلیف برداشت نہ کر پا رہی تھی، تب ہی تو اکیلے گھر میں خوب چیخ چیخ کر روئی، بلک بلک کر اپنی محبت کی موت پر ماتم کیا۔ اپنے پُر خلوص جذبوں کی توہین پر سسک سسک کر آنسو بہائے اور نجانے مزید کتنی دیر روتی رہتی کہ اچانک ہی اس کا سر چکرانے لگا، کم زور تو وہ پہلے ہی بہت تھی، پھر اس صدمے سے بلک بلک کر رونے سے، مزید طبیعت خراب ہو گئی، تب وہ لڑکھڑا کر اٹھی اور اپنی مٹھی میں دبوچا وہ نفیس سا کاغذ وہ موتیوں جیسے لفظوں سے سجا خوب صورت خط جو اس کی برباد محبت کی آخری نشانی تھی، آگ کے سپرد کر دیا، پھر جونہی وہ کاغذ راکھ بنا' ایمن اپنی رہی سہی ہمت بھی کھو بیٹھی اور وہیں کچن کے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

اس کی دوبارہ آنکھ کھلی تو وہ انتہائی پُرسکون انداز میں اپنے بیڈ روم میں بستر پر لیٹی تھی اور اس کے دائیں طرف فکر مندی سی زرینہ بیگم اسے ہوش میں آتے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کر رہی تھیں۔

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمہیں ہوش آ گیا وگرنہ میرا تو دل ہی ڈوب گیا تھا۔ اب کیسی طبیعت ہے بیٹے......؟" ان کے اپنائیت بھرے انداز پر وہ بس پلکوں کو جنبش دے سکی، پھر قدرے نم بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مم......مما......اذان......اذان کو بلا دیں' پلیز......"

"ہاں بیٹے' میں تو اسے کال کر چکی ہوں، وہ بس آتا ہی ہو گا، تم آرام کرو اب، میں دودھ لے کر آتی ہوں تمہارے لیے۔" اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر گالوں کو چومتے ہوئے وہ محبت سے کہتی ہوئی اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں، تو ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر آئیں۔

پھر ایک دن، دو دن، تین دن گزر گئے مگر اذان نہیں آیا، البتہ اگلے کچھ دنوں میں حنان اپنی فارنر وائف کے ساتھ ضرور آ گیا۔ کچھ گھنٹوں کے لیے تو زرینہ بیگم، شہزاد رؤف، ماہ

رخ، رضیہ بیگم اور حفیظ صاحب، سب کے ہی اعصاب پر بجلیاں گری تھیں، حنان کے اس اقدام کو سبھی نے ناپسندیدگی سے دیکھا مگر پھر اس نے جانے کون سا منتر پڑھا، کیسے قائل کیا زرینہ بیگم اور شہزاد رؤف صاحب کو کہ وہ بہت پیار اور اپنائیت کے ساتھ حنان اور عائشہ دونوں کو گلے لگا کر رو پڑے۔

پھر ان کی باقاعدہ ولیمے کی تقریب وسیع پیمانے پر ارینج کی گئی اور سب لوگ ایک مرتبہ پھر اس محل سے خوب صورت گھر میں اکٹھے ہو گئے کہ جو ایمن کو صرف ایک اذان کے نہ ہونے سے قطعی ویران لگ رہا تھا۔ عدی ہوسٹل سے چھٹیاں لے کر آیا تھا اور اب بھی اسے چھیڑتے ہوئے کبھی ماہ رخ، نوشی، عمان کو تنگ کرتے ہوئے بے حد خوش لگ رہا تھا بلکہ ایک وہی کیا، سب لوگ خوش لگ رہے تھے۔ ایک اسی کا دل جل رہا تھا، تب ہی تو کام کا بہانہ کر کے وہ تیار بھی نہیں ہوئی تھی۔ حنان اپنی خوبصورت وائف کے ساتھ بے حد خوش نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر جانے کیوں ایمن کو لگ رہا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے، اس کی غلافی آنکھوں میں ٹھہرا عجیب سا درد اس کے لبوں کی مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا، تب ہی وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آتے ہوئے وہ ایک مرتبہ پھر بری طرح سے رو پڑی، پھر اسی طرح روتے ہوئے اس نے اذان کا موبائل نمبر پریس کر ڈالا مگر دوسری طرف سے کسی لڑکی سحر بخاری کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی، تب دل میں اٹھتے درد کے ابال کو دباتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ''ایمن'' عین اسی لمحے کسی نے اسے پکارا تو مانوس پکار پر اس نے چونک کر سر اٹھایا پھر دروازے کے بیچ و بیچ اذان کو کھڑے دیکھ کر حیرت سے گنگ، دیوانوں کی طرح اٹھی اور بھاگ کر سسکتے ہوئے اس کے سینے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''اذان......اذان آپ آگئے، میں نے کتنا یاد کیا آپ کو، کتنی بار پکارا، آپ کیوں نہیں آئے اذان......؟ میں کتنا روئی ہوں آپ کے لیے، آپ نے کہا تھا نا کہ میں اپنا ہر دکھ آپ سے شیئر کر سکتی ہوں، تو پھر آپ نے مجھے میرے حال پر کیوں چھوڑ دیا اذان، کیوں دکھوں کی دلدل سے نکالنے کی کوشش نہیں کی، کیوں اپنی محبت کا سہارا نہیں دیا مجھے، بتایئے اذان کیوں آپ نے تنہا کر دیا مجھے؟''

وہ بلکتے ہوئے کہہ رہی تھی اور اذان اسے بانہوں میں چھپائے یوں پاگلوں کی طرح



دیکھ رہا تھا کہ اب اگر وہ نازک سی لڑکی اس سے ایک پل کے لیے جدا ہوئی تو وہ موت سے پہلے ہی مر جائے گا۔

''اذان! مجھے زندگی کے ہر قدم پر آپ کی ضرورت ہے، ہر قدم پر آپ کا سہارا چاہیئے ہے مجھے' میں ہار گئی اذان' میں ساری عمر ایک سراب کے پیچھے بھاگتی رہی لیکن اب آپ کے پیار کی چھاؤں میں آرام کرنا چاہتی ہوں، بولیے اذان، کیا آپ سہارا دیں گے مجھے......؟'' اس کی سسکیاں رک ہی نہیں رہی تھیں۔ اذان نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ تھام کر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے' پھر اس کی پیشانی چومتے ہوئے پر محبت لہجے میں بولا۔

''ہاں ایمن، زندگی کے ہر قدم پر میں تمہارا سہارا بنوں گا، کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا تمہیں، مگر تم نے مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کیا ایمن! جب میں نے پہلی ہی رات تم سے کہہ دیا تھا کہ تم مجھ سے اپنا ہر دکھ شیئر کر سکتی ہو تو کیوں میرا بھروسہ نہیں کیا تم نے' کیوں نظر انداز کرتی رہیں مجھے اور حنان بھیا کو مجھ پر ترجیح دیتی رہیں، تم نے کبھی میری محبت کی پروا کی نہ میری ناراضی کی، تو پھر میں اور کیا کرتا جان؟ اور کوئی بھی تو راستہ نہیں تھا میرے پاس، سوائے تم سے خفا ہونے کے، مگر دیکھو، میں پاگل، ڈفر تم سے زیادہ دیر خفا بھی نہیں رہ سکا، اور جب مما نے فون پر مجھے بتایا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو میں نے اسی وقت چھٹی کے لیے اپلائی کر دیا اور آج چھٹی کا آرڈر ملتے ہی یہاں بھاگا آیا، اتنی بدحواسی میں کہ اپنا موبائل، اپنا والٹ اور اپنا کپڑوں کا بیگ وہیں کراچی میں اپنے فلیٹ کے اندر چھوڑ آیا اور صرف چھوٹا بیگ اٹھا کر یہاں دوڑ آیا، کتنی ہی دیر سے باہر دیوانوں کی طرح تمہیں تلاش کرتا رہا، پھر یہاں اس طرف آیا! پلیز ایمن، اب کبھی مجھ سے دور مت جانا، کبھی ان آنکھوں میں آنسو مت آنے دینا، کراچی میں پنکی بھابھی، جو غالباً تمہاری بہت بیسٹ فرینڈ رہ چکی ہیں، وہ بتا رہی تھیں کہ تم افسانوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی ہو اور یہ بھی کہ تمہیں ہینڈسم ہیرو بڑے اٹریکٹ کرتے ہیں، تو دیکھ لو تمہارا ہیرو کتنا ہینڈسم ہے، پلیز اب تو مسکرا دو۔''

اس کی بھیگی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ قدرے ہلکے پھلکے انداز میں بولا تو ایمن بے ساختہ ہی اس کی طرف دیکھتے ہوئے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

''کیا ہوا، میں ہینڈسم ہیرو نہیں ہوں کیا......؟''

اس کی بے ساختہ مسکراہٹ پر وہ انتہائی خوش ہونے کے ساتھ قدرے حیرانی سے

بولا تو ایمن نے ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیوں......؟'' بے حد چونک کر اس نے پوچھا تھا۔ جواب میں ایمن نے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا، پھر اس کے سامنے اپنا ہاتھ کیا تو وہاں سرخ رنگ لگا تھا، جو باہر شاید مذاق میں کسی نے اس کے گال پر لگا دیا تھا۔ ایمن کا رنگا ہوا ہاتھ دیکھ کر وہ خود بھی اس کے ساتھ کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

اذان نے اسے سحر بخاری کے بارے میں سب کچھ بتا دیا کہ وہ اس کی صرف فرینڈ تھی، جس کا اس کے دل میں سیریسلی کوئی مقام نہیں تھا۔ پھر جس وقت وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کھل کھلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے، حنان نے چونک کر انہیں دیکھا اور ایک دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلا کر پلکیں موند لیں کہ آج اس نے افسانوں کی دنیا میں رہنے والی ایک دیوانی لڑکی کو اس کا اصل ہیرو لوٹا دیا تھا۔





# تو بھی غبارِ راہ تھا......

محبت ہو اور مل بھی جائے ضروری نہیں
محبت کرنے والوں کے لیے ایسی ہی کہانی

موسم بے حد خوب صورت ہو رہا تھا' سبک روی سے چلتی ٹھنڈی معطر ہوائیں ماحول کی خنکی میں اضافہ کر رہی تھیں' ہلکا نیلا آسمان' سیاہ گھنگھور بادلوں کی لپیٹ میں گھرا ہوا تھا۔ اِرد گرد دکھائی دینے والے سرسبز پیڑوں کی شاخیں مست ہوا سے اٹھکیلیاں کرتیں بہت دِل فریب لگ رہی تھیں' قرب جوار میں پرندوں کی مسحور کن چہکاریں موسم کی خوب صورتی کو مزید حسن بخش رہی تھیں مگر عائشہ ازہان کی آنکھوں میں اس وقت خوب صورتی نہیں تھی۔

بکھرے بکھرے حلیے میں ملبوس' گرم شال بے ترتیبی سے کندھوں پر ڈالے' خالی نگاہوں سے اپنے شفاف ہاتھ کی لکیروں کو گھورتی وہ بے اُداس دکھائی دے رہی تھی۔ ڈوبتا اُبھرتا سورج اب آہستہ آہستہ اپنی نارنجی کرنیں سمیٹتا جیسے تھک کر اُفق کے پار غروب ہو رہا تھا۔ عائشہ ازہان کو اس لمحے اپنا دل بھی سورج کے ساتھ بے بسی سے ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سرخ سرخ سوجھی ہوئی آنکھوں سے نمکین آنسوؤں کے دو قطرے پھسل کر ہاتھ میں پکڑے نیوز پیپر کی اُس ہیڈ لائن پر جا گرے تھے جہاں ملک کے معروف ادیب ''عماد شاہ'' اور مشہور ماڈل ثانیہ نصیر کی حالیہ منگنی کی خبر بھرپور اہمیت کے ساتھ چھپی ہوئی تھی۔ ہیڈ لائن کے نیچے دیگر

تفصیلات درج تھیں۔

ادبی حلقے میں لوگ بڑے پیمانے پر عماد شاہ اور ثانیہ نصیر کے اس اقدام کو سراہ رہے تھے' مبارک باد کے پھول پیش کرتے ہوئے دونوں شعبوں سے وابستہ ہزاروں شخصیات مسرور دکھائی دے رہی تھیں' مگر عائشہ ازہان کا دل مسرور نہیں تھا' زندگی اسے اپنے اندر آخری سانس لیتے ہوئے محسوس ہو رہی تھی۔

یہ وہ لڑکی تھی جسے زندگی میں کبھی کسی چیز کے لیے ترسنا نہیں پڑا تھا۔ وہ بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کے ناتے سب اس کی خوشی کا خیال رکھتے تھے ماں باپ اور بھائیوں کے ساتھ ساتھ وہ خاندان والوں کی بھی لاڈلی تھی۔ سُبک روی سے چلتی زندگی میں کب بھونچال آیا اسے خبر ہی نہ ہو سکی۔ سورج کی نارنجی کرنیں گھنگھور بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئی تھیں تب ہی اس نے بے ساختہ آنسوؤں سے لبریز نگاہیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت خود کو کیسے سنبھالے؟

ہر ایک تدبیر اپنی رائیگاں ٹھہری محبت میں
کسی بھی خواب کو تعبیر کا رستہ نہیں ملتا
زمانے کو قرینے سے وہ اپنے ساتھ رکھتا ہے
مگر میرے لیے اس کو کوئی لمحہ نہیں ملتا

خالی نم نگاہیں ایک مرتبہ پھر ہاتھ میں پکڑے میگزین کے اس رنگین صفحے پر جم گئیں جہاں مختلف پوز میں ''عماد شاہ اور ثانیہ نصیر'' ایک ساتھ کھڑے مسکرا رہے تھے۔ دونوں کی شہرت کا ستارہ اپنے عروج پر تھا۔ اپنی اپنی فیلڈ میں دونوں ہی ہر دلِ عزیز تھے۔ دولت ان کے گھر کی باندی تھی' دونوں اپنی خوب صورتی میں بے مثال تھے' لہٰذا مقامی میگزین نے بہت تفصیل کے ساتھ ان کی نجی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے ملاپ کی داستان تحریر کی تھی جسے دونوں کے مداح بہت دلچسپی سے پڑھ رہے تھے۔

میگزین کے فرنٹ پیج پر لگنے والی بڑی سی تصویر میں بلیک کریپ کا نہایت اسٹائلش سوٹ زیب تن کیے ثانیہ نصیر کھڑی تھی' جبکہ کرتا شلوار میں ملبوس نہایت چارمنگ عماد شاہ کا دایاں ہاتھ اس کی نازک سی کمر کے گرد لپٹا صاف نظر آ رہا تھا۔ کوئی اس وقت عائشہ ازہان کے دل سے پوچھتا کہ وہاں کیسے کیسے طوفان مچل رہے تھے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے بڑھے



ہوئے ناخنوں سے اس تصویر کو کھرچتی وہ خود پارہ پارہ ہو رہی تھی۔

''تو تم میرے نصیب کا حصہ نہیں تھے عماد شاہ!'' کڑوے آنسوؤں کا زہر حلق میں انڈیلتی وہ آخر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

لوگ اب اپنے گھروں کو واپس پلٹ رہے تھے تب وہ بھی شکستہ قدموں سے خود کو گھسیٹتی ہوئی اپنی گاڑی کے قریب لے آئی۔ شدتِ ضبط سے سرخ آنکھیں آنسو لٹانے کو بے قرار ہو رہی تھیں' وہ جانتی تھی کہ اس نے زمین کا ذرہ ہو کر چاند کو چھونے کی تمنا کی تھی مگر...... اس کی سوچوں کا مرکز وہ چاند کسی اور کے آنگن میں چپ چاپ اتر گیا تھا۔

ابھی تھوڑے ہی عرصے پہلے زندگی کتنی خوب صورت تھی تب اس کے چہرے پر بھی گلاب کھلا کرتے تھے' سیاہ روشن آنکھوں میں چاند چمکا کرتا تھا' بات بات پر اس کے لب یوں کھلکھلا اٹھتے گویا بہاروں کا نزول ہو رہا ہو' سارا دن بڑے اور چھوٹے بھیا اسے ستاتے' وہ ان سے خوب جھگڑتی' روتی اور پھر ان کے بے تحاشا پیار پر فوراً مان بھی جاتی۔ ان دنوں زندگی میں دور دور تک کہیں کسی غم و فکر کا سایہ تک نہیں تھا۔ سکول سے گھر اور گھر سے سکول! یہی اس کی روٹین تھی' میٹرک کے پیپرز سے فارغ ہوئی تو ایک روز یوں ہی بوریت سے اکتا کر بازار سے عماد شاہ کی خوب صورت شاعری پر مبنی کتاب ''تنہا چاند'' خرید لائی۔ اردو ادب سے اسے کبھی کوئی خاص شغف نہیں رہا تھا مگر نہایت دیدہ زیب ٹائٹل سے مزین عماد شاہ کی خوب صورت کتاب ''تنہا چاند'' نے اسے اردو ادب سے قریب کر دیا۔ اسے آج تک کبھی کسی لکھاری کے الفاظ متاثر نہ کر سکے تھے مگر ''تنہا چاند'' میں تحریر عماد شاہ کے اشعار سے ٹپکتے گہرے درد نے اس کا ننھا سا دل اپنی گرفت میں لے لیا۔ اپنے ایک ایک لفظ میں اسے وہ سسکیاں لیتا دکھائی دیا تھا' وہ ساری رات بے قرار رہی۔ اگلے روز صبح ہی صبح اس کی بیسٹ فرینڈ مریم نے فون پر حال احوال دریافت کیا تو وہ اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''مریم...... کیا تم نے کبھی عماد شاہ کو پڑھا؟''

''ہاں...... ایک دو بار اس کے ناول نگاہ سے گزرے ہیں اچھا لکھتا ہے۔''

''مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''میں نے ابھی کل ہی اس کی شاعری پر مبنی کتاب ''تنہا چاند'' پڑھی ہے' آئی تھنک دنیا میں جتنے بھی خوب صورت لفظ ہیں سب عماد شاہ کے قلم سے نکلے ہیں۔'' اس کی اس درجہ

تعریف پر مریم نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

''خدا کا نام لو عاشی ...... اس دنیا میں عماد شاہ سے زیادہ خوب صورت لکھنے والے موجود ہیں۔''

''نہیں! لفظوں کو جتنی گہرائی سے سوچ کر وہ تخلیق کرتا ہے اتنی خوب صورت سوچ کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔'' اور اُس نے فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے مریم حفیظ کے الفاظ کی نفی کی تھی۔ جواب میں وہ ہنوز مسکراتے ہوئے بولی۔

''لگتا ہے موصوف کے الفاظ نے محترمہ کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا ہے' بہر حال ایک خوش خبری ہے تمہارے لیے......''

''کیا؟'' مریم کے الفاظ پر وہ تھوڑی دیر کے لیے پزل ہوئی۔

''محترمہ! شام کو میں اور بھابی کلفٹن جا رہے ہیں ہوا کھانے ......تم بھی ساتھ چلنا' بھابی اس بار حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے ہمیں ہماری پسند کا ڈنر کروانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔'' وہ چہکتے ہوئے بولی۔

''واقعی!'' وہ بھی اُچھل پڑی ویسے بھی اپنے روشنیوں کے شہر کراچی میں کلفٹن اس کا سب سے زیادہ پسندیدہ مقام تھا' لہٰذا اس اطلاع کے بعد پورا دن اس کا نہایت خوش گوار موڈ میں بسر ہوا تھا۔ شام میں وہ اپنی مما سے اجازت لے کر مریم کی طرف آئی تو وہ اپنی بھابی کے ساتھ اسے گھر سے باہر ہی مل گئی۔ موسم میں اب بھی خنکی کا احساس غالب تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوائیں جسم میں عجیب سی کپکپی دوڑا رہی تھیں مگر وہ تینوں موسم کی نازکی سے بے نیاز' آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے اپنی مطلوبہ جگہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

بھابی کی پرمزاح باتوں پر ہنس ہنس کر ان دونوں کا حال بُرا ہو رہا تھا کہ اچانک وہ بے دھیانی میں چلتے ہوئے سائیڈ سے گزرتی گاڑی کی زد میں آ گئی۔ گاڑی کی اسپیڈ زیادہ نہیں تھی اور پھر بریک بھی فوراً لگا دیے گئے تھے مگر اس کے باوجود وہ اچھل کر زمین پر گر پڑی' مریم اور اس کی بھابی جیسے ہی اس کی طرف لپکیں گاڑی میں بیٹھا وہ شخص بھی فوراً گاڑی سے باہر نکل آیا۔

''اوہ مائی گاڈ! کہنیاں تو کافی چھل گئی ہیں' پیشانی سے خون بھی بہہ رہا ہے۔'' مریم نے نہایت باریک بینی سے اس کے زخموں کا جائزہ لیا تھا' جب وہ ان کے قریب ہی زمین پر



بیٹھتے ہوئے بولا۔

''سوری! اگر آپ انصاف سے کام لیں تو اس حادثے میں مجھ سے زیادہ قصور آپ کا ہے' میں تو سیدھے سبھاؤ ڈرائیونگ کر رہا تھا' آپ بالکل اچانک سامنے آ گئیں'' مقابل شخص کی نہ صرف شخصیت اور ڈریسنگ غضب کی تھی بلکہ آواز بھی اچھی تھی۔

''اِٹس او کے! اب آپ یہاں سے جا سکتے ہیں۔'' وہ فوراً پلکیں جھکا کر مدہم لہجے میں بولی' کسی سے مرعوب ہونا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

''شکریہ! آپ نے مجھے بُرا بھلا نہیں کہا...... یہاں قریب ہی میرے ایک دوست کا چھوٹا سا کلینک ہے' آیئے آپ کی مرہم پٹی کروا دوں۔'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''نو تھینکس! اپنے زخموں کا علاج ہم خود کر لیں گے۔''

وہ ہمت کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی تو مجبوراً مقابل کو بھی اسے اس کے حال پر چھوڑنا پڑا' کچھ روز بہ خیر و عافیت گزر گئے کہ ایک روز پھر مریم نے اس کی ذہنی رو بھٹکا دی۔

''عاشی! تمہارے لیے بہت زبردست نیوز ہے۔'' وہ فون پر تھی' مگر عائشہ ازہان اسے تصور میں اپنے سامنے خوش ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

''زبردست نیوز زیادہ دیر پیٹ میں نہیں رکھنی چاہیے نقصان ہوتا ہے' اب بولو کیا نیوز ہے تمہارے پاس!'' وہ مسکرا کر بولی۔

''وہ تمہارا ہیرو ہے نا کیا نام ہے اس کا؟ ہاں عماد شاہ اس کا بڑا زبردست ناول آیا ہے مارکیٹ میں۔''

''رئیلی۔'' مریم کی اطلاع پر وہ ایک مرتبہ پھر خوشی سے اچھل پڑی۔

''ہاں! میں نے خود ٹائٹل پر اس کا نام دیکھا ہے کیا زبردست نام رکھا ہے اس نے اپنی کتاب کا ''دردِ شناسائی۔''

کتاب اس کی دسترس میں آئی تو گویا وہ اپنا آپ بھی بھلا بیٹھی۔ اس قدر گہرائی' لفظ لفظ سے ٹپکتا درد' احساسِ محرومی! اسے پتا ہی نہ چلا۔ کا کہ کب عماد شاہ اپنی تحریر کے ذریعے اس کے دل میں گھر کر گیا۔ ''دردِ شناسائی'' پڑھنے کے بعد وہ عماد شاہ کو اپنا آئیڈیل تسلیم کر بیٹھی تھی حالانکہ اس نے ابھی اسے ایک نظر دیکھنے کا اعزاز بھی نہیں سمیٹا تھا۔ گھر میں سب ہی اس کی اس تبدیلی کو محسوس کر رہے تھے پہلے جو ایک منٹ سکون سے بیٹھنا گوارہ نہیں کرتی تھی اب

ہمہ وقت اپنے کمرے میں گھسی کتاب پڑھتی رہی۔

بڑے بھیا نوید اور چھوٹے بھیا معید کو جوں ہی ''عماد شاہ'' سے اس کا دل چسپی کے متعلق علم ہوا وہ اس کا خوب ریکارڈ لگانے لگے' اُٹھتے بیٹھتے وہ ''عماد شاہ'' کا نام لے کر اسے چڑانا نہیں بھولتے تھے۔ اپنی پڑھائی کی طرف سے بھی اس کا دھیان ہٹ گیا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گھر والوں نے اس پر کسی بھی قسم کے ناول اور شاعری کی کتابیں پڑھنے پر پابندی لگا دی۔

''دردِ شناسائی'' کے بعد عماد شاہ کا نیا ایڈیشن ''صحرا میں آبلہ پائی'' کے عنوان سے آیا اور بے شک اس ایڈیشن نے بھی ادبی دنیا میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ جانے کیوں عائشہ کو وہ پہلے سے زیادہ دل کے قریب آتا محسوس ہوا۔ آج تک اس نے کسی کتاب پر اپنی تصویر شائع نہیں کروائی تھی کبھی کسی سیمینار یا مشاعرے میں اس کی شرکت کی روداد بھی پڑھنے کو نہیں ملی تھی مگر اس کے باوجود لوگ اس کی شخصیت پر فدا تھے اور ان کروڑوں لوگوں میں بے شک عائشہ ازہان پہلے نمبر پر تھی۔

مریم اس کی دیوانگی دیکھ کر اکثر افسوس سے کہا کرتی۔

''تم مانو یا نہ مانو' لیکن یہ تمہارا عماد شاہ ضرور ایسی شکل و صورت کا مالک ہے جو قابلِ قبول بھی نہ ہو' جب ہی تو وہ دنیا کے سامنے آنے سے ڈرتا ہے وہ ان سب محبتوں کے چھن جانے سے خوف زدہ ہے۔ یہ قلمی لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں تمہارے میرے جیسے سادہ دِل والوں کو پاگل بنانے والے' اپنے اندر کی محرومیوں کا غبار لفظوں میں ڈھال کر لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے والے' میرا کہا مانو اور اس کے خواب دیکھنا چھوڑ دو۔''

''وہ چاہے جیسا بھی ہے میرا خواب ہے عاشی!'' جواب میں وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہتی۔

''او گاڈ! تجھ پر تو اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے حالانکہ تو خود کتنی حسین ہے شاید تجھے بھی اس کی خبر نہیں' ذرا یہ سوچو کہاں وہ ادب کی دنیا میں سب سے اُونچا چمکتا دمکتا ستارہ اور کہاں تُو! فقط ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھنے والی گم نام لڑکی! کیا تمہارا اور اس کا ملن ہو سکتا ہے؟'' مریم کا یہ سوال اسے واقعی الجھا کر رکھ دیتا تھا۔ مگر وہ ہمیشہ سکون سے اپنے ہاتھوں کی لکیروں پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے خاصے مدھم لہجے میں کہتی۔

''مجھے خدا کی قدرت پر بڑا بھروسا ہے مریم! لاکھ وہ میری دسترس سے دور سہی' مگر



میں اس کے لیے اپنے اللہ کے حضور اتنا گڑگڑاؤں گی کہ آخر اُسے عماد شاہ کو میرے نصیب کا حصہ بنانا ہی پڑے گا۔'' خدائے پاک کی ذات پر کامل یقین کے باعث وہ عماد شاہ کی تصوراتی محبت کی دلدل میں گزرتے ہر لمحے کے ساتھ جیسے دھنستی ہی چلی جا رہی تھی۔

''صحرا میں آبلہ پائی'' کے بعد عماد شاہ نے ''اپنی ذات کا سفر'' کے عنوان سے ایک شاعری کی کتاب تخلیق کی۔

''اپنی ذات کا سفر'' کے ہر ہر لفظ میں وہ اسے ٹوٹتا' بکھرتا' سسکتا دکھائی دیا...... لہٰذا پہلی بار عائشہ نے قلم سنبھال کر کوئی سینکڑوں کاغذ ضائع کرنے کے بعد اس کے نام اپنا پیار بھرا خط لکھا جس میں اس کی شاعری اور ناول نگاری کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس نے اس کی ذات سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کیا۔ مگر افسوس کہ اتنی محنت سے خط تحریر کرنے کے بعد وہ اسے عماد شاہ کے نام پوسٹ کرنے کا حوصلہ نہ کر پائی' اور اسے اپنی ہی پرسنل ڈائری میں مقید کر کے رکھ دیا۔

کچھ ماہ سکون سے گزر گئے چند ماہ بعد جب اس نے ''خوشبو کا پیرہن'' میں اپنے سینکڑوں مداحوں کی فرمائش پر ابتدائی چند صفحات میں اس نے لکھا تھا۔

''دوستو! میں اللہ کی پاک و بے نیاز ذات کے بعد آپ سب کی محبتوں' چاہتوں اور خلوص کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ آپ کی پسندیدگی نے مجھ جیسے بے ہنر کو دِل میں اُتر جانے کا ہنر بخش دیا۔ کل تک جس کی کوئی پہچان نہیں تھی اسے پبلک فگر بنا دیا' میں ہمیشہ آپ کی ان چاہتوں کا قدردان رہوں گا لیکن اس کے باوجود مجھے آپ سب سے یہ کہتے ہوئے ازحد شرمندگی ہو رہی ہے کہ باوجود آپ سب کی شدید خواہش کے میں منظرِ عام پر آ کر سستی شہرت سمیٹنا نہیں چاہتا' مجھے اپنی ذات کے قلعے میں بند رہ کر ہی زیادہ سکون ملتا ہے۔ میں نے زندگی کے بہت سے روپ دیکھے ہیں یہ جتنا ہنساتی ہے اس سے زیادہ رُلاتی ہے۔ آج اگر میں اپنے عروج پر مسرور ہوں تو اکیلا ہی اس کا سامنا کروں گا۔ سب کے سامنے رونا' ہمدردیاں سمیٹنا یا خوش ہونا مجھے گوارا نہیں...... میں چاہتا ہوں کہ لوگ میری ذات کی خوبیوں اور خامیوں کی وجہ سے مجھے پہچانیں اور اگر کوئی مجھے چھوڑ کر جائے تو میرے ادبی زوال کی وجہ سے نہیں بلکہ میری ذاتی خامیوں کی وجہ سے چھوڑے' کون میرے ساتھ کتنا مخلص ہے میں گم نامی میں ہی اس کی پرکھ کرنا چاہتا ہوں۔ بہر حال میرے لفظوں کو سراہنے کا ایک مرتبہ پھر بہت شکریہ۔'' آخر میں اس

نظم کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ:

ایسے چپ چاپ ہی مر جاتے ہیں کچھ لوگ یہاں
جسم کی ٹھنڈی سیاہ تاریک قبر کے اندر
نہ کسی سانس کی آواز نہ سسکی کوئی
نہ کوئی آہ' نہ جنبش' نہ ہی آہٹ کوئی
ایسے چپ چاپ ہی مر جاتے ہیں کچھ لوگ یہاں
ان کو دفنانے کی زحمت بھی نہیں کرنی پڑے

ہر روز رات کو تمام کاموں سے فارغ ہو کر عائشہ کو عماد شاہ کے نام خط لکھنا بے حد اچھا لگتا تھا۔ وہ دن رات اس کے خیالوں میں گم رہنے لگی تھی۔

خدا خدا کر کے اس نے بی اے کلیئر کیا تو گھر والوں نے زبردستی اسے یونی ورسٹی میں ایڈمیشن دلوا دیا۔ وہ اب مزید تعلیم میں دماغ کھپانے کے حق میں نہیں تھی مگر اس کے والد حنیف صاحب اور بھائیوں کے آگے اس کی ایک نہ چلی اور یوں اسے یونی ورسٹی کا ڈھول زبردستی گلے میں ڈال کر بجانا ہی پڑا۔ مریم کی پچھلے دنوں شادی ہو گئی تھی لہٰذا ایک تو اکیلے پن کا احساس' دوسرے یونی ورسٹی کا آزاد ماحول' وہ کسی طرح بہل نہیں رہی تھی' تاہم یہ کیفیت زیادہ دنوں تک نہ رہ سکی کیوں کہ یونی ورسٹی میں ''فرحان عباسی'' کے روپ میں اُسے اپنا مزاج آشنا اور نہایت مخلص دوست میسر آ گیا تھا اس روز وہ اداس سی یونی ورسٹی کے لان سے ملحقہ سیڑھیوں پر بیٹھی عماد شاہ کے متعلق سوچ رہی تھی جب اچانک وہ چپکے سے' قدرے فاصلے پر اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔

''السلام علیکم! مس عائشہ' کیسی ہیں آپ!'' قطعی غیر مانوس آواز پر وہ چونکی' لیکن پھر فرحان عباسی کے مسکراتے چہرے کی طرف بہ غور دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ؟ لگتا ہے میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔''

''ضرور دیکھا ہوگا...... میں حجاب نہیں لیتا۔'' بلا کا حاضر دماغ اور خوش مزاج شخص تھا وہ' عائشہ' پل بھر کو خجل ہوئی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' گردن جھکا کر بہت آہستہ سے اس نے کہا۔

''میں نے کب کہا کہ آپ کا یہ مطلب تھا' بہر حال میں یاد کروا دیتا ہوں کہ آپ



نے مجھے کہاں دیکھا تھا تقریباً ایک سال پہلے کلفٹن کے قریب ایک معمولی ایکسیڈنٹ کے باعث میرا آپ سے ٹکراؤ ہوا تھا' کچھ یاد آیا......؟'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے دل کشی سے مسکرا کر بولا۔ تو اس کی یاد دہانی پر قدرے حیران ہوتے ہوئے ہمیشہ نے اس بار محض اثبات میں سر ہلانا ہی کافی سمجھا۔

''آپ بہت مختلف لڑکی ہیں عائشہ! پچھلے کئی روز سے میں آپ کو دیکھ رہا ہوں' پڑھ رہا ہوں' آپ میں عام لڑکیوں جیسی کوئی بات ہی نہیں۔'' پتا نہیں وہ واقعی اس کی تعریف کر رہا تھا یا شیشے میں اتار رہا تھا مگر عائشہ کو یوں سادا سے انداز میں اپنی تعریف بے حد بھلی لگی۔

''اچھا! میں نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا۔'' وہ مسحور کن انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

''محسوس کیسے کریں گی' حسن کی کج ادائیاں اور غرور تو عالم میں مشہور ہے۔'' اس کی نظروں کے ارتکاز میں قطعی کوئی فرق نہیں آیا تھا مگر عائشہ از ہاں ضرور کھلکھلا اُٹھی۔

''اوہ! اس کا مطلب ہے میں کافی حسین ہوں۔''

''بالکل! کم سے کم میرا تو یہی خیال ہے۔''

''باتیں اچھی کر لیتے ہیں آپ!''

''صرف باتیں نہیں! میں کتابیں بھی اچھی چاٹ لیتا ہوں' شاید اسی لیے کالج سے یونی ورسٹی تک ٹاپ پوزیشن ہولڈر اسٹوڈنٹس میں سرِ فہرست رہا ہوں۔''

''اچھی بات ہے' آپ واقعی دل چسپ انسان ہیں۔''

وہ دل سے اس کی خوش مزاجی' قابلیت اور ذہانت کی معترف ہوئی اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ' ان کی دوستی بڑھتی گئی۔ یونی ورسٹی میں فرحان کی دل چسپ باتیں اسے کبھی بور ہونے ہی نہیں دیتی تھیں۔ وہ اس سے ایک سال سینئر تھا اس کا ڈیپارٹمنٹ بھی الگ تھا مگر پھر بھی وہ فرصت کے لمحات اس کی کمپنی میں گزارنا پسند کرتا تھا۔

وہ یونی ورسٹی میں فری پیریڈ کے دوران باہر بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ فرحان نے قریب آ کر خاصی بلند آواز میں اسے ڈرایا' جواب میں کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔

''شرم کرو کچھ' ابھی میرا ہارٹ فیل ہو جاتا تو......'' خاصی خفگی سے اس نے کہا' تو وہ عماد شاہ کی کتاب اٹھا کر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''تو کیا ہو جاتا! ہم فوراً اپنے دل سے آپ کا دل بدل دیتے۔''

"باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے......" اس بار اس کے انداز پر وہ کھلکھلا اٹھا تھا۔

"کیا پڑھ رہی تھیں اتنی مگن ہو کر' تمہیں میرے آنے کا احساس بھی نہ ہو سکا......" اب وہ شکوہ کر رہا تھا' مگر عائشہ نے زیادہ پروا نہیں کی اور اس سے کتاب لیتے ہوئے مزے سے بولی۔

"عماد شاہ کو پڑھ رہی تھی' نام سنا ہے کبھی اس کا؟"

"بالکل سنا ہے' وہ شخص تو زبان زدِ عام ہے بھئی!"

"کیوں نہ ہو' اللہ نے اس کے اندر صلاحیتیں ہی ایسی دی ہیں کہ وہ ہاتھ بڑھا کر چاہے تو آسمان کو چھو لے......"

عماد شاہ کا تذکرہ ہو اور وہ اس کی تعریف نہ کرے' بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔

"بس کرو' کسی اور نے سن لیا تو تم پر پاگل ہونے کا شبہ کرنے لگے گا۔" وہ دھیمے سے مسکرایا۔

"کیوں! اس میں پاگل پن والی کون سی بات ہے؟ ساری دنیا شیدائی ہے اس کی۔"

"یا اللہ! یونیورسٹی کی چھت ہی نہ گر پڑے' ویسے بی بی آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اسے ساری دنیا میں پڑھے جانے کا اعزاز بھی حاصل نہیں ہوا۔" عائشہ کا تپا ہوا لہجہ اُسے لطف دے رہا تھا تبھی اس نے اسے گھورا۔

"اسے چھوڑو' یہ بتاؤ یہ بی بی کسے کہا ہے تم نے؟" اس بار وہ خود کھلکھلانے سے نہ روک پایا۔

"خدا کا نام لو یار! میں نے تو یونہی تہذیباً بات کی ہے۔"

"لیکن مجھے ایسے تہذیب گوارہ نہیں۔" وہی اس کا روٹھا روٹھا سا دِل رُبا انداز۔

"او کے سوری! وعدہ رہا آئندہ کبھی تمہیں "بی بی" نہیں کہوں گا......" ہنوز مسکراتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا کر اس نے ایکسکیوز کیا تو عائشہ کے چہرے کا تناؤ بھی کم ہو گیا۔

اور پھر ایسا اکثر ہی ہونے لگا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بات کا بہانہ بنا کر وہ روٹھتی اور فرحان اسے منانے لگ جاتا دونوں میں بہت انڈراسٹینڈنگ ہونے کے باوجود ایک بات پر ہمیشہ اختلاف ہو جاتا تھا اور وہ بات تھی عماد شاہ کی سحرانگیز شخصیت کے ساتھ عائشہ ازہان کا حد درجہ لگاؤ۔

ان ہی دنوں عماد شاہ کی نئی کتاب "گرد آلود" کے نام سے مارکیٹ میں آئی۔ عائشہ ان دنوں اتنی خوش تھی کہ اس نے اپنی خوشی میں فرحان عباسی کو بھی فراموش کر دیا تھا جو ناسازی



طبع کی بناہ پر پچھلے کئی روز سے یونی ورسٹی نہیں آ رہا تھا۔ وہ جو اس کے کانٹا چبھ جانے پر بھی تڑپ اُٹھتا تھا اسی فرحان عباسی کے شدید بخار میں مبتلا ہونے پر بھی وہ اسے تسلی و تشفی کا ایک لفظ تک کہنے کی فرصت نہیں نکال پائی۔

"گرد آلود" میں عماد شاہ نے ایک مرتبہ پھر اپنے مداحوں کے اصرار پر کتاب کے ابتدائی صفحات پر حاضری دی تھی' اپنے انتہائی خوب صورت الفاظ میں قارئین سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

"دوستو! کافی عرصے سے میں آپ کی فرمائش پسِ پشت ڈالتا آ رہا ہوں' خود کو اپنی ذات میں مقید رکھتا آ رہا ہوں لیکن اب میرے بارے میں کچھ نہ کچھ جاننے کی آپ کی خواہش اتنی بڑھ چکی ہے کہ مزید اسے نظر انداز کرنا میرے اختیار میں نہیں رہا...... اپنی زندگی کے حالات و واقعات کے بارے میں کیا بتاؤں؟ کنول کے پھول کی مانند کیچڑ میں بھلا۔ غربت اور لاچاری جیسے میرے گھر کی باندیاں تھیں' قطرہ قطرہ زندگی کا زہر پیتے ہوئے شعور کی دہلیز تک پہنچا تو سر سے والد صاحب کا پُرشفیق سایہ اٹھ گیا ماں پچھلے کئی سالوں سے بیمار تھی مگر گھر میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں ان کا مناسب علاج کروا کر اپنے اس قیمتی اثاثے کو بچا سکتا...... زندگی کی حقیقی بے رحمی کو نہایت قریب سے میں نے اس وقت محسوس کیا جب میری ماں' میری آنکھوں کے سامنے ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی...... ماں کی آنکھیں کیا بند ہوئیں مجھے لگا میں زندگی کے لق و دق تپتے صحرا میں آبلہ پا کھڑا ہوں' عجیب بے بسی تھی۔ اپنی شاعری کا آغاز میں نے انھی دنوں میں کیا تھا۔ اپنا ایک ایک شعر شب کی تاریکی میں' خونِ دل سے سینچ کر مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے کاغذ کے ان بے جان ٹکڑوں نے میرا درد بانٹ لیا ہو' پہلی بار جب ایک مقامی رسالے میں میری نظم "آنکھ آنسو اور بارش" شائع ہوئی تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا' زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ تقدیر مجھے یوں اتنے بلند مقام تک بھی لے آئے گی...... آج بہ ظاہر میری زندگی میں کوئی کمی نہیں لیکن گزرے ہوئے ایام کا درد آج بھی میرے دِل سے ٹپک کر قلم میں اُتر آتا ہے دِل کا یہ ٹوٹا پھوٹا بنجر سا مکان آج بھی خالی ہے' کاش کوئی پیاری سی لڑکی ملے اور اِسے آکر آباد کر دے...... وقت کا انتظار...... آپ سب کا اپنا عماد شاہ!"

عائشہ کو لگا کہ عماد شاہ نے یہ سب کچھ محض اُس کے لیے لکھا ہے لہٰذا ہواؤں پر رقص کرتے ہوئے ان دنوں پھر کتنے ہی خط اس کے قلم سے تحریر ہو کر اِس کی پرسنل

ڈائری میں مقید ہو گئے۔

ذہن سے عماد شاہ کا خمار معمولی سا اُترا تو اسے فرحان عباسی کی یاد آئی جو اس سے شدید خفا ہونے کے باوجود بھی اس کی معذرت اور شرمندگی کے احساس پر اس سے مزید خفا نہیں رہ سکا تھا۔ ایک بات جو وہ پچھلے کئی ہفتوں سے نوٹ کر رہی تھی' خاصی حیران کن تھی فرحان عباسی اب زیادہ تر چپ چپ رہنے لگا تھا۔ اس کے مزاج کی شوخی اور برجستگی نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ عائشہ جانتی تھی کہ پورا کالج اس پر فدا ہے' یونی ورسٹی کی حسین سے حسین لڑکی بھی اس کی رفاقت کے خواب دیکھتی تھی۔ وہ صرف مسکرا کر اگر کسی لڑکی کی طرف دیکھ لیتا تھا تو اس لڑکی سے اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالنا دشوار ہو جاتا تھا۔ سب اس کی ذہانت اور قابلیت کو سراہتے تھے اس کے باوجود اس کے اداس رہنے پر وہ حیران نہ ہوتی تو اور کیا کرتی......

البتہ فرحان عباسی کے محض اپنی طرف ہی جھکاؤ پر کبھی کبھی وہ خود بھی بہت حیران ہوتی تھی۔ بہت بار ایسا ہوا کہ فرحان نے اس کے ساتھ میچ کر کے ڈریسنگ کی' بہانے بہانے سے اسے نفیس اور ان مول گفٹس دیئے' کبھی اس کی طبیعت ٹھیک نہ ہوتی یا موڈ آف ہوتا تو دل لگا کر نہایت نفاست کے ساتھ اس کے نوٹس اور اسائمنٹ بھی بنا دیتا۔ یونی ورسٹی کا کوئی لڑکا ترچھی نگاہ سے اس کی طرف دیکھ لیتا تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتا۔ عائشہ اس کے اس جنون کو بھی محض دوستی سے مشروط رکھتی آئی تھی۔

لیکن اب اس کا بدلہ ہوا رویہ واقعی حیران کن تھا۔

اس روز وہ مزید صبر نہ کر سکی تو اس سے پوچھ ہی بیٹھی۔

''فانی! آر یو اوکے؟''

''بالکل! کیا تمہیں بیمار دکھائی دیتا ہوں؟''

''ہاں۔'' اس کے روبرو کہنے پر اس نے اداسی سے سر ہلایا۔

''تو علاج کر دو نا یار! سوچ کیا رہی ہو؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''پہلے بیماری کا تو پتا چلے...... پھر علاج بھی کر دوں گی۔'' اِس بار عائشہ نے اُسے جواب دیا۔

''بہت خوب! لیکن مرض کی تشخیص کرنا بھی تو مسیحا کے ذمے ہے۔''

''ہاں! لیکن مریض اگر نہایت ڈھیٹ واقع ہوا ہو تو بیچارہ مسیحا بھی کچھ نہیں کر



سکتا۔'' اس بار وہ خوب کھل کر کھلکھلایا۔

''مسیحا اس دل پر ہاتھ رکھ کر تشخیص کرنے کی کوشش تو کرے...... مریض کی ساری بیماریاں یوں چٹکی میں بھاگ جائیں گی۔'' باقاعدہ چٹکی بجاتے ہوئے اس نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ عائشہ چند لمحوں تک کچھ بول ہی نہ سکی۔

''بات کو ٹالنے کی کوشش مت کرو فانی!''

''ٹال کون کافر رہا ہے سوئیٹ عاشی!'' اُسی کے انداز میں جواب لوٹاتے ہوئے وہ پھر مسکرایا۔

''کوئی لڑکی وڑکی کا چکر ہے کیا؟'' وہ مشکوک نگاہوں سے اُسے گھورتے ہوئے بولی۔

''ہاں ہے پھر؟ تم کیا کر لوگی؟'' وہ کہاں اس کے ہاتھ آنے والا تھا۔

''کون ہے وہ؟ بتاؤ مجھے' آج ہی تمہارا رشتہ لے کر گھر پہنچتی ہوں اس کے۔''

عائشہ کے اس انداز پر ایک مرتبہ پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''اوکے! میرے خیال سے ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے' تم چلو شاباش جا کر کلاس اٹینڈ کرو اپنی۔''

''نہیں کرنی کلاس اٹینڈ' میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔''

''سارا دن فضول سوچوں میں اُلجھی رہو گی تو درد تو ہو گا ہی...... خیر لاؤ دبا دیتا ہوں۔''

''رہنے دو۔ جب تم مجھے اپنی دوست ہی نہیں سمجھتے تو یہ بے کار کی ہمدردیاں جتانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ قدرے خفا ہوئی مگر اس بار فرحان عباسی نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

''اوکے! ایز یو وش! میں گھر جا رہا ہوں۔ تمہیں بھی چلنا ہے تو آؤ ڈراپ کر دیتا ہوں' ورنہ یوں ہی اکیلی بیٹھی بور ہوتی رہو گی......''

''تمہیں اس سے کیا...... تم جاؤ اپنا کام کرو مجھے گھر ڈراپ کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔'' وہ جل ہی تو گئی تھی اس کی بے نیازی پر...... اور یہ جلن اس وقت مزید بڑھ گئی جب وہ مسکرا کر کندھے اچکاتا ہوا واقعی وہاں سے چلا گیا۔

''بے حس' بدتمیز! خود کو پتا نہیں سمجھتا کیا ہے خواہ مخواہ لڑکیوں نے اس کے مزاج آسمان سے لگا دیے ہیں مجھے بھی ان ہی لڑکیوں کی صف میں شمار کرنے لگا ہے بے وقوف!''

اُس کے جانے کے بعد تھوڑی دیر تک بیٹھی وہ یوں ہی بڑبڑاتے ہوئے دِل کا غصہ نکالتی رہی' پھر خود بھی اُٹھ کر گھر جانے کے لیے یونی ورسٹی سے نکل آئی۔

اُس روز وہ اپنے کمرے میں بیٹھی خاصی بور ہو رہی تھی تب اچانک ہی اس کا دل عماد شاہ سے رابطہ کرنے کے لیے مچل اٹھا۔ ابھی حال ہی میں اس کی شاعری پر مبنی جو کتاب ''گرد آلود'' کے نام سے شائع ہوئی تھی اس کتاب میں چھپے کمپنی کے نمبر پر دھڑکتے دِل سے اس نے بیل دے ڈالی۔

''ہیلو!'' السلام علیکم سر! میں کراچی سے عائشہ ازہان بات کر رہی ہوں۔'' بھاری آواز کے جواب میں قدرے نروس ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

''جی فرمایئے کیسے فون کیا آپ نے؟'' دوسری جانب سے سپاٹ لہجے میں کہا گیا۔

''وہ...... دراصل! بات یہ ہے سر کہ میں عماد شاہ صاحب کی بہت بڑی فین ہوں۔'' اپنا مدعا بیان کرنا اِس وقت اسے نہایت دشوار لگا۔

''مم...... میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں' صرف ایک بار پلیز!''

''سوری میڈم! عماد شاہ اپنے کسی بھی فین سے براہ راست ملنا یا بات کرنا پسند نہیں کرتے۔'' اسے حسب توقع جواب ملا تھا' مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔

''مم...... میں جانتی ہوں سر! لیکن میرا ان سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔''

''اوکے! آپ اپنا رابطہ نمبر دے دیجیے' عماد شاہ کو دے دیا جائے گا...... وہ چاہیں گے تو خود آپ سے رابطہ کرلیں گے۔''

''تھینک یو سو مچ! کتنے دِنوں میں رابطہ کریں گے؟''

اس سے تو اپنی منتشر دھڑکنوں پر قابو پانا دشوار ہو گیا تھا۔

''سوری محترمہ! اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے آج کل وہ آؤٹ آف کنٹری ہیں جیسے ہی آئیں گے آپ کا پیغام اور نمبر انہیں دے دیا جائے گا......'' دوسری جانب سے بات مکمل ہوتے ہی فون رکھ دیا گیا تھا۔

''کون تھی؟''

''پتا نہیں! عماد شاہ کی کوئی فین تھی عائشہ ازہان!''

معید اور باسم دونوں آر کے پبلشنگ کمپنی سے منسلک تھے اور اِس وقت اتفاقاً وہ



دونوں ہی اپنے ڈیڈی کے آفس میں بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے لہٰذا عائشہ کا فون کمپنی کے مالک نواز صاحب کے بجائے باسم نے اٹینڈ کرلیا تھا' مزاجاً وہ کافی سنجیدہ لڑکا تھا' مگر اس وقت ایک تو مذاق کے موڈ میں بیٹھے تھے دوسرے عائشہ کی گھبراہٹ اور کپکپاتے لہجے نے انہیں خاصا لطف دیا تھا اب وہ دونوں اسی ٹاپک پر ڈسکشن کر رہے تھے۔

''سنی! کیا خیال ہ' اس محترمہ سے عماد شاہ بن کر بات نہ کی جائے؟'' معید نے مسکراتی نظروں سے باسم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''چھوڑ یار! پاپا کو پتا چل گیا تو شامت آجائے گی۔'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے متبسم لہجے میں بولا۔

''لیکن میں کچھ غلط نہیں کروں گا' بس کبھی کبھار مختصر بات ہی ہوگی...... پاپا یا عماد شاہ کو کیا پتا چلے گا' اس لڑکی کا رابطہ تو صرف مجھ سے رہے گا۔''

''پھر بھی معید! کسی لڑکی کے نازک جذبات سے کھیلنا اچھی بات نہیں۔''

''تو تو سمجھتا ہے میں اس کے ساتھ پیار محبت کی پینگیں بڑھاؤں گا' ہوٹلنگ کروں گا...... کم آن یار! ایسا گرا پڑا نہیں ہوں میں' بس ایک دو بار عماد شاہ بن کر اس کے احساسات جاننے کی کوشش کروں گا پھر الگ ہو جاؤں گا اس میں ابلم کیا ہے۔''

''اوکے! جیسا تو مناسب سمجھتا ہے کر لیکن مجھے اس معاملے سے الگ ہی رکھ......'' باسم نے سرسری لہجے میں کہتے ہوئے اپنا کوٹ اُٹھایا اور آفس سے باہر نکل گیا جب کہ معید میز پر پڑی اس پرچی کا مشاہدہ کرنے لگا جس پر ابھی باسم عائشہ ازہان کا رابطہ نمبر لکھ کر رکھ گیا تھا۔

اس تمام کہانی سے بے خبر عائشہ اس روز گویا ہواؤں میں اُڑ رہی تھی' جانے کیوں اس کے دل کو پرا یقین تھا کہ عماد شاہ اس سے رابطہ ضرور کرے گا...... اس شخص کے لیے اپنے اللہ کے حضور جتنی دعائیں اس نے مانگی تھیں ان دعاؤں کی قبولیت پر اسے صد فیصد یقین تھا۔

اور پھر واقعی اس کا یہ یقین ٹوٹا نہیں...... دن بھر از حد مسرور رہنے کے بعد رات میں جب وہ اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹی تو اس کے پرسنل سیل کی اسکرین پر اُبھرنے والا قطعی اجنبی نمبر اس کی سانسوں کو الجھا گیا۔ جانے مدہوشی اور بے یقینی کے کس عالم میں اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ کال پک کی۔

"السلام علیکم!" کال پک ہوتے ہی دوسری جانب سے نہایت خوب صورت مردانہ آواز میں سلام کیا گیا تھا جس پر وہ مزید نروس ہو کر رہ گئی۔

"وعلیکم السلام! کون؟" مری مری سی آواز میں بہ مشکل وہ پوچھ پائی۔

"عماد شاہ بات کر رہا ہوں' آپ عائشہ ازہان ہیں۔"

اُس لمحے یقیناً وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔

"ہیلو! آپ کچھ بول کیوں نہیں رہیں۔" مقابل کی آواز اتنی نرم اور اپنائیت بھری تھی کہ آخر اس کی ساری گھبراہٹ ختم ہوتی گئی۔

"مم...... مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ میری آپ سے بات ہو رہی ہے۔" کپکپاتے لہجے میں اس نے کہا۔

"ایسا مت سوچیں...... میں بھی اسی خدا کا پیدا کردہ معمولی سا انسان ہوں جس خدا نے آپ کو تخلیق کیا ہے بہر حال فرمائیے کیا ضروری بات کرنی تھی آپ کو...... میں آج ہی یو کے سے واپس آیا ہوں۔" وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"اصل میں' میں آپ کو بتانا چاہتی تھی کہ میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں' فین کیا بلکہ اے سی ہوں' آپ کی شخصیت' آپ کے ناولز' شاعری سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے مجھے...... میری فرینڈز مجھے پاگل کہتی ہیں۔"

"آئی سی' کیا کرتی ہیں آپ!" دوسری طرف سے دھیمے سے تبسم کے بعد پوچھا گیا' تب ہی وہ اپنا ازلی اعتماد بحال کرتے ہوئے بولی۔

"میں انگلش میں ماسٹرز کر رہی ہوں' لیکن اپنی سلیبس کی کتابوں سے بھی زیادہ میں آپ کی کتابوں کو پڑھتی ہوں اور کسی قیمتی متاع کی مانند خوب سنبھال سنبھال کر رکھتی ہوں۔"

"ویری گڈ! مجھے ذہین لڑکیاں بہت اپیل کرتی ہیں۔"

دوسری طرف سے ستائشی انداز میں کہا گیا تو عائشہ کے پورے بدن میں جیسے بجلی سی کوند گئی۔

"تھینکس! آپ سے ایک پرسنل سوال پوچھوں مائنڈ تو نہیں کریں گے۔"

"آپ سوال پوچھیے' میں اپنے چاہنے والوں کی کسی بات کو مائنڈ نہیں کرتا۔"

"اگین تھینکس! مجھے آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں



کی؟" اس بار دوسری طرف وہ خاصے بھرپور انداز میں کھلکھلایا پھر جلد ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"بس یوں ہی! کبھی کوئی آپ جیسی چاہنے والی پیاری سی' سادا دل لڑکی ہی نہیں ملی' سب میری شہرت اور نام پر مرتے ہیں لیکن مجھے اپنی ذات کے لیے نہایت مخلص لڑکی چاہیے جو ہر موسم میں میری ساتھی ہو' جس دن کوئی ایسی لڑکی مل گئی' شادی بھی کر لوں گا......" عائشہ کا دل اس لمحے پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہو رہا تھا تاہم اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی' دوسری جانب سے اُبھرتی مدھر آواز نے پھر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"او کے مس عائشہ! اللہ نے چاہا تو پھر آپ سے رابطہ ہوگا' فی الحال اجازت سے قبل صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ مجھ سے رابطے کا ذکر کسی سے بھی نہ کیجیے گا' اپنی خاص فرینڈز سے بھی نہیں' پلیز!"

"او کے......" اس کے پورے وجود پر جیسے جمود طاری ہو گیا تھا' وہ ابھی اس سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتی تھی مگر دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔

اگلے دو تین روز وہ اپنے حال میں اتنی مست رہی کہ یونی ورسٹی بھی نہ جا سکی۔ یونی ورسٹی میں ان دنوں ویسے بھی بوریت کے سوا کچھ نہیں تھا کیوں کہ سالانہ امتحانات سر پر تھے لہٰذا سب اپنے گھروں میں تیاری کر رہے تھے۔

اُس روز تقریباً ایک ہفتے کی غیر حاضری کے بعد وہ یونی ورسٹی آئی تو پتہ چلا کہ فرحان عباسی کا پچھلے دنوں ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ جس میں اس کی کار تو برباد ہی ہوئی خود اس کی اپنی جان بھی مشکل سے بچ سکی تھی۔ عائشہ کے لیے یہ اطلاع ازحد دکھ اور شرمندگی کا باعث بنی۔ پچھلے ایک ہفتے میں وہ یوں عماد شاہ کی سحر انگیز شخصیت میں کھو کر رہ گئی تھی کہ اسے اور کسی کا دھیان ہی نہیں رہا تھا۔ "فرحان عباسی" کا بھی نہیں جو اس کا نہایت قریبی اور مخلص دوست تھا۔

اسی روز وہ یونی ورسٹی سے اپنے کچھ کلاس فیلوز کے ساتھ اس کی عیادت کو گئی۔ اس کی طبیعت اب پہلے سے کافی بہتر دکھائی دے رہی تھی۔ محل جیسے خوب صورت وسیع گھر میں سوائے چند ملازمین اور اس کے کوئی اور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دونوں نے اب تک ایک دوسرے سے اپنی اپنی فیملی سے متعلق تفصیلی ڈسکشن نہیں کی تھی لہٰذا عائشہ کو اتنے بڑے گھر میں اس کے اکیلے پن پر چند لمحوں کے لیے خاصا تعجب ہوا۔

''آیئے مس عائشہ! خدا کا شکر ہے آپ کو مریض کی عیادت کے لیے فرصت تو ملی۔ بھلے زخم مندمل ہو گئے ہوں۔'' سب سے رسمی سی ہیلو ہائے کے بعد وہ خاص طور سے اس کی طرف متوجہ ہوا' وہ گھور کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی خفت مٹانے کو بولی۔

''میں تم سے ناراض تھی لہٰذا پچھلے ایک ہفتے سے یونیورسٹی بھی نہیں آرہی تھی' پھر مجھے کیسے پتا چلتا کہ تم پر کیا افتاد ٹوٹ پڑی ہے اچانک......''

''افتاد تو اچانک ہی ٹوٹتی ہے سوئٹی! ہاں پتا تو چلتے چلتے ہی چلتا ہے' بہرحال پہلی بار میرے دولت کدے پر آئی ہو' بتاؤ کیا خدمت کروں؟''

''کچھ نہیں! میں اب بھی تم سے ناراض ہوں۔'' اس بار فرحان نا چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔

''میرا قصور تو بتا دو' ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری!'' عائشہ ایک مرتبہ پھر اسے گھورتے ہوئے تنک کر بولی۔

''شرم تو نہیں آتی تمہیں' اتنا بڑا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھے اور مجھے مطلع تک کرنا گوارہ نہیں کیا؟''

''میں تمہیں بلاوجہ پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔'' اس کے کلاس فیلوز خاصی دِل چسپی سے دونوں کے مابین ہونے والی دل چسپ نوک جھونک کا نظارہ کر رہے تھے۔

''بس بس! رہنے دو یہ صفائیاں' میرا بھی یوں ہی ایکسیڈنٹ ہو گیا تو میں بھی تمہیں مطلع نہیں کروں گی۔''

''شٹ اپ! کچھ بھی بولتی رہتی ہو تم! سوائے فضول بولنے کے کچھ اور بھی آتا ہے تمہیں کہ نہیں؟'' اسے یقیناً خاصا برا لگا تھا مگر عائشہ اتنے اسٹوڈنٹس کے درمیان ڈانٹ کھانے پر سخت شرمندہ دکھائی دے رہی تھی' پھر جس وقت وہ سب کے ساتھ اٹھ کر آنے لگی فرحان نے زبردستی اسے روک لیا یہ کہہ کر کہ وہ خود اسے گھر ڈراپ کر دے گا۔

''آئی ایم سوری عاشی! میں سب کے سامنے تمہیں ڈانٹنے پر شرمندہ ہوں لیکن تم نے بات ہی اتنی غلط کی تھی کہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ تمہیں گرم ہوا بھی چھو کر گزرے' میں برداشت نہیں کر سکتا......'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

''تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ پچھلا ایک ہفتہ تمہیں بنا دیکھے' بنا سنے اور ملے میں نے



کیسے بسر کیا' پتا نہیں تم میرے احساسات کی حقیقت کو کب سمجھو گی......؟'' وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا اتنا مشکل نہیں تھا کہ عائشہ ازہان سمجھنا چاہتی اور سمجھ نہ سکتی' مگر مسئلہ تو یہی تھا کہ وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی تب ہی آہستہ سے رُخ پھیرتے ہوئے بولی۔

''فضول باتیں چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟'' وہ یقیناً اس کے بات بدلنے پر بدمزا ہوا تھا' تاہم پھر بھی دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''آئی ڈونٹ نو' قسمت میں چوٹ کھانا لکھی تھی سو کھالی یقیناً اس روز تم نے کوئی بد عا ہی دی ہو گی......''

''جی نہیں! عائشہ ازہان اپنے عزیزوں کو کبھی بد دعا نہیں دیا کرتی۔''

''شکر ہے خدا کا' یہ تو معلوم ہوا کہ ہم بھی آپ کے عزیز ہیں۔'' وہ مسکرا رہا تھا' مگر عائشہ اُسی وقت گھر واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے فانی' مجھے اب چلنا چاہیے۔''

''ہاں چلو...... آج اس بہانے میری بھی تمہارے گھر والوں سے علیک سلیک ہو جائے گی۔'' وہ بھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور پھر اس روز وہ دیر تک اس کے گھر بیٹھا اس کے گھر والوں کے ساتھ گپ شپ لگاتا رہا' اس کی مما کو تو وہ اتنا پسند آیا کہ برملا عائشہ کے سامنے اس کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر بیٹھیں۔

ماشاءاللہ! بہت ہی اچھا اور پیارا لڑکا ہے' کاش تیرے لیے بھی مجھے ایسا ہی بَر مل جائے۔'' عائشہ ان کے الفاظ پر بس چپ چاپ ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''ہو سکتا ہے عماد شاہ اس سے بھی زیادہ اٹریکٹو اور چارمنگ پرسنیلٹی کا مالک ہو؟'' یہ سوچ اس کے ذہن میں آئی اور ایک مرتبہ پھر اس سے رابطے کو بے قرار ہو اٹھی۔

''ہیلو السلام علیکم!'' کپکپاتی انگلیوں سے اس کا سیل نمبر پریس کرنے کے بعد وہ کال پک ہوتے ہی دھیمے لہجے میں بولی۔

''وعلیکم السلام! فرمایئے کیسے یاد کیا آپ نے؟''

''یاد تو میں آپ کو ہر وقت کرتی رہتی ہوں لیکن لگتا ہے شاید آپ مجھے بھول گئے ہیں۔''

''یہ کیسے کہہ سکتی ہیں آپ! چاہنے والوں کو بھلانا عماد شاہ کا شیوہ نہیں......'' اس کے شکایتی لہجے پر فوراً دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔

"کتنے ماہ ہو گئے آپ کی کوئی نئی کتاب پڑھنے کو نہیں ملی' بہت زیادہ مصروف رہنے لگے ہیں کیا آپ؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"بس کچھ ایسا ہی سمجھ لیں......"

"اچھا! میں اگر آپ سے ملنے کی فرمائش کروں تو کیا آپ میری فرمائش پوری کریں گے؟"

"آں...... سوچیں گے' لیکن مجھ سے ملنا کیوں چاہتی ہیں آپ؟" اس کے ایکسائیٹڈ لہجے پر وہ قدرے سوچتے ہوئے بولا۔

"میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں' یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اتنے گہرے اور خوب صورت الفاظ تخلیق کرنے والا شخص خود کیسا ہے؟" وہ مسرور ہوتے ہوئے بولی۔

"شاید آپ جانتی نہیں کہ عماد شاہ کو اپنی نمائش سے کتنی نفرت ہے؟" اس بار وہ دھیمے سے ہنسا تھا۔

"یہ خوب جانتی ہوں' لیکن عماد شاہ نہیں جانتے کہ یہ سادہ سی لڑکی انھیں کتنا چاہتی ہے کیسے پاگلوں کی طرح دن رات صرف انہیں ہی سوچتی رہتی ہے' کتنی پرستش کرنے لگی ہے ان کی......" جذبات کی رو میں بہہ کر وہ ابھی نہ جانے اور کیا کیا کہتی کہ اچانک احساس ہو جانے پر فوراً کال کاٹ کر ہونٹوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

"او مائی گاڈ! یہ میں ان سے کیا کہہ بیٹھی؟ کیا سوچتے ہوں گے میرے بارے میں کہ کیسی لوز کیریکٹر لڑکی ہے جو جذبات چھلکائے پھر رہی ہے' اف میں بھی شاید ان کے عشق میں روز بروز پاگل ہوتی جا رہی ہوں۔" اپنی اس کیفیت پر وہ خود ہی شرما کر ہنس دی۔

اور پھر ان ہی دنوں بہت عجیب سا واقعہ ہو گیا۔ وہ اپنے حال میں مگن تھی۔ اسے خبر ہی نہ ہو سکی کہ کب اس سے پوچھے بغیر فرحان عباسی نے اپنے رشتے کے چچا کے ذریعے اس سے شادی کے لیے اپنا پرپوزل بھیجا اور کب اس کے گھر والوں نے بنا اس کی رائے لیے تھوڑی سی سوچ و بچار کے بعد قبول کرتے ہوئے فرحان عباسی کو ہاں کہہ دی۔ عجیب خود فراموشی کے قلعے میں مقید تھی وہ' اور یہ کیفیت جانے کب تک برقرار رہتی کہ اس روز یونیورسٹی میں الوداعی پارٹی کے لیے خوب تیار ہو کر جس وقت وہ گھر سے روانہ ہونے لگی' اس کی مما مسکرا کر اس کی نظر اتارتے ہوئے کہہ بیٹھیں۔

"ماشاء اللہ! آج تو میری بیٹی اتنی پیاری لگ رہی ہے کہ فانی کے ہوش گم ہو



جائیں گے۔ پہلے ہی نکاح کے لیے بہت اصرار کر رہا ہے پاگل!"

سن سن سن...... اس کے دل میں کئی تیر جیسے ایک ساتھ پیوست ہو گئے تھے۔ کتنی ہی دیر تو وہ ان کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہی' لیکن جب تھوڑی بہت سمجھ آئی تو پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"واٹ! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مما!"

خوب صورت چہرے کا رنگ ایک لمحے میں اُڑ گیا تھا مگر ثانیہ بیگم شاید اپنی ہی خوشی میں مگن تھیں۔ تب ہی اس کے چہرے کو دیکھے بغیر خوش گوار لہجے میں بولیں۔

"یہ سب تو فانی سے ہی پوچھنا' پرپوز کیا ہے تجھے اس نے......"

بے شک فرحان اسے عزیز تھا' اگر زندگی میں عماد شاہ نہ آیا ہوتا تو یقیناً وہ اس کا آئیڈیل ہوتا لیکن اب اس کا دل صرف عماد شاہ کی رفاقت کی تمنائی تھا۔ یہ بات کسی نہ کسی حد تک فرحان عباسی بھی جانتا تھا' پھر بھی اس نے یہ حرکت کر ڈالی تھی۔ رہ رہ کر اسے اس پر غصہ آ رہا تھا جب کہ دوسری جانب وہ بے قراری سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

کراچی یونیورسٹی میں رنگ و نور کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا۔ سب نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی بھرپور کوشش کی تھی خوشی کے ساتھ ساتھ وہ ایک دوسرے سے بچھڑ جانے پر افسردہ بھی تھے' کچھ لڑکیاں تو باقاعدہ اپنے دوستوں سے جدا ہونے پر آنسو بہا رہی تھیں۔ عائشہ جس وقت یونیورسٹی پہنچی' الوداعی پارٹی اپنے عروج پر تھی۔

"شکر ہے خدا کا تمہیں آنے کی فرصت تو ملی......" وہ جو اس کے لیٹ ہو جانے پر خاصا جلا بیٹھا تھا اسے دیکھتے ہی گویا سارا غصہ بھلا بیٹھا۔

"فانی! کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم نے مجھ سے پوچھے بغیر' مجھے پرپوز کیوں کیا......" اس کا ہاتھ تھام کر ایک سائیڈ پر لے جاتے ہی اس نے حملہ کر دیا۔

"ریلیکس یار! تم نے تو آتے ہی پولیس والوں کی طرف تفتیش شروع کر دی' تھوڑا دم تو لو...... مجھے یہ حسین سراپا نگاہوں میں اتارنے کی تھوڑی مہلت تو دو......" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"شٹ اپ! میں نے جو پوچھا ہے' صرف اس کا جواب دو......" عائشہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے اپنے غصے کا اظہار کیسے کرے؟

"خیریت! گھر سے مرچیں چبا کر آ رہی ہو' آتے ہی چڑھائی کر دی۔" وہ اب بھی غیر سنجیدہ تھا۔

''مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''او کے! تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا' بہت تلاش کے بعد آخر تم میرے معیارِ محبت پر پوری اتری ہو عاشی! محبت کرنے لگا ہوں میں تم سے' بے حد' بے تحاشا......'' مگر عائشہ اس کے الفاظ پر بری طرح کھول کر رہ گئی۔

''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم میرے لیے کیا سوچتے ہو...... میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہو سکتی ہے۔اس کے اندر اس لمحے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔''

''لیکن کیوں عاشی! مجھ میں کس چیز کی کمی ہے۔''

عائشہ نے اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھا وہ رُخ پھیرے بہت مدھم لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''تم میں کوئی کمی نہیں ہے فرحان! یقیناً تم کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتے ہو...... مگر میرے ساتھ معاملہ دِل کی ہٹ دھرمی کا ہے' میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں۔'' اس بار زمین فرحان عباسی کے قدموں تلے سے کھسکی' خوبصورت نگاہوں کے گوشوں میں اترتی نمی اس نے واضح محسوس کی تھی' چمکتا دمکتا روشن چہرہ ایک لمحے میں سیاہ پڑ گیا تھا۔

''کس سے محبت کرتی ہو تم! اس عماد شاہ سے؟'' امید کی ایک کرن بھی روشن تھی مگر عائشہ کے سرد لہجے نے فوراً ہی اسے بھی بجھا دیا۔

''نہیں۔'' بھلا اس پجارن کو اپنے دیوتا کی رسوائی کہاں مقصود تھی۔تب اس لمحے فرحان عباسی کے اندر جیسے کوئی ٹوٹ کر بکھرا تھا۔

''میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں عاشی! تمہارے علاوہ کسی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکوں گا' مت ٹھکراؤ مجھے پلیز!''

''آئی ایم سوری فانی! میں نے ہمیشہ تمہیں صرف ایک اچھا دوست سمجھا ہے' ہو سکتا ہے جسے میں چاہتی ہوں وہ مجھے تمہارے جیسا پیار نہ دے سکے۔لیکن آئی ایم سوری! میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں' اگر اس کے باوجود تم نے اپنے قدم پیچھے نہ ہٹائے تو یاد رکھو میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جان بھی لے سکتی ہوں۔''

''شٹ اپ!'' سرخ انگارہ آنکھیں گریۂ ضبط سے سرخ ہو رہی تھیں جانے کس



لذیت کے عالم میں لب کاٹتے ہوئے وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

''جس سے پیار کرتی ہو...... کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے مجھ سے زیادہ خیال رکھ سکتا ہے تمہارا۔'' اپنا کل متاع ہارتے ہوئے انسان کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ کیفیت اس وقت فرحان کی تھی۔مگر عائشہ نے اس کے درد کی مطلق پروانہ کرتے ہوئے قدرے بے بس لہجے میں کہا۔

''آئی ڈونٹ نو! لیکن میں اس سے ہٹ کر کسی اور کے بارے میں کبھی نہیں سوچ سکتی۔''

''ایسا کیا ہے اس میں جو مجھ میں نہیں ہے' غور سے دیکھو میری طرف ...... کیا ان آنکھوں میں تمہیں اپنا عکس نظر نہیں آتا' جس عماد شاہ کو بے حد سراہتی ہو کیا اس کا سراپا نظر نہیں آتا' کیوں مجھ میں عماد شاہ دکھائی نہیں دیتا تمہیں......'' وہ شاید اپنا ضبط اور حوصلہ کھو بیٹھا تھا' تب ہی اردگرد کھڑے اسٹوڈنٹس ان کی طرف چونکتے ہوئے متوجہ ہوئے لیکن اس لمحے فرحان عباسی کو جیسے کسی کی پروا نہیں رہی تھی۔

''میں تمہارا عماد شاہ ہوں عاشی! ساری دنیا جس سے فقط ایک ملاقات کے لیے ترستی ہے وہ ہی تنہائیوں اور محرومیوں کا مارا تمہارا عماد شاہ ہوں میں' فرحان عباسی کی حیثیت سے نہ سہی' عماد شاہ کی حیثیت سے ہی میرے پیار کو قبول کر لو پلیز!'' محبت انسان کو کتنا خوار کر دیتی ہے اس لمحے کوئی فرحان عباسی سے پوچھتا' جو نہایت رقت کے عالم میں اس کے سرد ہاتھ تھامے گڑگڑا رہا تھا لیکن وہ اپنے خود ساختہ ''یقین'' میں ڈوبی ہوئی تھی۔

تب ہی وہ اپنے ہاتھ آہستہ سے اس کی گرفت سے نکالتے ہوئے مدھم لہجے میں بولی۔

''تم عماد شاہ کبھی نہیں ہو سکتے' لیکن محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر عماد شاہ بن ضرور سکتے ہو' بہر حال میں مجبور ہوں فرحان' آئی ایم سوری! میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی......''

''تم ایسا نہیں کر سکتیں دنیا میں' میں نے صرف تمہیں چنا ہے' تم مجھے پھر سے درد کی دلدل میں دھکیل کر نہیں جا سکتیں عاشی!''

''سوری فانی! اگر مجھے پہلے تمہارے ارادوں کا علم ہوتا تو میں تمہیں آگے بڑھنے ہی نہیں دیتی...... میری خوشی اور سکون چاہتے ہو تو پلیز میری زندگی میں دوبارہ کبھی مت آنا'

ورنہ مجھے موت کو گلے لگانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'' اپنی بات کہہ کے وہ وہاں ٹھہری نہیں ......لیکن فرحان عباسی کے اندر سناٹے ضرور ٹھہر گئے تھے۔

آنے والا وقت ان دونوں کے لیے ہی تکلیف دہ تھا۔ عائشہ ازہان کے اس احمقانہ پر پورا گھر اُس کے خلاف ہو گیا تھا لیکن اس کی ایک ہی ضد تھی۔

''شادی اسی سے کروں گی جس سے محبت کرتی ہوں۔'' اور اس کی اس ضد کے نتیجے میں فرحان عباسی تو کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح اس کی زندگی سے نکلا ہی ساتھ میں یہ صدمہ ثانیہ بیگم کی جان بھی لے گیا' زندگی میں عجیب سی وحشت در آئی تھی۔

دل کا حال خاصا ابتر تھا۔ اس کے سگے باپ اور بھائیوں کی محبت جیسے اب پرائی ہو چلی تھی پورے دن وہ بوکھلائی بوکھلائی پھرتی رہتی' بھاگ بھاگ کر سب کے کام کرتی لیکن پھر بھی کوئی اس سے خوش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس روز بہت دنوں کے بعد اس نے عماد شاہ کا موبائل نمبر پریس کیا۔

''ہیلو......'' آج دوسری جانب سے ابھرنے والی آواز عماد شاہ کی نہیں تھی تب ہی اس کا لہجہ قدرے ڈگمگایا۔

''مم...... میں عائشہ بول رہی ہوں' عماد شاہ سے بات کروا دیجیے پلیز!''

''واٹ! اس گھامڑ نے ابھی تک آپ کو اندھیرے میں رکھا ہوا ہے؟'' دوسری طرف سے جو الفاظ ادا ہوئے وہ ان پر حیران رہ گئی۔

''ک...... کیسے اندھیرے میں؟'' اس وقت اس سے کچھ بھی بولنا بے حد دشوار ہو رہا تھا۔

''دیکھئے محترمہ! فرسٹ ٹائم جب آپ نے آرز کے پبلشنگ کمپنی میں کال کی تھی تو میں نے ہی آپ کی کال اٹینڈ کر کے آپ سے آپ کا رابطہ نمبر لیا تھا' اس وقت میں اور میرا چھوٹا بھائی معید جولی موڈ میں بیٹھے تھے۔ عماد شاہ سے آپ کا رابطہ ہونا چوں کہ ناممکن تھا' لہٰذا یوں ہی مذاقاً معید نے مجھ سے آپ کا نمبر لے لیا اور عماد شاہ سے آپ کی فیلنگز جاننے کے لیے وہ نقلی عماد شاہ بن کر اب تک آپ سے بات کرتا رہا' یہ سب صرف انجوائے منٹ کے لیے تھا' آج کل ملک سے باہر ہوتا ہے وہ......'' دوسری جانب سے اور بھی بہت کچھ کہا جا رہا تھا' لیکن عائشہ کے اندر جیسے مزید کچھ سننے کی استطاعت ہی نہیں رہی تھی سراب کو سمندر جان کر اس کے



پیچھے بھاگنے والوں کا انجام شاید ایسا ہی ہوتا ہے' زندگی نے بہت بے رحم کھیل کھیلا تھا اس کے ساتھ...... ایسا بے رحم کھیل کہ جس میں وہ اپنا دل اپنی محبت' اپنا سکون' اپنی خوشیاں' اپنے خواب اور اپنے سب عزیز رشتے گنوا بیٹھی تھی' خود اپنے ہاتھوں ناعاقبت اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی کشتی ڈبو بیٹھی تھی۔ نتیجتاً آج زمین بھی اس کے لیے پرائی تھی اور آسمان بھی...... گزرنے والے پچھلے سات سال اسے سوائے درد کے اور کچھ نہیں دے کر گئے تھے۔

باپ کی وفات اور بھائیوں کی شادیوں کے بعد اپنے ہی گھر میں امان اس کا نصیب نہ رہی تو وہ اپنا آپ سمیٹ کر رشتے کے ایک چچا کی دعوت پر یہاں انگلینڈ چلی آئی زندگی اب اس کے اندر جیسے ٹھہر سی گئی تھی۔

پچھلے سات سالوں میں اس نے کسی پر یہ راز منکشف نہیں ہونے دیا تھا کہ اسے فرحان عباسی سے محبت ہو گئی تھی' وہ اسے کھونے کے بعد پچھتاوے کا شکار تھی گزرے ہوئے وقت کے کسی ایک لمحے میں بھی اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ زندگی میں پھر دوبارہ کبھی اسے دیکھ پائے گی' لیکن ایسا ہو گیا تھا۔

اخبار میں چھپنے والی تصاویر اور مضمون نے ایک مرتبہ پھر اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کتنی عجیب اور تکلیف دہ حقیقت تھی یہ کہ اس کا فرحان عباسی ہی حقیقت میں عماد شاہ تھا۔ وہ جو گم نام رہنے میں عافیت جانتا تھا صرف ایک اس کی محبت پانے کے لیے پوری یونی ورسٹی کے سامنے بے نقاب ہو گیا تھا لیکن وہ اسے سمجھ نہیں پائی تھی سات سالوں کے بعد ایک مرتبہ پھر وہ روئی تھی اور اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی کہ آنکھوں کے سوتے بھی خشک ہو گئے تھے۔

عماد شاہ کی شاعری میں اب مزید نکھار آ گیا تھا ثانیہ نصیر! جس کے ماورائی حسن کے سامنے بڑے بڑے پانی بھرتے تھے' وہ اسی عماد شاہ کے لیے اپنے ہر شوق کو خیر آباد کہہ کر' گھریلو بیوی بننے کے لیے بہ خوشی تیار ہو گئی تھی اس کی بے نام محبت کا چاند آخر چپ چاپ کسی اور کے آنگن میں اتر گیا تھا۔

سات سال کے بعد زندگی آخر اسی عماد شاہ کے مقابل لے آئی تھی جسے وہ آج بھی ٹوٹ کر پیار کرتی آ رہی تھی۔ آج جس تقریب میں وہ شریک تھی اسی تقریب میں عماد شاہ کو بہ طور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ پہلے سے کتنا بدل گیا تھا وہ؟ پہلے اسے نمود نمائش سے نفرت محسوس ہوتی تھی لیکن اب وہ بڑے شوق سے محفلوں کی زینت بننے لگا تھا۔ پہلے بات بات پر مسکرایا

کرتا تھا لیکن اب وہ خوب صورت گداز لب اپنی ہنسی کہیں رکھ کر بھول چکے تھے۔ پہلے جن آنکھوں میں ایک عجیب سا درد جیسے ٹھہر گیا تھا' ہلکی ہلکی سی نمی اب ہر وقت جیسے اس کی آنکھوں کے گوشوں میں چھپی رہتی تھی۔

اب ہماری آنکھوں میں' اب ہماری باتوں میں
اب ہمارے ہاتھوں میں پھول ہیں نہ کلیاں ہیں
رنگ ہیں نہ موتی ہیں
چاہ ایسی ہوتی ہے' جو مٹا کے رکھ چھوڑے
زیست کی سبھی خوشیاں' مسکرا کے لے جائے
ساحلوں پر آئی موج کی طرح بہا کے لے جائے
پیچھے رہنے والوں کی' زندگی بدل جائے
پوری رات ڈھل جائے اور ان کے ہاتھوں کے
پھول اور سبھی کلیاں' رنگ اور سبھی موتی
آنسوؤں میں بہہ جائیں
صرف ان کے ہونٹوں پر حسرتیں ہوں خواہش ہو
یوں نہ آزمائش ہو

آنسو اب بھی اس کی پلکوں پر اٹکے تھے' بہت اچانک قطعی غیر دانستگی میں فرحان عباسی کی نظر اس کے وجود پر پڑی اور وہ جیسے وہیں ساکت ہو کر رہ گیا تھا' ایک لمحے کے لیے پوری کائنات کی گردش جیسے تھم گئی تھی اس لمحے عائشہ کو پھر سے اپنے سامنے پا کر اس کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھ کر اس کے مقابل آتا' اسی پارٹی کے آرگنائزر طلحہ ہمدانی جو لگ بھگ پچاس کے ہوں گے اور دونوں ٹانگوں سے معذور بھی! اس کی نظریں عائشہ ازہان کی جانب مبذول پا کر' تیزی سے اپنی وھیل چیئر گھسیٹتے اس کی طرف بڑھے۔

''عماد! آؤ تمہیں اپنی ہونے والی مسز سے ملواؤں۔''

خوشی اور تفاخر ان کے چہرے سے چھلک رہا تھا مگر عماد شاہ کی دنیا اس وقت اندھیر ہو گئی جب انھوں نے اپنی بیگم کی حیثیت سے عائشہ ازہان کو اس کے مقابل ٹھہرایا۔



''یہ عائشہ ہے میری ہونے والی شریکِ حیات اور دنیا کی سب سے عظیم لڑکی! جس نے مجھ جیسے ناکارہ کو سہارا دینے کا جرأت مندانہ قدم اُٹھایا' دیکھو اسے دیکھ کر قدرت اور اپنے نصیب پر رشک آتا ہے۔'' وہ بلاتکان مسرور لہجے میں بول رہے تھے جب کہ فرحان عباسی کی دھول ہوتی نگاہوں میں عجیب سی حیرانی اتر آئی تھی۔

بہت دیر کے بعد اسے تنہائی میسر آئی تو وہ عائشہ ازہان کا بازو دبوچ کر اسے اپنے مقابل کھڑا کرتے ہوئے مغموم لہجے میں پوچھنا نہیں بھولا تھا۔

''کیا یہ ہی وہ شخصیت ہے جس سے تمہیں پیار کا دعویٰ تھا؟''

''ہاں۔'' فرحان عباسی کے سوال نے اسے سولی پر لٹکا دیا تھا۔

''واٹ؟ اس ادھورے شخص کے لیے تم نے میری بے لوث محبت کو ٹھکرایا' کیوں؟ ایسی کیا چیز ہے اس ادھیڑ عمر شخص کے پاس جو میرے پاس نہیں تھی۔'' وہ از حد روہانسا ہوا مگر عائشہ نے خود کو بکھرنے نہیں دیا۔

''بے تحاشا دولت' اعلیٰ مقام! میری نظر میں اس وقت یہ تمہارے پاس نہیں تھا' لیکن بعد میں مجھے پتا چلا کہ میں غلط تھی' حقیقت میں تم ہی عماد شاہ تھے اور اس لحاظ سے دولت و شہرت دونوں ہی وافر مقدار میں تمہارے پاس تھی لہٰذا اب اگر تم چاہو تو میں' تمہارا ہاتھ تھام سکتی ہوں۔''

''شٹ اپ!'' فرحان عباسی کے جسم کا سارا خون سمٹ کر اس کی آنکھوں میں اتر آیا' اپنی محبت کی تذلیل اس سے برداشت نہیں ہو سکی تھی' تب ہی غیر دانستگی میں اس کا ہاتھ بھی عائشہ پر اٹھ گیا۔

''مجھے ساری زندگی یہ افسوس رہے گا کہ میں نے اپنی بے لوث محبت کے لیے ایک غلط لڑکی کا انتخاب کیا۔''

اس کی خوب صورت آنکھوں کے گوشوں میں اب بھی نمی تیر رہی تھی مگر اس کے بعد وہ ایک لمحے کے لیے بھی وہاں ٹھہرا نہیں۔ جب کہ عائشہ برستے آنسوؤں کو نہایت بے دردی سے رگڑتی ہوئی مسکرا دی۔ آخر محبت میں اپنا پندار بچانا بھی تو ضروری تھا۔ اور پھر جن سے پیار کیا جاتا ہے بھلا ان کی دائمی کسک کہاں گوارہ ہوتی ہے۔

وہ اس کی دسترس سے نکل چکا تھا' لہٰذا آج اس نے اس دل رُبا سے شخص کو اپنے

درد کے حصار سے بھی باہر نکال دیا تھا۔

تو بھی غبارِ راہ تھا' ہم بھی غبارِ راہ تھے
تو بھی کہیں بکھر گیا' ہم بھی کہیں بکھر گئے
راہ میں ملے تھے ہم' راہیں نصیب بن گئیں
تو بھی نہ اپنے گھر گیا' ہم بھی نہ اپنے گھر گئے





# بس عش' محبت' اپنا پن

میں تو سوچ بیٹھا ہوں' تُو بھی سوچ لے جاناں
زندگی کا سودا زندگی کے بدلے میں
تجھ کو دیکھنا کیا تھا' ماند پڑ گئیں آنکھیں
روشنی گنوائی ہے روشنی کے بدلے میں

راہِ وفا میں اذیت شناسایاں نہ گئیں
کسی بھی رُت میں ہماری اُداسیاں نہ گئیں
تیرے قریب بھی رہ کر' تجھے تلاش کروں
محبتوں میں میری بدحواسیاں نہ گئیں

موسم بے حد خوب صورت ہو رہا تھا۔

شام کی ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہوائیں' پورے ماحول میں ایک عجیب سا سحر ور پھونک رہی تھیں۔

''ہمدانی ہاؤس'' کے سرسبز و شاداب لان میں' گلاب اور موتیا کے خوب صورت پھولوں سے اٹھنے والی مہک نے گویا اردگرد کی ہر چیز کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا' تب ہی وہ اندر اپنے کمرے سے اٹھ کر یہاں لان میں کین کی چیئر پر آ بیٹھی تھی۔ پھولوں' کتابوں اور

ٹھنڈی ہواؤں سے اسے بچپن ہی سے بہت پیار رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمدانی ہاؤس کے شان دار لان میں لہلہانے والے جانے کتنے ہی پودے خود اس کے اپنے ہاتھوں کے لگائے ہوئے تھے اور شب و روز ان پودوں کو بڑھتے ہوئے دیکھنا اسے کتنی خوشی سے ہمکنار کرتا تھا' یہ صرف اس کا دل جانتا تھا۔

اس وقت بھی وہ ہاتھ میں تیز دھار چاقو اور سیب لیے محبت پاش نگاہوں سے اپنے ہرے بھرے لان کو دیکھ رہی تھی' جب لان کے قریب ہی ہمدانی ہاؤس کا گیٹ ہلکے سے وا ہوا اور پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد کوئی دھیمے دھیمے سے قدموں سے چلتا' اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

''ارے سیفی تم ...... آؤ پلیز بیٹھو ناں۔'' اپنی محویت سے چونک کر اس نے جونہی آنے والے کی سمت توجہ کی' اپنے سے کچھ ہی فاصلے پر چپ چاپ کھڑے سفیر علی کو دیکھ کر گویا چہک اٹھی' تب ہی وہ اس کے سامنے والی کرسی پر ٹک گیا۔

''کیسی ہیں ایمان جی......؟'' خشک لبوں نے ہلکی سی جنبش کی تھی' جواب میں سیب کی پھانکیں تراشتی ایمان ہمدانی دھیرے سے مسکرا دی' پھر خاصے اپنائیت بھرے لہجے میں بولی۔

''میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں' تم سناؤ کیسے ہو......؟ اور اتنے دنوں سے نظر کیوں نہیں آئے؟'' اس کے سوال پر گم صم سے سفیر علی نے محض ایک نگاہ اس کی طرف دیکھا' پھر دوبارہ سے نگاہیں جھکا کر بولا۔

''میں شہر میں نہیں تھا' راولپنڈی گیا ہوا تھا' زندگی کے یہ سات دن بہت مصروف گزرے ہیں میرے' لیکن اس مصروفیت سے چھٹکارہ پاتے ہی سب سے پہلے آپ سے ملنے آیا ہوں' ایمان جی پرسوں میرا بہت بڑا میوزک کنسرٹ ہو رہا ہے' آپ آئیں گی ناں......؟'' کتنی معصومیت' کتنی عاجزی تھی اس کے لہجے میں' لیکن اپنائیت سے مسکراتی ایمان ہمدانی کے گلابی لب فوراً سمٹ گئے' تب ہی وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی۔

''سوری سیفی...... میں چاہ کر بھی تمہارے میوزک کنسرٹ میں نہیں آ سکتی۔''

''کیوں......؟'' فوراً مچل کر اس نے پوچھا تھا۔

''کیوں کہ مجھے اس کے لیے پرمیشن نہیں ملے گی۔'' نگاہیں جھکا کر اس نے وجہ بیان کی تھی۔

''آپ کے گھر والوں سے میں بات کر لیتا ہوں لیکن اگر آپ وہاں آئیں گی تو



مجھے بہت خوشی ہو گی۔''

''لیکن وہاں تو تمہارے ہزاروں فین ہوں گے' پھر میرے جانے نہ جانے سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''فرق پڑتا ہے ایمان جی' بہت فرق پڑتا ہے مجھے۔ میں آپ سے پرامس کرتا ہوں کہ اگر آپ وہاں آئیں گی تو میں کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔''

''تم فضول کی ضد کر رہے ہو سیفی' تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے ایسے شور ہنگامے قطعی پسند نہیں۔'' اس کے بے حد اصرار پر وہ قدرے اکتا کر بولی تھی' جواب میں اس کے سامنے بیٹھا وہ گم صم سا لڑکا' مزید اداس ہو گیا' تب ہی ٹھہرے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

''ہاں میں جانتا ہوں کہ آپ کو شور ہنگامے قطعی پسند نہیں' لیکن میرا جو ''شو'' ہے' وہ پاپ میوزک پر مبنی نہیں ہے' تمام کے تمام گیت ٹریجڈی ہیں' آپ سنیں گی تو آپ کو بہت اچھا لگے گا ایمان جی......''

''لیکن میں ہی کیوں سیفی......؟ میری ہی شرکت پر اتنا اصرار کیوں کر رہے ہو تم......؟'' اب کہ اس کے لہجے میں ہلکی سی بے زاری اتر آئی تھی' تب ہی کھوئے کھوئے سے سفیر علی نے اداس سی ایک نگاہ اس پر ڈالی پھر قدرے دھیمے لہجے میں بولا۔

''یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں ہر بار ہی آپ کے نہ آنے کے باوجود آپ کی شرکت کے لیے اتنا بے تاب کیوں ہو جاتا ہوں۔ ہاں مگر...... میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مجھے آپ سے والہانہ عقیدت ہے' یہ جو آج میرے لبوں سے لوگوں کے دلوں کو چھو لینے والے بول نکلتے ہیں' یہ سب آپ کی میراث ہے کیوں کہ اسی دنیا میں' جب میں دربدر تنہا بھٹک رہا تھا تو آپ ہی نے ہاتھ بڑھا کر مجھے سہارا دیا تھا' جب کوئی میرے آنسو پونچھنے والا نہیں تھا تو آپ ہی کے کندھے پر سر رکھ کر پہروں رویا تھا میں' جب دنیا میں کوئی میری ذات سے آشنا نہیں تھا تو آپ ہی نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے ان لوگوں سے متعارف کروایا تھا' میرا ہنسنا رونا' سونا جاگنا' سب آپ کا ہی مرہونِ منت ہے ایمان جی' اس لیے میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ خدا کے بعد اگر میں کسی کی پرستش کرتا ہوں تو وہ صرف اور صرف آپ کا وجود ہے' اگر آپ نہیں ہیں تو میرے لیے اس دنیا میں' کہیں کچھ بھی نہیں ہے ایمان جی۔'' بولتے بولتے وہ اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ سنجیدہ سی ایمان ہمدانی ٹکر ٹکر حیرت سے اسے بس دیکھتی رہ گئی تب ہی بمشکل اس کے لبوں

نے جنبش کی تھی۔

''تم تو ایک دم پاگل ہو سیفی......''

''ہاں میں پاگل ہوں اور ہمیشہ اسی پاگل پن میں رہنا چاہتا ہوں ایمان جی' بہر حال آپ پلیز مجھ سے پرامس کریں کہ آپ پرسوں میرے میوزک کنسرٹ میں ضرور آئیں گی' پلیز......'' وہ پھر بے تابی سے مچلا تھا' تب ہی ایمان ہمدانی نے سرد آہ بھرتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اسے ٹال دیا۔

''او کے...... میں آنے کی کوشش کروں گی لیکن وعدہ نہیں کرتی۔''

''کوئی بات نہیں' آپ نے آنے کی ہامی بھری' میرے لیے یہی بہت ہے' تھینک یو سو مچ ایمان جی۔ میں پرسوں شدت سے آپ کا انتظار کروں گا۔''

پل دو پل میں ہی کیسے گلاب کھل گئے تھے اس کے چہرے پر' کس قدر قرار اتر آیا تھا اس کے دل میں تب ہی وہ مسرور سا اٹھ کھڑا ہوا پھر چلتے چلتے ایک پل کے لیے رکا اور پلٹ کر اس کی سمت دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ سچ مچ آئیں گی ناں ایمان جی؟'' امید و ناامیدی کے درمیان ڈگمگاتا اس کا پیاسا لہجہ' کس قدر خلوص بھرا تھا' جواب میں چپ چاپ سی ایمان ہمدانی نے فقط ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے خاموشی سے سر ہلا دیا پھر اسے مسرت سے واپس پلٹتے دیکھ کر تھکی تھکی سی ایک سانس معطر ہواؤں کے سپرد کرتی وہ خود بھی لان سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔



وقت بہت آگے نکل آیا تھا۔

آج سے سات سال پہلے جب وہ سفیر علی سے ملی تھی تو حالات' تقدیر کے مخالف نہیں تھے۔ اس وقت زندگی پر اس کا اپنا اختیار تھا' وہ اپنی مرضی سے ہنستی تھی اور اپنی مرضی سے ہی آنسو بہاتی تھی لیکن اب وقت بہت بدل گیا تھا' اب ایسا کچھ بھی اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔

آج سے سات سال پہلے ''ہمدانی ہاؤس'' کے در و دیوار پر اس کی حکمرانی تھی' اسی کے قہقہوں کی جھنکار سے ارد گرد ہر کہیں اجالے بکھرتے تھے' روشنیاں جنم لیتی تھیں' قمقمے جگمگاتے تھے لیکن اب ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ گزرنے والے یہ سات سال' اس سے سب کچھ چھین کر لے



گئے تھے۔ اس کا ڈھیروں پیار' حکمرانی' اختیار' اس کے قہقہے' سب کچھ...... اب اگر اختیار میں کچھ رہا تھا تو ایک جامد خاموشی' جس کا قفل ہمہ وقت اس کے گلابی ہونٹوں پر لگا رہتا تھا۔

ہمدانی صاحب کی رحلت کے بعد حالات اتنی تیزی سے بدلے تھے کہ وہ خود کو سنبھال ہی نہ پائی' اس کا پیارا ہمدانی ہاؤس جہاں وہ اپنے شفیق ڈیڈ احمد ہمدانی اور چچا توصیف ہمدانی اور ان کی بھری پری فیملی کے ساتھ خوش و خرم رہتی تھی' اب بہت تاریک ہو گیا تھا اس کے لیے' وہی چچی اور چچا' جو اس کے ڈیڈ کی زندگی میں اس پر اپنی محبتیں نچھاور کرتے تھے' اب بدلتے وقت کے ساتھ خود بھی اتنا بدل گئے تھے کہ وہ تو بس حیرانی سے ان کے بدلتے مزاجوں کو دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ احمد ہمدانی صاحب کی رحلت کے فوراً بعد انہوں نے اپنے بچوں کو نیویارک کی سب سے بڑی یونی ورسٹی میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔

سفیر علی جب فرسٹ ٹائم اس کے سامنے آیا تھا' تو اس کی حیثیت ایک ملازم کی تھی جسے اس کے ڈیڈ نے صرف اسی کے لیے اپوائنٹ کیا تھا' اسے کالج سے لانے اور لے جانے کی تمام تر ذمہ داری کے ساتھ ساتھ کسی بھی وقت کہیں گھمانے' پھرانے' دوست کے گھر لے جانے یا شاپنگ کروانے کے فرائض بھی وہی سر انجام دیتا تھا۔ اس وقت ایمان کو یہ سنجیدہ سا' خوبرو لڑکا' بہت اچھا لگتا تھا اور وہ اس کی ذات میں گہری دل چسپی بھی رکھنے لگی تھی' جس کی سب سے بڑی وجہ شاید اس کی شرافت اور وجاہت ہی تھی۔

ان دنوں اسے اس کم گو سے لڑکے کا ضبط آزمانے میں بڑا لطف آیا کرتا تھا' تب ہی وہ کبھی رات کو بارہ اور ساڑھے بارہ بجے بھی اٹھ کر اس پر حکم صادر کر دیتی کہ اسے واک کے لیے جانا ہے' نیند نہیں آ رہی لہٰذا وہ اس کے ساتھ چلے اور وہ ایسا تابع فرمان تھا کہ کچی نیند سے اٹھ کر بھی فوراً اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتا۔ اکثر وہ کسی دوست کے گھر جاتی تو گھنٹوں واپسی کا نام نہ لیتی اور ایسے میں وہ گم صم سا لڑکا باہر گاڑی سے ٹیک لگائے پہروں اس کا انتظار کرتا رہتا' کبھی وہ شدید خراب موسم میں بھی شاپنگ کی ضد کر لیتی۔ صرف اور صرف سفیر کو ستانے اور چڑانے کے لیے لیکن وہ ایسا ضبط میں ماہر تھا کہ پلٹ کر ہلکا سا احتجاج بھی نہ کرتا اور چپ چاپ' خاموشی سے اس کے حکم کو بجا آوری کے لیے فوراً اٹھ کھڑا ہوتا۔ خواہ راستے میں اسے کتنا ہی خوار کیوں نہ ہونا پڑتا۔

اس کی مما چونکہ اس کے بچپن میں ہی رحلت فرما چکی تھیں' تب ہی احمد ہمدانی

صاحب نے اسے خوب سر پر چڑھایا ہوا تھا اور وہ خاصی بگڑی نسلوں میں سے تھی۔ ہمدانی صاحب سارا دن آفس میں ہوتے تھے لہٰذا وہ ان کی غیر موجودگی میں سفیر علی کو خوب ستاتی۔

اس روز بھی موسم بے حد خراب تھا' سڑکوں پر جگہ جگہ بارش کے پانی کی وجہ سے کھڈ بن گئے تھے' لوگوں کا آنا جانا محال ہو رہا تھا لیکن اس نے فرمائش کر دی کہ اسے شاپنگ کے لیے طارق روڈ تک جانا ہے اور جواب میں ہمیشہ کی طرح سفیر علی چپ چاپ بنا چوں چرا کیے اسے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گیا۔ راستے میں خراب موسم اور سڑکوں پر کھڑے گدلے پانی کی وجہ سے گاڑی کا حشر ہو گیا۔ خود اسے بھی ڈرائیونگ میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا لیکن مجال ہے جو اس کے لبوں سے کوئی ایک حرف بھی نکلا ہو۔

پھر جس وقت وہ طارق روڈ تک پہنچی' مارے تھکن کے سفیر علی کا برا حال ہو چکا تھا لیکن وہ اب بھی خاموش تھا۔ تب ہی وہ مزے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے انتظار کرنے کا حکم دیتی ایک شاپ میں گھس گئی اور وہ کن من برستی بوندوں میں گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑا مسلسل دو گھنٹے اس کی راہ دیکھتا رہا۔ بلیک پینٹ پر زیب تن لائٹ بلو شرٹ بری طرح بھیگ کر جسم سے چپک چکی تھی لیکن وہ تو جیسے پتھر بنا اپنے آپ سے بے نیاز کھڑا تھا۔

اسی اثنا میں نٹ کھٹ سی ایمان ہمدانی شاپنگ ہال سے باہر آئی تو اسے بری طرح بارش میں بھیگتے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ پل دو پل کے لیے ہی اس کے قدم ڈگمگائے تھے اور اگلے ہی پل وہ اپنی تمام تر شاپنگ کے ساتھ سیدھی زمین پر آن گری تھی' سارے کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو گئے تھے۔ پاؤں اتنی شدت سے مڑا تھا کہ وہ کراہ کر رہ گئی تھی' تب ہی اس نے مدد طلب نگاہوں سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑے سفیر علی کو دیکھا تھا' پھر ہاتھ بڑھا کر اسے قریب بلا لیا۔

''میرے پاؤں میں شدید درد ہو رہا ہے' میں چل نہیں سکتی۔'' اسے قریب پا کر آنسوؤں سے بھری نگاہیں اس پر جماتے ہوئے وہ بولی تھی۔ جواب میں سفیر علی نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی بانہوں میں اٹھا لیا' پھر اسی طرح اٹھائے اٹھائے وہ گاڑی تک پہنچا اور دائیں ٹانگ سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر ایمان کو آرام سے پچھلی سیٹ پر لٹا دیا' پھر پلٹ کر اس کے شاپنگ بیگ اٹھائے اور انہیں اپنی برابر والی سیٹ پر رکھتے ہوئے اس نے بس ایک نظر پاؤں پکڑ کر درد سے کراہتی ہوئی ایمان ہمدانی کو دیکھا' پھر چپ چاپ اپنی سیٹ پر آ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اگلے روز شام تک اس کا پاؤں بالکل صحیح ہو چکا تھا' تب وہ اپنے کمرے سے



نکل کر سفیر کے کوارٹر کی طرف چلی آئی۔ ارادہ اپنی عزیز دوست نمرہ کے گھر جانے کا تھا' تب ہی سفیر کے کمرے تک پہنچ کر اس نے زور سے دروازہ بجا ڈالا۔ جواب میں فقط چند ہی سیکنڈ کے بعد سرخ سرخ سی آنکھوں کے ساتھ' سفیر علی نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔

''گونگے ہونے کے ساتھ ساتھ' بہرہ بھی ہو گیا؟ کب سے کھڑی دروازہ بجا رہی ہوں' کیا سنائی نہیں دیا؟'' اس پر وقت بے وقت خواہ مخواہ کا رعب جھاڑنا وہ اپنا لازمی فرض سمجھتی تھی' تب ہی اسے سامنے پا کر دھیمی آواز میں چلائی' جواب میں چپ چاپ سے سفیر علی نے نگاہیں جھکا کر دھیمے سے ''سوری'' بول دیا۔

''مجھے اپنی ایک دوست سے ملنے جانا ہے' پلیز فوراً چلو۔'' اس کے سوری بولنے پر گردن میں مزید تناؤ آ گیا تھا' تب ہی دونوں بازو سینے پر باندھے ہوئے اس نے تحکمانہ انداز میں کہا تو سنجیدہ سا سفیر علی اثبات میں سر ہلا کر واپس اندر چلا گیا کیوں کہ اس کے پاؤں میں جوتا نہیں تھا اور وہ غالباً گہری نیند سے جاگا تھا' یہی وہ لمحہ تھا جب نٹ کھٹ سی ایمان علی ہمدانی کو اس کا اکلوتا کمرہ پہلی مرتبہ تفصیل سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

چھوٹا سا تاریک کمرہ' جس میں فقط ایک چارپائی' ایک چھوٹا سا صندوق' پانی کا ایک کولر' ایک لحاف' چھوٹی سی ایک ٹیپ اور اس کے ساتھ چند آڈیو کیسٹیں پڑی تھیں' اس کے علاوہ وہاں ضروریات زندگی کی اور کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ گو کمرے کی صفائی قابل دید تھی لیکن پھر بھی ایمان ہمدانی کو وہاں ایک عجیب سا سناٹا محسوس ہوا' تب ہی وہ فوراً واپسی کے لیے پلٹی تھی اور اسی کوشش میں بے ساختہ ہی وہ قریب کھڑے گم صم سے سفیر علی سے ٹکرا گئی۔ اس نے قطعی نادانستگی میں سنبھلنے کے لیے سفیر علی کا بازو تھاما تھا اور پھر جیسے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔

کس قدر حیرانی سے اس نے خاموش کھڑے سفیر علی کو دیکھا تھا پھر غصے سے بے حال ترش لہجے میں ڈپٹتے ہوئے بولی۔

''تمہیں اتنا تیز بخار ہے اور تم نے کسی کو بتایا تک نہیں......؟ کیوں......؟ خود کو بے جان سمجھتے ہو...... آخر اس قدر فرماں برداری سے ثابت کیا کرنا چاہتے ہو تم؟ بولو' جواب دو......؟'' اپنا سرد ہاتھ اس کے سینے پر مارتے ہوئے وہ چلائی تھی لیکن سامنے کھڑا وہ خوبرو سا لڑکا اب بھی خاموش تھا۔

''پلیز اسٹاپ اٹ سفیر...... میں تمہاری اس مسلسل خاموشی اور سنجیدگی سے تنگ آ

گئی ہوں۔ نہیں چاہئے مجھے ایسا بے زبان غلام...... میں ابھی پاپا سے بات کر کے تمہارا فیصلہ کرواتی ہوں۔'' اسے مسلسل خاموش پا کر اس نے پھر بری طرح سے پاؤں پٹخے تھے۔ جواب میں خاموشی سے سفیر علی نے اپنی سرخ سرخ نگاہوں میں بھر آنے والے آنسو بمشکل چھپا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

''سوری۔'' کتنی مشکل سے وہ کہہ پایا تھا' تب ہی خفا خفا سی ایمان ہمدانی نے اسے بستر پر لیٹنے کا حکم دے کر چوکیدار کو آواز دے ڈالی' پھر اپنے فیملی ڈاکٹر کو بلانے کا حکم دیتے ہوئے وہ وہیں سفیر کی چارپائی کے قریب موڑھا گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

''ایک دم پاگل ہو تم تو...... ذرا جو اپنا کوئی خیال ہو تمہیں۔ ہر وقت حکم کے غلام بنے رہتے ہو' مجال ہے جو کبھی انکار لبوں پر آ جائے تمہارے۔'' اس کی پیشانی چھو کر ٹمپریچر کی حرارت محسوس کرتے ہوئے وہ بڑبڑائی تھی پھر ملازم سے ٹھنڈا پانی اور ایک صاف کپڑا منگوا کر وہ کتنی ہی دیر تک اس کی پیشانی پر ٹھنڈی پٹیاں رکھتی رہی تھی' یہاں تک کہ ان کے فیملی ڈاکٹر خالد رضا صاحب بھی وہاں چلے آئے' پھر سفیر کا اچھی طرح چیک اپ کرنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ پریشانی والی کوئی بات نہیں' دراصل بارش میں بھیگنے اور تھکن کی شدت کے باعث اسے بخار نے جکڑ لیا تھا' لیکن اب بخار کی شدت میں قدرے کمی آ گئی تھی اور امکان تھا کہ اگلے دو' تین گھنٹوں میں بخار مکمل اتر جاتا۔

ڈاکٹر نے سفیر کو ہدایت بھی کی تھی کہ وہ دو' تین روز تک مکمل آرام کرے اور اپنا خیال رکھے۔ ساتھ میں انہوں نے کچھ ضروری دواؤں کے نام بھی ایک کاغذ پر گھسیٹ کر پرچی ایمان ہمدانی کو تھما دی' پھر اسے پریشان نہ ہونے کی نصیحت کرتے ہوئے وہ وہاں سے چلے گئے تو ایمان نے فوراً ملازم کو پرچی تھما کر اپنے پرس سے پیسے نکالتے ہوئے ادویات لانے کا کہا' پھر سفیر کے بستر پر پڑا کمبل اس کے گرد اچھی طرح لپیٹتے ہوئے بولی۔

''ڈاکٹر نے دو' تین روز تک مکمل آرام کرنے کا کہا ہے' خبردار جو اب بستر سے نکلے تو...... میں ابھی ملازم کے ہاتھ گرم دودھ بھجواتی ہوں' پی لینا اور دوا بھی کھا لینا' او کے۔'' وہ اس وقت صرف اور صرف ایک اچھی دوست لگ رہی تھی' تب ہی سفیر علی خان کی آنکھیں اظہار تشکر سے نم ہو گئیں۔

''تھینک یو۔'' کس قدر عقیدت سے اس نے کہا تھا' جواب میں پر خلوص ایمان



ہمدانی نے ایک دوستانہ مسکراہٹ اس کی طرف اچھال دی۔

''تھینک گاڈ کہ تم نے سوری کے علاوہ کچھ کہنا تو سیکھا......'' مہربان نگاہوں سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا' پھر اس کے دھیمے سے مسکرانے پر وہ وہاں سے واپس چلی آئی اور شام میں جب وہ احمد ہمدانی صاحب کے ہمراہ دوبارہ اس کی عیادت کو گئی تو وہ پہلے کی نسبت کافی فریش تھا۔ بخار بھی خاصی حد تک کم ہو گیا تھا' احمد ہمدانی صاحب' تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھے' اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور وہ چپ چاپ بیٹھی اور اسے مدھم لہجے میں بولتے ہوئے سنتی رہی۔

کتنا پیارا لہجہ تھا اس کا' کس قدر مٹھاس تھی اس کے لفظوں میں' جیسے سچ مچ لبوں سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ کچھ لوگ واقعی اتنا خوب صورت بولتے ہیں کہ انہیں گھنٹوں سن کر بھی سماعتیں سیراب ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ اس روز' وہاں سے اٹھتے وقت اس نے سوچا تھا کہ یہ شخص جب اتنا خوب صورت بولتا ہے تو نجانے گاتا کتنا خوب صورت ہو گا؟

اور اپنی اسی سوچ کو اس نے اگلے روز اس پر کھول بھی دیا۔

''سنو...... تم اچھا بولتے ہو' یقیناً اچھا گا بھی سکتے ہو...... تو پھر تم گاتے کیوں نہیں؟ حسب معمول اس کی چارپائی کے قریب دھرے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے اس نے دوستانہ انداز میں پوچھا تھا' جواب میں افسردہ سے سفیر علی کے جامد لبوں پر ایک پھیکی سی مسکان بکھر گئی۔

''میں تنہائی میں کبھی کبھی گنگناتا ہوں ایمان جی' لیکن میری آواز کو توجہ سے سننے کی فرصت کسی کے پاس نہیں ہے' بس اسی لیے کسی کے سامنے کبھی اس فن کا اظہار نہیں کیا۔''

گزشتہ ایک سال میں وہ پہلی مرتبہ یوں تفصیل سے اس کے ساتھ ہم کلام ہوا تھا جس سے حوصلہ پا کر وہ مزید بے تکلفی سے بولی۔

''مجھے سلو گانے والے بہت پسند ہیں' اگر تم کلاسیکل گائے ہو تو پلیز کچھ سناؤ ناں......'' اس وقت اس نے سراسر جھوٹ سے کام لیا تھا' کیوں کہ اسے کسی بھی قسم کے میوزک سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کا یہ راز سفیر علی قطعی نہیں جانتا تھا' تب ہی قدرے مسرور ہو کر بولا۔

''آپ میرا مذاق تو نہیں اڑائیں گی؟''

''نہیں۔''

اس کے معصومانہ لہجے پر فوراً اس نے نفی میں سر ہلایا تھا‘ جس کے جواب میں
قدرے حوصلہ پا کر سنجیدہ سے سفیر علی نے اپنی غلافی پلکیں موندلیں پھر کچھ پل خاموشی کی نظر
کرنے کے بعد دھیمے سروں میں گنگنانے لگا۔

’’ہو سکے تو میرا ایک کام کرو
شام کا اک پہر میرے نام کرو
دل تو پہلی نظر میں تمہارا ہوا
تم ہو جیتے ہوئے اور میں ہارا ہوا
میری بانہوں کے گھر میں قیام کرو
شام کا اک پہر۔ میرے نام کرو‘‘

دھیمے سُروں میں ڈوب کر وہ اتنی خوب صورتی سے گا رہا تھا کہ میوزک سے قطعی دل
چسپی نہ رکھنے والی ایمان ہمدانی بھی یک ٹک سحر زدہ سی ہو کر اسے چپ چاپ سنتی رہی‘ یہاں
تک کہ اس نے آنکھیں کھول دیں اور گانا بند کر دیا۔

’’ارے...... تم رک کیوں گئے...... پلیز اور گاؤ ناں.....‘‘ اسے خاموش پا کر وہ
دوبارہ اصرار کرتے ہوئے بولی تھی‘ جواب میں سفیر علی نے ذرا سا مسکرا کے پھر سے کوئی گیت
گنگنانا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ اگلے بیس‘ پچیس منٹ تک یونہی چلتا رہا۔ پھر شام گہری ہو
جانے کے باعث وہ دل کے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں
چلی آئی اور سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ کیسے سفیر علی کے فن کو زنگ لگنے سے بچائے؟ سوچ سوچ
کر یہی حل سمجھ میں آیا کہ اسے سفیر علی کے سلسلے میں یقیناً اپنے ڈیڈ سے بات کرنی چاہیے

تب ہی اسی رات‘ کھانے کے دوران اس نے احمد ہمدانی صاحب کو سفیر علی کی اچھی
آواز کے بارے میں بتایا اور ان سے ریکویسٹ کی کہ وہ لازماً اپنے کسی شوبز سے تعلق رکھنے
والے دوست کی مدد سے سفیر علی کو لوگوں کے سامنے لائیں اور پھر یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا
کہ دو تین ماہ کے بعد ہی۔ فیر کو اس کے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔

کتنا خوش دکھائی دے رہا تھا وہ اس روز‘ جب ایمان نے اسے بتایا کہ اسے کل ہی
ایک بہت معروف کمپنی کے لیے گانے کے سلسلے میں انٹرویو دینے جانا ہے اور پھر جب اگلے
ہی روز وہ خوشی خوشی انٹرویو کے لیے تیار ہوا تو ایمان نے اس کی تیاری میں بھی بھرپور طریقے



سے اس کی مدد کی تھی اور اسے وقت رخصت ڈھیروں تسلی بھی تھمائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب
اس نے ہمزاد میوزیکل کمپنی کے لیے پہلا انٹرویو دیا تو وہ خاصا پر اعتماد تھا۔ جس کا رزلٹ یہ ملا
کہ اسے دو‘ تین دن کے غور و خوض کے بعد ہمزاد میوزیکل کمپنی کے لیے اپائنٹ کر لیا گیا۔ اس
روز وہ خوشی سے اتنا بے حال تھا کہ پوری رات گھر ہی نہ لوٹا اور بے قرار سی ایمان ہمدانی
مضطرب دل و دماغ کے ساتھ فقط اس کی راہ دیکھتی رہی۔

وقت کے ساتھ ساتھ‘ اگلے کچھ ہی عرصے میں سفیر نے اپنی محنت اور کوششوں سے
اپنا ایک مقام بنا لیا‘ کل تک لوگ جس کے نام سے بھی آشنا نہیں تھے‘ اب وہی ہزاروں‘
لاکھوں دلوں پر راج کر رہا تھا۔ اس کے میوزیکل شو ہر شہر میں ہاؤس فل ثابت ہو رہے تھے‘
دیکھتے ہی دیکھتے وہ بے شمار لوگوں کا ہیرو بن بیٹھا تھا لیکن ہمدانی ہاؤس کے در و دیوار میں اس کی
حیثیت قطعی نہیں بدلی۔

ایمان ہمدانی اب بھی پہلے کی مانند‘ بڑی دھونس کے ساتھ اسے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور
کرتی تھی‘ اس کا خواہ کتنا ہی اہم شو کیوں نہ ہوتا‘ وہ فوراً کینسل کر دیتا اور ایمان ہمدانی کو اس کی خبر
بھی نہ ہوتی۔ ایک روز یونہی لانگ ڈرائیو کے بعد جب وہ لوگ خاصی دور نکل آئے تو شام کی مچلتی
ہواؤں کو خراج تحسین پیش کرتی ایمان ہمدانی نے بہت خلوص کے ساتھ اس سے پوچھا تھا۔

’’سیفی! تم نے کبھی بتایا نہیں کہ تمہارے ممی ڈیڈی کہاں ہیں‘ کس حال میں ہیں اور
یہ بھی کہ جب تم گاتے ہو تو تمہاری آواز میں اتنا درد کیوں سمٹ آتا ہے؟‘‘

اس کے سوال پر سلو ڈرائیونگ کرتے سفیر علی خان کے ہاتھ دھیرے سے لرزے
تھے۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی چھلکی تھی لیکن وہ ہمیشہ کی طرح ضبط کا پہاڑ بنا کہہ رہا تھا۔

’’میں اس دنیا میں بالکل اکیلا ہوں ایمان جی‘ کوئی نہیں ہے جو میری خوشی اور دکھ
کے تعلق کو شیئر کرے۔ نہ دعائیں کرنے والے لب‘ نہ راستہ دیکھنے والی فکر مند نگاہیں‘ عرصہ ہوا
ہر قسم کے رشتہ سے آزاد ہوئے‘ اب تو ایک اپنا دم ہے اور یہ سانسوں کا سلسلہ‘ جو نجانے کب
تک ساتھ دے۔‘‘

’’اتنے مایوس کیوں ہو زندگی سے......؟ خدا نے تمہیں اچھی شکل دی ہے‘ اچھی آواز
دی ہے‘ سب سے بڑھ کر خود مختار بنایا ہے‘ تمہیں تو اس بزرگ و برتر کا شکر گزار ہونا چاہیے‘ الٹا
تم اس کی ذات سے مایوس ہو۔‘‘ ایمان کو اس کی افسردگی گراں گزر رہی تھی‘ تب وہ خاموش نہ

رہ سکا۔ جواب میں سنجیدہ سے سفیر علی نے بس سرسری ایک نگاہ اس پر ڈالی' پھر رخ پھیرتے ہوئے بولا۔

''رات کافی ہوگئی ہے' میرے خیال سے آپ کو واپسی کا ارادہ کر لینا چاہئے۔ یقیناً احمد صاحب آپ کو لے کر پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''ہاں چلو۔'' اس کے بات بدل لینے پر ایمان نے بھی مزید بحث و تکرار مناسب نہ سمجھی اور اسے واپسی کا حکم دے کر خاموشی سے گاڑی سے باہر دیکھنے لگی' جہاں روشن قمقمے دھیرے دھیرے تاریکی کا حصہ بن رہے تھے۔

وقت کتنی جلدی بدل جاتا ہے' اس کا اندازہ ابھی تک ایمان ہمدانی کو نہیں تھا۔

اور شاید یہی وجہ تھی کہ ٹھیک پندرہ دنوں کے بعد جب ایک رات اس کے عزیز از جان پیارے پاپا احمد ہمدانی صاحب شدید ہارٹ اٹیک کے باعث اس سے ہمیشہ کے لیے دور چلے گئے تو وہ قطعی اس سچویشن کو قبول نہیں کر پائی' کتنا بھیانک دن تھا وہ جو کسک بن کر زندگی بھر کے لیے ایمان ہمدانی کی آنکھوں اور دل میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

کتنی بارش ہوئی تھی اس روز...... دن بھر بادل برسے تھے' رات میں بھی بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ ایسے میں اس کے چچا توصیف ہمدانی اپنی بیوی اور دونوں بچوں کے ساتھ مری کے ٹور پر نکلے ہوئے تھے' محل جیسے گھر میں وہ اپنے ڈیڈ احمد ہمدانی صاحب اور ایک ملازم کے ساتھ اکیلی تھی۔ شب کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ملازم بھی اپنے بیوی بچوں کا صدقہ دے کر رخصت ہو گیا تھا' تب تقریباً دو گھنٹے کے بعد اس کی آنکھ ہلکے سے کھٹکے سے کھلی تھی اور اس نے کمرے سے باہر نکل کر اپنے ڈیڈ کو کوریڈور میں ٹہلتے پایا تھا' جب ہی وہ قدرے حیران حیران سی ان کے قریب چلی آئی۔

''کیا بات ہے ڈیڈ...... کیا نیند نہیں آ رہی؟'' ان کے قریب پہنچ کر اس نے پوچھا تھا' جواب میں مضطرب سے احمد ہمدانی صاحب نے چونک کر اس کی سمت نگاہ کی پھر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''ہاں...... میں ٹھیک ہوں وہ...... بس کچھ پیاس لگی تھی تو میں یہاں چلا آیا' آپ آرام کرو بیٹے' جاؤ جا کر سو جاؤ۔'' اسے بہلاتے ہوئے انہوں نے گویا بھرپور ضبط کا مظاہرہ کیا تھا ورنہ سینے میں بائیں جانب اٹھنے والا شدید درد انہیں نڈھال کر رہا تھا تب وہ اگلے ہی پل



قریبی صوفے پر ڈھے گئے تھے اور انہیں یوں صوفے پر لڑھکتے دیکھ کر حیران حیران سی ایمان ہمدانی کی تو گویا جان ہی نکل گئی۔ کتنی ہی دیر وہ انہیں جھنجوڑتے ہوئے ہوش سنبھالنے پر مجبور کرتی رہی تھی لیکن ان سے تو گویا خود کو سنبھال پانا ممکن ہی نہیں رہا تھا' تب ہی بدحواس ایمان ہمدانی چیخ چیخ کر سب کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے پھر ننگے پاؤں ہی سفیر علی کے کوارٹر کی جانب بھاگی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی کا سلسلہ اب بھی جاری تھا لیکن وہ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج سے بے نیاز کانپتے ہاتھوں سے سفیر علی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتی رہی' پھر جس وقت وہ نیند سے جاگا اور اس نے رات کے تقریباً دو' ڈھائی بجے بدحواس سی ایمان ہمدانی کو اپنے کمرے کے باہر کھڑے پایا تو بری طرح پریشان ہو گیا لیکن اس سے کہیں درجے بڑھ کر پریشان تو اس وقت ایمان ہمدانی تھی کہ جس کے صاف ستھرے گلابی پاؤں اس وقت کیچڑ میں لت پت ہو رہے تھے اور وہ بری طرح آنسو بہاتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔

''سیفی...... سیفی...... وہ...... وہ پاپا کو...... پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے' تم پلیز میرے ساتھ چلو' پلیز......'' اسے بازو سے تھام کر کھینچتے ہوئے وہ بے بسی سے چلائی تھی' پھر قدرے ہونق سے سفیر علی کے ساتھ واپس دوڑ آئی تھی' لیکن صد افسوس کہ تب تک زندگی کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور وہ صوفے پر بے ترتیب پڑے زندگی کی قید سے آزاد ہو گئے تھے۔

پل دو پل میں ہی تقدیر نے پلٹا کھایا تھا لیکن وہ اس حادثے کے بعد یوں ٹوٹ کر بکھری کہ پھر سمٹنے میں کئی سال لگ گئے۔

گو احمد ہمدانی صاحب کی رحلت کے بعد سفیر علی خان اس کا اپنی جان سے بھی زیادہ خیال رکھنے لگا تھا بالکل موم کی گڑیا کی مانند اسے بہلائے رکھتا تھا لیکن وہ ایک خلا جو احمد صاحب کی جدائی کے بعد اس کے دل میں رہ گیا تھا' وہ کبھی پُر نہ ہو سکا۔

احمد ہمدانی صاحب کی زندگی کے ساتھ ہی ان کے طے کردہ تمام اصول و ضوابط ان کے تمام فیصلے' تمام ادھورے منصوبے سب ٹوٹ کر رہ گئے' یہاں تک کہ ان کی رحلت کے ایک ہفتے بعد ہی اس کے چچا توصیف ہمدانی اور چچی نورین ہمدانی نے کاہلی اور حرام خوری کا بے بنیاد الزام لگا کر سنجیدہ سے سفیر علی کو بھی بے عزتی کر کے گھر سے نکال دیا۔ انہیں یہ قطعی گوارہ نہیں تھا کہ ان کی جائیداد اور آفس کا کوئی اور دھیان رکھے۔ نیز وہ کسی ایسے شخص کو مفت میں ہر ماہ

بھاری تنخواہ دیں کہ جسے صرف اور صرف ان کی یتیم بھتیجی کی خدمت گزاری کے لیے رکھا گیا ہو۔

ہمدانی ہاؤس سے رخصتی کے وقت وہ کتنا نڈھال دکھائی دے رہا تھا' یہ ماسوائے ایمان ہمدانی کے اور کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ کتنی عادت پڑ گئی تھی اسے' اپنے دل کی ہر بات ایمان ہمدانی سے شیئر کرنے کی اور وہ بھی تو اس کی بہت عادی ہو گئی تھی لیکن اب حالات اس کے اختیار میں نہیں تھے' تب ہی گم صم سی ایمان ہمدانی فقط ایک بے بس پرندہ کی مانند ہمدانی ہاؤس کے سنہری پنجرے میں چپ چاپ قید ہو کر رہ گئی تھی۔

وقت بہت بے رحم ہو گیا تھا' اب اس کی زندگی کا ہر عمل' ہر فیصلہ اس کے چچا اور چچی کے حکم کا محتاج ہو کر رہ گیا۔ ساری آزادی سلب کر لی گئی تھی' اب تو ہفتوں بعد بھی اس گھر میں سفیر علی خان کی آمد پر واضح ناگواری کا اظہار ہوتا تھا لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ہفتوں کے بعد بھی سفیر علی خان کو ہمدانی ہاؤس میں آنے سے روک دیتی؟ یہ سب بھلا اس کے اختیار میں ہی کہاں تھا کیوں کہ جن آنکھوں کے آنسو اس نے خود اپنی ہتھیلیوں سے پونچھے تھے اب وہ انہی آنکھوں میں پھر سے آنسو کیسے بھر دیتی؟ وہ ایک شخص کہ جسے اس کے پیارے ڈیڈ نے خود اس کا خیال رکھنے کے لیے چنا تھا' وہ آج ان کی رحلت کے بعد کیسے اس سے آنکھیں پھیر لیتی' سہارا دے کر' پھر کیسے دوبارہ زمین پر گرا دیتی اسے؟ تب ہی تو اتنی الجھ کر رہ گئی تھی وہ کہ نہ تو اسے صاف لفظوں میں گھر آنے سے منع کر سکتی تھی اور نہ ہی اس کے پرخلوص جذبوں کی توہین گوارہ کر سکتی تھی۔ سو بہتر یہی لگا کہ وہ اپنے رویے کو روڈ کرے تاکہ سفیر علی خان ایک دن خود ہی اس کی طرف سے مایوس ہو کر ہمدانی ہاؤس میں آنا جانا چھوڑ دے اور آج کل وہ انہی کوششوں میں تھی۔ تب ہی اس کا سامنا کم سے کم کر رہی تھی کہ اسے قطعی اپنے چچا اور چچی کے ہاتھوں اس کی بے وجہ انسلٹ گوارہ نہیں تھی۔



''بی بی جی! آپ کو توصیف صاحب ٹی وی لاؤنج میں یاد فرما رہے ہیں۔''

وہ گم صم اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی بیٹھی تھی جب ملازمہ نے آ کر اسے اطلاع دی' جواب میں وہ فوراً اٹھ کر دوپٹہ اچھی طرح سر پر جماتے ہوئے ملازمہ کے ساتھ ہی ٹی وی لاؤنج میں چلی آئی جہاں توصیف صاحب کے ہمراہ اس وقت ان کی بیگم نورین ہمدانی صاحبہ بھی براجمان تھی۔



''جی انکل' آپ نے ہمیں یاد فرمایا؟'' ٹی وی لاؤنج میں ان کے سامنے والے صوفے پر ٹکتے ہوئے اس نے آہستگی سے پوچھا تھا' جواب میں خفا خفا سے توصیف ہمدانی بھاری لہجے میں بولے۔

''ہاں...... بہت ضروری بات کرنی تھی تم سے۔ لیکن اس سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ پرسوں وہ دو ٹکے کا گویا پھر کیوں آیا تھا یہاں؟ جب ہم اسے یہاں سے دفع دور کر چکے ہیں تو کیوں ہر ہفتے منہ اٹھا کر چلا آتا ہے یہاں......؟'' توصیف صاحب کے غصیلے لہجے سے لگ رہا تھا کہ اس بار وہ سفیر علی خان کی ہمدانی ہاؤس میں آمد پر شدید خفا تھے۔ تب ہی پریشان سی ایمان ہمدانی کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں' اسے فوری طور پر سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ سفیر علی خان کی صفائی میں کیا کہے اور کیسے کہے' لہٰذا مرے مرے سے لہجے میں بولی۔

''وہ...... وہ مجھے اپنے ایک شو میں انوائیٹ کرنے آیا تھا۔''

''شٹ اپ ایمان...... میری ہی ناک کے نیچے یہ چوہے بلی کا کھیل' اب بہت ہو گیا۔ وہ تو لاوارث ہے آوارہ ہے' لیکن تم تو عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔ پھر اب تم کوئی بچی نہیں ہو کہ ایسے کھلونوں سے بہلتی رہو' اب تم ایک میچور لڑکی ہو' اپنی نہیں تو کم از کم ہماری ہی عزت کا خیال کر لو......'' اس کے مریل سے لہجے پر وہ دھاڑ کر بولے تھے' جواب میں بدحواس ایمان ہمدانی کی بڑی بڑی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئیں۔

''آ...... آپ بالکل غلط سوچ رہے ہیں انکل...... میں نے کبھی ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا کہ اس گھر کی عزت کو داغ لگے۔'' اپنی صفائی میں' اپنے ہی کردار کے لیے آواز اٹھاتے ہوئے اس کے لہجے میں کپکپاہٹ نمایاں تھی۔

''بس...... کوئی صفائی نہیں چاہئے مجھے...... اس قصے کو یہیں پر ختم کرو اور کان کھول کر اچھی طرح سے سن لو کہ آئندہ میں تمہیں اس دو ٹکے کے گویے کے ساتھ کبھی نہ دیکھوں' سمجھیں تم......؟'' اس کی وضاحت پر فوراً ہی ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوکتے ہوئے وہ پھر چلائے تھے' جواب میں زخم زخم سی ایمان ہمدانی نے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

''گڈ...... اب میں تمہیں وہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ جس کے لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے' وہ ایکچولی بات یہ ہے کہ کل ہی میں نے بڑے بھیا کے وکیل کی وساطت سے ان کی ول حاصل کی ہے' تو مجھے کل ہی یہ معلوم پڑا کہ بڑے بھیا نے یہ ہمدانی ہاؤس تمہارے

نام کیا ہے‘ اس کے علاوہ بزنس کا ایک چوتھائی حصہ جو تقریباً ساٹھ کروڑ روپے کے لگ بھگ ہے‘ وہ بھی تمہیں ملے گا‘ باقی ان کی جو چند زمینیں وغیرہ تھیں اور جو بزنس کا بقیہ حصہ ہے‘ وہ انہوں نے میرے‘ یعنی اپنے چھوٹے بھائی اور میرے بچوں یعنی اپنے بھتیجی بھتیجوں کے نام کیا ہے‘ تم اگر چاہو تو ول دیکھ سکتی ہو‘ یا پھر بڑے بھیا کے وکیل سے کنفرم کر سکتی ہو۔“

نہایت عجیب سا لہجہ تھا ان کا لیکن چپ چاپ آنسو بہاتی ایمان ہمدانی نہایت شاکڈ رہ گئی۔ خاموشی سے بہتے اس کے آنسو گالوں اور پلکوں پر ہی اٹک گئے‘ کس قدر بے یقینی سے اس نے اپنے سامنے بیٹھے اس بے ایمان شخص کو دیکھا تھا کہ جو دھوکے دہی سے اس کی اربوں کی جائیداد پر قابض ہو کر خود کو سچا ثابت کر رہا تھا۔

”اور ہاں ......کیپٹن شجاع آفندی اگلے ہفتے یہاں آ رہا ہے‘ اس نے کچھ ہی روز قبل تمہیں پرپوز کیا ہے‘ لیکن میں جب تک تمہارے فیصلے سے آگاہ نہیں ہو جاتا‘ اسے کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں‘ ویسے شجاع کو تو تم اچھی طرح جانتی ہی ہو‘ تمہارے بچپن کا دوست ہے‘ پھر بڑے بھیا کا بھی بہت لاڈلا رہا ہے‘ تم اچھی طرح سے سوچ سمجھ لو‘ ہمیں کسی قسم کی کوئی جلدی نہیں ہے‘ ویسے تمہاری شادی کے بعد تمہاری چچی کا خیال ہے کہ ہم لوگ یہ گھر اور تمہارا حصہ تمہارے حوالے کر کے ہمیشہ کے لیے نیویارک چلے جائیں تاکہ تم یہاں اپنے شوہر کے ساتھ خوش و خرم اور اپنی مرضی کے مطابق رہ سکو۔ بہرحال تم اچھی طرح سے سوچ سمجھ لو پھر مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔ میں شجاع کے والدین سے خود ہی بات کر لوں گا۔“

اسے گم صم پا کر وہ فوراً ہی بات بدل گئے تھے تاکہ جائیداد کی طرف سے اس کا دھیان بٹ جائے لیکن وہ تو گم صم سی یوں خاموش بیٹھی تھی گویا پتھر ہو گئی ہو اور اب خواہ لاکھ طوفان آئیں یا آندھیاں چلیں اسے کوئی پروا ہی نہ ہو۔

اور پروا ہوتی بھی کیوں؟ وہ کہ جن کے دم سے اس کی سانسیں جڑی تھیں‘ جب وہی نہیں رہے تھے تو دھن دولت کے لیے خون کے آنسو رونا بھلا کہاں کی دانش مندی تھی لیکن اس کے باوجود نجانے کیوں اس رات وہ اپنی بے بسی اور تقدیر کی بے رحمی پر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور اتنا روئی تھی کہ اگلے روز جب اس نے بستر سے نکلنے کی کوشش کی تو پورا بدن آگ کی مانند جل رہا تھا اور وہ بے حد نڈھال تھی۔

موسم بہت بدل گیا تھا‘ معطر ہواؤں میں ہلکی ہلکی نمی اور خنکی کا احساس خاصی حد تک



بڑھ گیا تھا۔ ہر طرف کھلے رنگارنگ پھول اور سبزہ نگاہوں کو عجیب سی تراوٹ بخش رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی ذات پر جمے اداسی کے گہرے جمود کو توڑ نہ پائی۔

گھر سے باہر نکلنا بھی اس نے تقریباً چھوڑ ہی دیا تھا‘ اس دوران سفیر علی خان نے بھی دو‘ تین مرتبہ ہمدانی ہاؤس کے چکر لگائے لیکن ہر مرتبہ ایمان نے ملازم سے یہی کہوایا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ نتیجتاً وہ مایوس ہو کر گیٹ کے باہر سے ہی واپس چلا جاتا۔

کیپٹن شجاع آفندی اپنے والد صاحب کی رحلت کے باعث تاحال ہمدانی ہاؤس کا چکر نہیں لگا پایا تھا۔ اور توصیف صاحب بھی آج کل نجانے کن مصروفیات میں الجھے ہوئے تھے کہ گھر پر دکھائی ہی نہیں دیتے تھے۔ نورین بیگم کے مزاج ویسے ہی نہیں ملتے تھے‘ تیسرا کوئی ایسا فرد نہیں تھا کہ جس سے بات کر کے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی۔ تمام دوست احباب سے عرصہ ہوا وہ کنارہ کشی کر چکی تھی۔ تب ہی اس روز جب دل کی بے کلی حد سے سوا ہو گئی تو وہ اپنی گاڑی کی چابیاں اٹھا کر ساحل سمندر کی طرف نکل آئی کہ سمندر کی وسعتوں میں چنچل لہروں کو مچلتے ہوئے دیکھنا اسے کسی حد تک خود سے بے نیاز کر دیتا تھا۔

آسمان اس وقت بھی سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور سمندر کے وسیع ساحل پر ہواؤں کی چھیڑ خانی بھی بدستور جاری تھی لہٰذا وہ کتنی ہی دیر وہاں کھڑی چپ چاپ موجوں کے تلاطم کو دیکھتی رہی پھر کافی دیر کے بعد اس نے جونہی واپسی کے لیے قدم اٹھائے بالکل بے ساختہ ہی نگاہ کچھ ہی فاصلے پر براجمان سنجیدہ سے سفیر علی خان پر پڑی‘ جو اس وقت دنیا جہاں سے بے نیاز بنا ایک چھوٹی سی چٹان پر اداس بیٹھا تھا اور غالباً رو بھی رہا تھا۔ کچھ ہی فاصلے سے وہ اس کے لبوں کو حرکت کرتے دیکھ کر بخوبی یہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ گنگنا رہا تھا۔

تب بہت دنوں کے بعد وہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر اپنے اٹھتے ہوئے قدموں کو اس کی طرف بڑھانے سے روک نہیں پائی اور چپ چاپ جا کر اس کے دائیں کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ نتیجتاً وہ جو اپنے ہی آپ میں مدہوش کچھ گنگنا رہا تھا‘ فوراً خاموش ہو کر گم صم سی ایمان ہمدانی کو قدرے تحیر کے ساتھ دیکھنے لگا پھر سرعت سے رخ پھیر کر اپنی پلکوں کے آنسو انگلی کے پوروں پر چنتے ہوئے وہ خاصے خوش گوار لہجے میں بولا۔

”ارے .....آپ یہاں.....؟“

''کیوں..... میں کیا یہاں نہیں آسکتی؟ ویسے بھی مجھ پر ساحل سمندر کا نظارہ کرنے کے لیے تاحال کوئی پابندی عائد نہیں ہوئی ہے۔''

''آئی ایم سوری' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ بہر حال آپ کو یہاں پورے سترہ دنوں کے بعد دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہو رہی ہے وہ میں چاہ کر بھی لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔''

اس کے دوبدو لہجے پر وہ فوراً ہی معذرت کرتے ہوئے قدرے مسرور سے لہجے میں بولا تھا' جواب میں سنجیدہ سی ایمان ہمدانی اس کے بے پایاں خلوص پر دھیمے سے مسکرادی' پھر قدرے فریش لہجے میں بولی۔

''ارے..... تم نے تو ایک ایک دن کا خوب حساب رکھا ہوا ہے۔ یہ بتاؤ کہ آج کل کیا مصروفیات ہیں اور تمہارا وہ سنگنگ کا شوق کس حد تک تکمیل کو پہنچا؟''

''پتہ نہیں۔''

''کیوں.....؟'' اپنے فریش سوال کے جواب میں وہ اس کا بے نیازانہ سا جواب سن کر کسی قدر چونکی تھی جواب میں وہ اداسی سے بولا۔

''آپ جب تک مجھے گاتے ہوئے نہیں دیکھیں گی' نہیں سنیں گی' تب تک میرے لیے سب کچھ بے کار ہے ایمان جی.....''

''تم تو پاگل ہو سیفی' خیر یہ بتاؤ کہ شادی وادی کا پروگرام کب تک ہے؟'' اس کے بے تحاشا خلوص پر وہ ایک مرتبہ پھر ندامت سے مسکرائی تھی تاہم سنجیدہ سے سفیر کا لہجہ ہنوز اداس رہا۔

''میں شاید زندگی بھر شادی نہ کرسکوں ایمان جی۔''

سمندر کی مچلتی موجوں پر نگاہیں جمائے وہ کسی قدر اداسی سے بولا تھا۔ جواب میں ایمان ہمدانی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں.....؟''

''کیوں کہ میں نے جس لڑکی سے پیار کیا ہے وہ مجھے مل نہیں سکتی اور دوسری کسی لڑکی کے بارے میں' میں سوچ نہیں سکتا۔''

''مل کیوں نہیں سکتی' کیا شادی شدہ ہے وہ؟''

اسے گمان تو تھا کہ سنجیدہ سا نوجوان عشق کا روگی ہے' پھر آج اس کے ہی لبوں سے تصدیق بھی ہوگئی تھی۔ تب ہی وہ بے ساختگی سے بولی تو سفیر علی خان نے اپنی نگاہیں سمندر کی



چنچل موجوں سے ہٹالیں' پھر سرسری سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''شادی شدہ نہیں بلکہ غیر ذات کی ہے وہ' میرے اور اس کے اسٹینڈرڈ میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ پھر وہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے' جب کہ میں.....'' میرا تو نہ کوئی خاندان ہے' نہ نشان۔''

''او گاڈ' پتہ نہیں یہ فرسودہ رسمیں کب پیچھا چھوڑیں گی ہمارا۔ لیکن تم ایسا کیسے سوچ سکتے ہو سیفی۔'' اس کے بجھے بجھے سے انداز پر وہ قدرے اکتا کر بولی تھی' جواب میں ایک پھیکی سی مسکراہٹ سفیر علی خان کے اداس لبوں پر بکھر گئی۔

''کیوں..... میں نے کچھ غلط کہا ہے' اور پھر آپ کے ہاں بھی تو غیر کاسٹ میں شادی نہیں کی جاتی۔''

''ہماری بات اور ہے سیفی' لیکن میں دل سے ان جاہلانہ رسوم کو نہیں مانتی۔ بہر حال تم فوراً مجھے اس لڑکی سے ملواؤ' میں خود اس سے اور اس کے گھر والوں سے بات کرلوں گی۔''

وہ کسی قدر ایموشنل ہوئی تھی جب کہ اداس سے سفیر علی نے ہوش کا دامن پکڑ لیا تب ہی وہ چٹان سے اٹھ کر اس کے روبرو کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''پلیز چھوڑیں ناں ایمان جی۔ اور یہ بتائیں کہ آپ اب مجھ سے دور کیوں بھاگ رہی ہیں.....؟ کیوں ملنا پسند نہیں کرتیں.....؟ میں اتنا برا تو نہیں ہوں.....''

اس کے سادہ سے لہجے میں کچھ تھا کہ جو دل کو جکڑ لیتا تھا تب ہی وہ نگاہیں چراتے ہوئے بولی۔

''میری شادی ہو رہی ہے سیفی..... بس اسی لیے انکل اور آنٹی چاہتے ہیں کہ میں محتاط رہوں اور دنیا کو کسی بھی قسم کی الزام تراشی کا موقع نہ دوں' لیکن خدا گواہ ہے سیفی..... کہ میرا دل تمہارے لیے بالکل صاف ہے' تم خواہ کہیں بھی رہو' میں ہر پل تمہیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھتی ہوں۔'' خلوص بھرے لہجے میں وہ نجانے کیا کیا کہہ رہی تھی لیکن سفیر علی خان کی سماعتیں تو جیسے کچھ سننا ہی بھول گئی تھیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ وہ کتنی حیرانی سے خوب صورت ایمان ہمدانی کو دیکھ رہا تھا جو بالکل پاس ہو کر میلوں کے فاصلے پر دکھائی دینے لگی تھی تب فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھالا' پھر بمشکل دھیمے لہجے میں بولا۔

''وہ..... میرا ایک پروگرام شروع ہونے والا ہے' مجھے اس میں شرکت کرنی ہے۔''

"میں چلتا ہوں ایمان جی، آپ پلیز اپنا بہت خیال رکھیے گا۔" کہنے کے ساتھ ہی لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا جب کہ حیران سی ایمان ہمدانی وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی۔



ہم تھے جن کے سہارے، وہ ہوئے نہ ہمارے
ڈوبی جب دل کی نیا، سامنے تھے کنارے
یوں تو دنیا بسے گی، تنہائی پھر بھی ڈسے گی
جو زندگی میں کمی تھی، وہ کمی تو رہے گی
ہم تھے جن کے سہارے، وہ ہوئے نہ ہمارے

درد سے نڈھال، غم سے ڈوبی آواز میں پلکیں موندے وہ اردگرد سے قطعی بے نیاز ہو کر گا رہا تھا اور نیچے اس کے ہزاروں مداح جیسے اس کی آواز کے سحر میں جکڑے جا رہے تھے۔ اس کا انداز اتنا بکھرا ہوا تھا کہ بہت سی لڑکیاں تو باقاعدہ رو بھی پڑی تھیں لیکن وہ کسی کی سمت نہیں دیکھ رہا تھا۔

ہے سبھی کچھ جہاں میں، دوستی ہے وفا ہے
اپنی ہی کم نصیبی، ہم کو نہ کچھ بھی ملا ہے
ہم تھے جن کے سہارے، وہ ہوئے نہ ہمارے

میوزک ہال کے ساکت ماحول میں اس کی پُر درد آواز سریلی گھنٹیوں کی مانند گونج رہی تھی۔ کتنی نگاہیں تھیں جو اشتیاق سے اس پر جمی ہوئی تھیں، کتنے ہی دل تھے جو اس سے محض آٹوگراف لینے کے لیے مچل رہے تھے لیکن وہ سب سے بے نیاز اپنے ہی غم میں چُور گنگنا رہا تھا اور اس کے اس انداز پر اس کے مداحوں کی گویا جان نکل رہی تھی، پھر جب شو کے ختم ہونے کے بعد وہ میوزک ہال سے باہر آیا تو لوگوں کا ایک جم غفیر تھا جس نے اسے اپنے گھیراؤ میں لے لیا۔ لڑکیاں اس کے دیدار کے لیے مچلی جا رہی تھیں، لیکن وہ سب سے ایکسکیوز کرتا اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔

دل کا درد تھا کہ تھم ہی نہیں رہا تھا، آنکھ کے آنسو تھے کہ رو کے نہ رک رہے تھے، کیسی عجیب بے بسی تھی کہ وہ لاکھوں لوگوں کے درمیان رہ کر بھی خود کو ایک دم اکیلا محسوس کر رہا تھا۔



گو درد کے ساتھ اس کا پرانا واسطہ رہا تھا، یہ کوئی سال دو سال کی کہانی نہیں تھی بلکہ پچھلے ستائیس سالوں سے وہ دکھ سے منسلک رہا تھا۔ شاید اس وقت سے ہی کہ جب شعور سنبھالنے پر اسے یہ معلوم پڑا کہ وہ لاوارث خانے میں پلنے والا ایک لاوارث وجود ہے، ایک ایسا لاوارث وجود کہ جس کی ولدیت کے خانے میں کسی عورت یا مرد کا کوئی نام ہی درج نہیں تھا۔ لاوارث خانے میں ہی اسے کسی نے بتایا تھا کہ جب وہ محض تین یا چار سال کا تھا تو کوئی عورت اسے لاوارث خانے کی سیڑھیوں پر روتا چھوڑ گئی تھی اور وہ پوری رات روتے روتے وہیں لاوارث خانے کی سیڑھیوں پر سو گیا تھا۔ صبح جب خاکروب جھاڑو دینے آیا تو اس نے ادارے والوں کو اس کے وجود کی طرف توجہ دلائی تھی اور تب سے زندگی کے انیس سالوں تک وہ لاوارث خانے کے تکلیف دہ ماحول میں ہی پلتا رہا تھا، پھر جب اس زندگی سے دل اچاٹ ہو گیا تو وہ لاوارث خانے سے نکل آیا اور ایک ورکشاپ میں مزدوری کرنے لگا، وہیں اس نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا اور اپنی ذہانت کو بروئے کار لاتے ہوئے پھر اس نے چھٹی جماعت سے لے کر بارہویں جماعت کا سفر آسانی کے ساتھ طے کر لیا۔ قرآن پاک کی تلاوت کرنا اور اردو کو جاننا وہ کافی حد تک لاوارث خانے میں سیکھ چکا تھا، پھر ورکشاپ کا مالک بھی بہت رحم دل تھا۔ اس نے کبھی سفیر علی خان کی ترقی کی راہ میں بے وجہ روڑے نہیں اٹکائے اور اسے ہر ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ پڑھنے میں رہنمائی فراہم کرتا رہا پھر جس وقت اس نے انٹر کا امتحان بھی کلیئر کر لیا اور اپنا کام بھی اچھی طرح سے سیکھ گیا تو ایک روز اچانک ہی ایمان کے پاپا احمد ہمدانی صاحب سے ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ اس کی شرافت اور محنت سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ورکشاپ والے سے تمام معاملات طے کر کے اسے ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ ہمدانی ہاؤس ہی لے آئے لیکن یہاں بھی بدنصیبی نے سفیر علی خان کا پیچھا نہ چھوڑا اور اس کے سر پر سے احمد ہمدانی صاحب کا سایہ بھی اٹھ گیا۔

تاہم اس عرصے میں وہ بری طرح سے ایمان ہمدانی کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ سرخ و سفید رنگت، سیاہ گھنے اور لمبے بالوں والی وہ پیاری سی لڑکی پہلی ملاقات میں ہی اسے بے قرار کر گئی اور وہ ہمدانی ہاؤس میں بسر ہونے والی پہلی رات کو ہی دیر تلک اس کے بارے میں سوچتا رہا اور اس کی باتیں یاد کر کر کے خود ہی مسکراتا رہا، تاہم اس کا سامنا ہونے پر وہ اپنی ذات پر سنجیدگی اور لاتعلقی کا خول چڑھا لیتا تا کہ گستاخ آنکھیں دل کی بے قراریوں کا حال اس پر

کھولنے سے باز رہیں۔

وگرنہ جس روز وہ شاپنگ ہال کے سامنے پھسل کر گری تھی اور سفیر علی نے اسے اپنی بانہوں میں اٹھا کر گاڑی تک پہنچایا تھا' اس روز پوری رات اسے اپنے ہی وجود سے اٹھنے والی خوشبو بے قرار کرتی رہی' اس پوری رات اس نے بے شمار خواب دیکھے اور دل کی بے تاب دھڑکنوں کا شور سنا۔

پھر اگلے روز جب وہ بارش میں بھیگ کر بخار کا شکار ہو گیا تھا اور ایمان نے اسے زبردستی بستر پر لٹا کر اپنا سرد ہاتھ اس کی جلتی پیشانی پر دھرا تھا' اس وقت ایک عجیب سی راحت اس کے اندر تک اتر آئی تھی اور دل کی بے قراری اس نہج تک پہنچ گئی تھی کہ وہ چاہ کر بھی خود کو سنبھال نہ پایا۔ عجیب سرشاری اور بے بسی کی کیفیت تھی' لاکھ وہ دل کو سمجھاتا' اپنی حیثیت اور ایمان ہمدانی کا مرتبہ باور کراتا لیکن پگلا دل اپنی ہی بات منوا رہا تھا' تب نڈھال ہو کر اس نے اپنے آپ کو پیاری سی ایمان ہمدانی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا وگرنہ اپنے کمرے میں اس کی موجودگی پھر اس کی تیمارداری وہ بھلا کیسے یہ احسان گوارہ کر سکتا تھا جب کہ اس میں پرخلوص ایمان کی رسوائی کا خدشہ بھی تھا لیکن دل تھا کہ یہ نزاکتیں سمجھ ہی نہیں رہا تھا۔ نتیجتاً وہ اسے اپنی خدمت کرنے سے روک ہی نہ پایا' یہاں تک کہ خواب لمحوں کا اختتام ہو گیا۔

اس نے آج تک کبھی کسی لڑکی کے بارے میں نہیں سوچا تھا' لیکن بے رحم زندگی پہلی مرتبہ اسے جس لڑکی کے سامنے لائی وہ اسے دیکھ کر گویا خود کو ہی بھول گیا۔ تب ہی تو خواہ کتنی ہی تھکن' کتنی ہی مصروفیت کیوں نہ ہوتی وہ اس کی قربت کا کوئی لمحہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا لیکن قربتوں کے یہ لمحے بھی بھلا دیر تلک کہاں گرفت میں رہ سکتے تھے اس کی' اور وہ ایک مرتبہ پھر عرش سے فرش پر آ گیا تھا۔

گو آج اس کا ایک نام تھا' ایک پہچان تھی' آج کروڑوں لوگ تھے جو اس کی ہنسی کے ساتھ ہنستے تھے اور اس کے آنسوؤں کو دیکھ کر آنسو بہاتے تھے۔ گو آج لاکھوں ہاتھ اسے تھامنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے' لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ صرف ایک لڑکی کو کھو دینے کا تصور' اسے ہزاروں لوگوں کے درمیان بھی ایک دم اکیلا کر رہا تھا اور یہ اکیلا پن آج آنسو بن بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ بھی رہا تھا۔

شب کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے۔ اردگرد سڑکوں پر لوگوں کی چہل پہل میں



قدرے کمی آنے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے سردی کا احساس بھی بڑھ رہا تھا جب کہ دور آسمان پر ہزاروں تاروں کے جھرمٹ میں جگمگاتا چاند اس کے اکیلے پن پر مسکرا رہا تھا۔

دل کا درد تھا کہ ہر گزرتے پل کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور وہ بے بسی کے شدید احساس سے مغلوب نجانے کتنی دیر تلک گاڑی کے بونٹ پر بیٹھا چپ چاپ آنسو بہاتا رہا' کتنی بے بسی تھی کہ آج جس کی محبت یوں اسے بے حال کر رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے اپنی محبت کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنے دل کی داستان بھی نہیں سنا سکتا تھا۔

اس رات ایک مرتبہ پھر اس نے بہت آنسو بہائے تھے تب ہی اگلے کچھ روز تک اس کی طبیعت نڈھال رہی۔



اپنوں میں مجھے کوئی بھی اپنا نہیں ملتا
اس بھیڑ میں لوگوں کو شناسا نہیں ملتا
حالات کے چکر میں پھنسی ہے میری کشتی
ساحل پہ پہنچ کے بھی کنارہ نہیں ملتا

کیپٹن شجاع آفندی گزشتہ دنوں پاکستان شفٹ ہو چکا تھا اور اسی سلسلے میں اس نے اپنے خاص خاص احباب کے لیے ایک شان دار پارٹی ارینج کی تھی جس میں ہمدانی ہاؤس کے مکینوں کی شرکت بھی لازمی تھی۔ ایمان کی کیپٹن شجاع آفندی سے شناسائی بہت پرانی تھی۔ آج سے تقریباً دس' گیارہ سال قبل جب وہ محض تیرہ چودہ سال کی تھی تو شجاع اکثر ان کے گھر آتا جاتا رہتا تھا' کبھی تعلیم میں ہیلپ کے لیے تو کبھی کھیلوں سے متعلق بات چیت کے لیے۔ وہ ہمیشہ احمد ہمدانی صاحب کو ہی پکڑتا تھا اور انہیں بھی شجاع سے بہت لگاؤ تھا تب ہی ہر بار وہ اپنی اہم سے اہم مصروفیت کو پس پشت ڈال کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔

بچپن میں جب ایمان کا سامنا شجاع سے ہوتا تھا وہ ہمیشہ اسے دیکھ کر احمد ہمدانی کے پیچھے چھپ جاتی تھی' نجانے کوئی ڈر تھا' جھجک تھی یا کچھ اور.... تاہم وہ ہمیشہ خوبرو سے شجاع آفندی کا سامنا کرنے سے کتراتی تھی۔ نجانے کیوں اسے دیکھتے ہی دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی تھیں۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک اٹھتے' ہاتھ پاؤں پھول جاتے اور ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ جاتیں۔ بہت دنوں تک اپنی اس کیفیت سے وہ خود بھی بے خبر رہی

تھی تاہم جلد ہی اس پر یہ راز منکشف ہونے کے بعد تو اس کا حال اور بھی برا ہو گیا اور وہ تصور میں ہی شجاع کے متعلق سوچ کر بے حال ہو جاتی۔ ایسے ہی ایک روز جب وہ اپنے لان میں چنبیلی کا پودا لگا رہی تھی اور اس کے دونوں ہاتھ مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے کہ اچانک کہیں سے شہد کی مکھیوں کا جھنڈ آ گیا اور وہ ان سے گھبرا کر جو بھاگی تو پورچ کے قریب بے حد خوب صورت سے شجاع آفندی کی تیز رفتار گاڑی کے نیچے آتے آتے بچی۔ وہ تو خدا کا کرم ہو گیا کہ شجاع نے فوراً بریک پر پاؤں رکھ دیئے تھے وگرنہ بدحواس سی ایمان ہمدانی کا کچلے جانا لازمی تھا‘ تب ہی وہ گاڑی سے باہر نکلا تو اس کا غصہ سوا نیزے پر پہنچا ہوا تھا جب کہ پہلے سے خوف زدہ ایمان ہمدانی مزید نروس ہو گئی۔

’’یہ کیا تماشہ تھا ایمان ......؟ ابھی اگر تم کچلی جاتیں تو......؟‘‘ اپنا سخت ہاتھ اس کے نازک سے بازو میں گاڑے وہ درشتگی سے پوچھ رہا تھا جب کہ مجرم بنی کھڑی ایمان ہمدانی کے لیے نگاہ اٹھا کر اس کی سمت دیکھنا گویا عذاب ہو گیا‘ پھر اسی پل شیطان مکھیاں بھنبھناتی ہوئی وہاں پہنچ گئیں اور ان مکھیوں کو اپنے سر پر منڈلاتے دیکھ کر چیختے ہوئے وہ شجاع آفندی سے لپٹ گئی۔ اس وقت مارے ڈر کے اس کا برا حال تھا اور وہ بیری کے پتے کی مانند کپکپا رہی تھی جس پر بے ساختہ ہی سنجیدہ سا شجاع آفندی دھیمے سے مسکرا دیا‘ پھر مکھیوں کے وہاں سے ٹلتے ہی اس نے آہستگی سے ایمان ہمدانی کو خود سے الگ کیا اور اس کی خوف زدہ سی بڑی آنکھوں میں شرارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

’’بھئی واہ‘ ان جادو کی مکھیوں نے تو کمال کر دیا‘ اب دیکھو ناں‘ کہاں تو تم میرا سامنا کرنے پر بھی آمادہ نہیں تھیں اور کہاں اب خود ہی مچل کر میری بانہوں میں آ چھپیں۔ ہاؤ ونڈر فل......‘‘ صاف اس کا مذاق اڑاتے ہوئے وہ شرارت سے مسکرایا تھا‘ جس پر ایمان نے گھور کر اس کی سمت ناراضگی سے دیکھا پھر تپے ہوئے لہجے میں شٹ اپ کہہ کر وہاں سے بھاگ گئی جب کہ مسرور سے شجاع آفندی کے بلند و بانگ قہقہے نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ اسی طرح ایک روز جب وہ لاؤنج میں بیٹھی اپنے نوٹس کی تیاری کر رہی تھی تو وہ دبے پاؤں چلتا بنا آہٹ کیے اس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔ پھر لہجے کو حد درجہ سیریس بناتے ہوئے وہ اس سے مخاطب ہوا۔

’’یہ لو ایمان‘ انکل نے تمہارے لیے گولڈ کی رنگ بھیجی ہے‘ کہہ رہے تھے گھر جاتے ہوئے تمہیں پکڑا دوں‘ لو پکڑو اسے۔‘‘



اپنے کام میں مشغول سادہ سی ایمان کے لیے تو اس کی بے وقت آمد ہی اچھنبے کا باعث تھی‘ کجا کہ اس کی غیر متوقع بات۔ تاہم پھر بھی اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا‘ جس پر خوبرو سے شجاع آفندی نے اگلے ہی پل زندہ کاکروچ رکھ دیا جسے دیکھ کر ایمان کی تو چیخ نکل گئی اور وہ ہاتھ جھٹک کر فوراً صوفے پر چڑھ گئی جب کہ شجاع کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ پھر زمین پر بے یار و مددگار چلتے ہوئے کاکروچ کو اٹھا کر ایمان پر پھینکنے لگا اور اس نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا وہ تو صد شکر کہ گھر میں اس وقت کوئی نہیں تھا وگرنہ نجانے شجاع کا یہ مذاق کیا رنگ لاتا۔

’’او مائی گاڈ......کیا عجیب سی ہو تم بھی؟ بھلا یہ چھوٹا سا کاکروچ تم جیسی اونچی لمبی دوشیزہ کو کتنا نگل سکتا ہے‘ خود ہی سوچو تم۔‘‘ اسے چیخ چیخ کر روتے دیکھ کر وہ بے حد محظوظ ہوتے ہوئے بولا تھا جب کہ ایمان ابھی تک صوفے پر چڑھی کانپ رہی تھی۔

’’ایمان......فار گاڈ سیک یار‘ نیچے اترو اور میرے لیے چائے پانی کا بندوبست کرو۔ آئی پرامس‘ اب میں دوبارہ تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔‘‘ کاکروچ پھینک کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے اس نے صلح جو انداز میں کہا تھا لیکن خاموش کھڑی ایمان نے اب بھی اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی تو وہ چڑ کر آگے بڑھا پھر اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر نیچے زمین پر اتار دیا۔

’’کم آن......چلو چائے بناؤ میرے لیے۔‘‘

’’مجھے چائے بنانی نہیں آتی۔‘‘

اس کے حکمیہ انداز پر بمشکل ایمان نے لب کھولے تھے۔ جواب میں وہ ایک خفا خفا سی نظر اس پر ڈالتے ہوئے واپس پلٹ گیا پھر تھوڑی دور جا کر واپس پلٹا اور ایمان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔

’’ایمان......تمہارے پاؤں میں کاکروچ......‘‘

اس کے کہنے کی دیر تھی کہ ایمان پھر سے چیخ کر صوفے پر چڑھ گئی جب کہ وہ ایک مرتبہ پھر کھل کھلاتے ہوئے لاؤنج سے باہر نکل گیا۔ یادوں کی پٹاری میں ایسی کتنی ہی دلفریب یادیں تھے جو خوبرو سے شجاع آفندی سے جڑی ہوئی تھیں۔ ایمان کو لاکھ بھلا کر بھی وہ دن وہ لمحے کبھی نہیں بھولتے تھے کہ جب اس کے خوابوں کا راج کمار شجاع آفندی اپنے والدین کے ساتھ ایک لمبے عرصے کے لیے پاکستان سے ناروے شفٹ ہو گیا اور پیچھے وہ روتی سسکتی رہ گئی۔ وہ تو تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کے اکیلے پن اور اداسی کا خیال کرتے ہوئے اس

کے پاپا نے سفیر علی خان کو اپائنٹ کرلیا وگرنہ شاید وہ شجاع کی جدائی کو اپنے جیون کا روگ ہی بنا لیتی کیوں کہ اس نے ناروے جا کر ان لوگوں سے بہت کم رابطہ رکھا تھا' یہاں تک احمد ہمدانی صاحب کی رحلت پر بھی وہ پاکستان نہیں آیا تھا اور یہیں سے ایمان کے دل میں شجاع آفندی کے لیے سرد مہری کی دراڑ پڑی تھی جسے ایک مرتبہ پھر اس کے چچا پاٹنا چاہ رہے تھے اور وہ سوچ سوچ کر مسلسل الجھ رہی تھی۔



''ایمان......کہاں ہو بیٹی' کیا شجاع کی پارٹی میں نہیں چلنا؟''

وہ کھوئی کھوئی سی اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی' دور آسمان پر نجانے کیا تلاش کر رہی تھی' جب نورین بیگم کی میٹھی آواز کانوں میں پڑی اور وہ چونک کر اپنے حواس مین واپس پلٹ آئی کہ جب سے اس نے اپنی جائیداد سے متعلق چپ سادھی تھی تب سے ہی اس کے چچا اور چچی' دونوں کا رویہ اس کے ساتھ بے حد مشفقانہ ہوگیا تھا۔

''کیا بات ہے ایمان بیٹی......تم ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئیں؟'' اسے سادہ سے حلیے میں خاموش پا کر وہ پھر سے گویا ہوئی تھی' جواب میں ایمان نے سرسری سے انداز میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے رخ پھیرلیا پھر قدرے دھیمی آواز میں بولی۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا آنٹی' پلیز آپ لوگ ہی چلے جائیں۔''

''ارے ایسے کیسے چلے جائیں......؟ اس نے اسپیشلی تمہیں انوائیٹ کیا ہے' چلو شاباش' جلدی سے تیار ہو جاؤ۔''

''لیکن آنٹی......''

''کوئی لیکن ویکن نہیں۔ ہری اپ' دو منٹ میں تیار ہو کر نیچے آجاؤ' میں ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی نکلواتی ہوں۔'' اس کے کسی بھی قسم کے احتجاج کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے قطعیت سے کہا پھر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ اس کے کمرے سے باہر نکل گئیں تو مجبوراً ایمان ہمدانی کو تیار ہونا ہی پڑا۔

پھر جس وقت وہ لوگ شجاع آفندی کی شان دار پارٹی میں پہنچے محفل اپنے عروج پر تھی اور وہ دور دوستوں کے جھرمٹ میں کھڑا' کسی بات پر کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔ گزرتے وقت نے اسے مزید حسن اور وجاہت عطا کی تھی اور اس وقت وہ سیاہ ڈنر سوٹ میں حد درجہ



خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ آج دس سال کے طویل عرصے کے بعد اسے دیکھ کر ایمان ہمدانی کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوگئی تھیں جب کہ پورے جسم پر ایک عجیب سا لرزہ طاری ہو کر رہ گیا' تب ہی وہ اپنے قدم مزید آگے نہ بڑھا پائی اور وہیں رک کر ٹکر ٹکر محویت کے عالم میں اسے دیکھتی رہی' جواب میں توصیف ہمدانی اور نورین بیگم کو سامنے پا کر خوشی سے کھل اٹھا تھا اور قدرے مضطرب نگاہوں سے ان کے ساتھ کسی اور وجود کو بھی تلاشنا چاہا تھا' تب ہی قدرے بدگمان سی ایمان ہمدانی کے سارے شکوے گلے ایک ساتھ دم توڑ گئے اور پرسکون ہو کر دھیمے سے مسکرا اٹھی۔

''تو تم آج بھی مجھے بھلا نہیں سکے شجاع' تمہیں آج بھی میری تلاش ہے۔ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے' ناں یہی سچ ہے۔'' نہایت سرشاری کے عالم میں آپ ہی آپ اس نے سوچا تھا۔ پھر ایک دھیمی سی مسکان اگلے ہی پل اس کے لبوں پر بکھر گئی۔ عین اسی پل خوب صورت سے شجاع آفندی کی نگاہ اس پر پڑی اور وہ سب سے ایکسکیوز کرتا بڑی بے تابی سے اس کی سمت بڑھا تھا۔

''ہیلو......کیسی ہو ایمان؟'' عین اس کے مقابل کھڑے ہو کر اس نے اپنائیت سے پوچھا تھا' جواب میں وہ جو اس کی شخصیت کے سحر میں بری طرح سے کھوگئی تھی ایک دم چونکتے ہوئے قدرے غائب دماغی سے بولی۔

''ہاں......وہ......مم......میں ٹھیک ہوں' آ......آپ کیسے ہیں......؟''

''تمہارے سامنے کھڑا ہوں' خود ہی دیکھ لو۔'' اس کے گم صم سے انداز پر وہ دھیمے سے مسکرایا تھا' جب کہ ایمان نے اپنی نگاہیں جھکا لی تھیں۔

''ایمان! آر یو او کے؟'' اسے خاموش پا کر وہ قدرے فکرمندی سے بولا تھا' جواب میں مضطرب سی ایمان ہمدانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم بہت بدل گئی ہو ایمان......کم از کم بچپن میں تو تم بالکل ایسی نہیں تھیں' یقیناً احمد انکل کی جدائی نے تم پر گہرا اثر ڈالا ہے' ہے ناں......؟'' وہ چپ رہنا کہاں جانتا تھا' تب ہی ایک اور سوال داغ دیا اس پر۔ جواب میں گم صم سی ایمان ہمدانی نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''فار گاڈ سیک یار......کچھ تو بولو' کوئی تو بات کرو' وگرنہ میں سمجھوں گا کہ مجھے گیارہ

سال کے بعد بھی اپنے سامنے پا کر تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی۔''

''نن...... نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس کے ایموشنل لہجے پر فوراً ہی سر اٹھاتے ہوئے اس نے وضاحت کی تھی' جواب میں وہ اس کی معصومیت پر کھل کھلا کر ہنس پڑا پھر قدرے سنبھل کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آئی ایم سوری ایمی کہ میں چاہ کر بھی پچھلے گیارہ سالوں میں تم سے کوئی رابطہ نہ رکھ سکا' ایکچولی حالات ہی کچھ ایسے بن گئے تھے کہ میں الجھ کر رہ گیا' نیا ملک' پھر تعلیمی مصروفیات' بعد میں پاپا کی علالت کے بعد ان کے کاروبار کی دیکھ بھال' غرض کہ ہزار جھمیلوں میں جان الجھ گئی تھی۔ بہرحال' توصیف انکل کی معرفت مجھے احمد انکل کی اچانک ڈیتھ کا پتہ چلا تھا' تم یقین کرو ایمان مجھے جتنا دکھ خود اپنے پاپا کی رحلت سے ہوا ہے اتنا ہی دکھ احمد انکل کی اچانک وفات کا سن کر ہوا' خدا ان کی مغفرت فرمائے۔ میں' کبھی انہیں فراموش نہیں کر سکوں گا۔'' اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں وہ کہہ رہا تھا جب کہ خاموش کھڑی ایمان کی جھیل سی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر آئیں۔

''یہ کیا ایمان...... تم اب بھی رو رہی ہو' دیکھو اب تو میں آ گیا ناں' اب میں کبھی تمہاری آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں۔'' ایمان کی نم پلکیں دیکھ کر بہت اپنائیت کے ساتھ اس نے کہا تھا پھر اپنے ہاتھوں سے اس کی بھیگی پلکیں صاف کر کے وہ دھیمے سے مسکرایا اور اس کا ہاتھ تھام کر اپنے فرینڈز سے ملوانے کے لیے لے گیا۔

زندگی ایک دم سے ہی کتنی خوب صورت ہو گئی تھی' نیلے پانیوں کا سفر' اب اس کی مسرتوں کا عنوان بن گیا تھا اور وہ بات بے بات مسکرانے لگی تھی۔

اس روز شجاع کا ارادہ اسے مووی دکھانے کا تھا' لیکن ایمان کو چونکہ فلموں سے قطعی دلچسپی نہیں تھی لہٰذا اس نے فلم دیکھنے سے انکار کر دیا' تب ہی وہ اسے لے کر سفیر علی خان کے میوزک ہال میں چلا آیا جہاں اس وقت اس کے مداحوں کی ایک لمبی قطار ٹکٹ ملنے کے انتظار میں کھڑی تھی۔

''او گاڈ...... یہاں اتنی لمبی قطار دیکھ کر تو لگتا ہے کہ اگلے تین' چار گھنٹوں تک ہماری باری نہیں آئے گی۔ لگتا ہے ہمیں واپس گھر ہی چلنا پڑے گا۔ ویسے بھی' سفیر علی خان کو دیکھنا اور گاتے ہوئے سننا بھلا اتنا سہل کہاں ہے؟ عجیب غضب کا سنگر ہے یار...... جب بھی کچھ گاتا ہے' سننے والوں کا قرار لوٹ لیتا ہے' مدہوش کر دیتا ہے انہیں' ویسے تم نے تو اسے سنا ہی ہو گا'



ہے نا......؟''

وہ سفیر علی خان کا بہت بڑا فین لگ رہا تھا' تب ہی اس کی تعریف میں رطب اللسان اس نے اچانک ہی ایمان سے پوچھا تو وہ قدرے گڑبڑا گئی' پھر خود کو سنبھالتے ہوئے قطعی لہجے میں بولی۔

''نہیں...... مجھے میوزک سے کوئی دلچسپی نہیں' اس لیے میں نے کبھی اسے نہیں سنا۔''

''او مائی گاڈ...... بہت عجیب لڑکی ہو تم بھی' کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے تمہیں' پتہ نہیں میرا کیا بنے گا۔'' سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ قدرے چڑ کر بولا تھا۔ جواب میں خاموش کھڑی ایمان ہمدانی دھیمے سے مسکرا کر رہ گئی۔ عین اسی لمحے سفیر علی خان کی گاڑی ان کے قریب سے گزری اور اگلے پانچ منٹ میں میوزک ہال کا سربراہ ہاتھ میں پاس لیے ان سے کہہ رہا تھا۔

''میڈم! اندر پروگرام شروع ہونے والا ہے' یہ پاس لیجیے اور جلدی سے تشریف لے آئیں' فرسٹ لائن میں آپ کی سیٹیں بک ہو چکی ہیں۔''

ایمان' سفیر علی خان کے اس اقدام سے جتنی جز بز ہوئی تھی' اتنا ہی شجاع آفندی کی آنکھیں حیرت سے' مسرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں تاہم اس نے وقت ضائع کیے بغیر جلدی سے ایمان کا سرد ہاتھ تھاما' پھر ہال کے سربراہ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ اسی کی ہمراہی میں اپنی سیٹ پر آ بیٹھا' جو اسٹیج کے بالکل قریب تھی اور جہاں اس وقت مختلف جگمگاتی روشنیاں آنکھوں کو چندھیا رہی تھیں۔

''دوستو! زندگی میں ہر انسان کسی نہ کسی سے پیار کرتا ہے' دل کی گہرائیوں سے ٹوٹ کر کسی کو چاہتا ہے اور ضرورت پڑنے پر خدا سے رو رو کر اپنی محبت کے حصول کی دعائیں بھی مانگتا ہے اور پھر جب وہ بزرگ و برتر اس کی دعائیں سن لیتا ہے تو مارے خوشی کے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے۔ وہ ہواؤں میں اُڑتا ہے اور پھولوں سے باتیں کرتا ہے لیکن بدقسمتی سے جب کسی کو اس کا محبوب نہیں ملتا تو اس کا دل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جاتا ہے اور اس کے جسم کا ایک ایک عضو درد کے دریا میں ڈوب کر بکھر جاتا ہے' پھر اس کے ٹوٹے ہوئے دل سے ہر پل' ہر لمحے صرف ایک ہی آواز آتی ہے کہ

دل دیتا ہے رو رو دہائی' کسی سے کوئی پیار نہ کرے
بڑی مہنگی پڑے گی یہ جدائی' کسی سے کوئی پیار نہ کرے

کچھ تو پیار نے پاگل بنایا اور کچھ زندگی نے بھی ستایا
خوب اپنی ہوئی جگ ہنسائی' کسی سے کوئی پیار نہ کرے''

درد کے سُر میں ڈوب کر پلکیں موندے اور دونوں ہاتھوں میں مائیک تھامے وہ دیوانگی کے عالم میں گنگنا رہا تھا جب کہ ہال میں جہاں تھوڑی دیر پہلے اس کی اسٹیج آمد پر ہلچل مچی ہوئی تھی' ایک دم سے ہی سناٹا چھا گیا۔ ایمان کو وہ بہت کم زور اور بکھرا ہوا سا دکھائی دیا۔ آنکھوں میں پھیلی سرخی اور چہرے پر ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو اس کے اندر کا حال بخوبی اجاگر کر رہی تھی لیکن اسے تو جیسے اپنی کوئی پروا ہی نہیں تھی۔

پھر جس وقت اس نے اپنا گیت ختم کیا' سحر میں ڈوبے لوگوں کا جوش وخروش ایک دم سے ہی جاگ اٹھا اور پورا ہال تالیوں اور سیٹیوں کی پرزور آواز سے گونج اٹھا۔ مختلف لڑکیاں اور منچلے لڑکے دیوانہ وار اسٹیج کی طرف لپکے۔ اس اثناء میں کوئی دیوانہ ایمان کے نازک سے پاؤں پر چڑھ گیا اور وہ درد سے بلبلا کر رہ گئی۔ تب ہی اس نے دیکھا کہ سفیر علی ہزاروں لوگوں کے جھرمٹ کو چیرتے ہوئے تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ پھر اس کے قریب پہنچ کر ایک زبردست طمانچہ لڑکے کو رسید کر دیا کہ جس نے بے خبری میں ایمان ہمدانی کے پاؤں پر چڑھنے کی گستاخی کی تھی۔ شجاع اس کے بالکل قریب تھا' لیکن وہ اس کی تکلیف کو محسوس نہ کر سکا جب کہ سفیر علی خان نے دور اسٹیج پر ہزاروں لوگوں کے جھرمٹ میں ہوتے ہوئے بھی اس پر سے ایک پل کے لیے بھی نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔

''یو اسٹوپڈ...... آپ دیکھ کر نہیں چل سکتے' کتنی زور سے آپ نے میرا پاؤں دبایا ہے۔'' وہ تو ابھی اس کے طمانچے سے ہی حیران ہو رہی تھی کہ اس پر اس کے الفاظ نے اسے مزید شک لگا دیا۔ تب ہی اس نے اپنا رخ گومگو کی کیفیت میں کھڑی ایمان ہمدانی کی طرف کیا' پھر کچھ پل نم آنکھوں سے اس کی سمت بغور دیکھا تو وہ کنفیوز ہو کر رخ پھیر گئی کہ شجاع ہمدانی کی موجودگی میں ہزاروں لوگوں کے بیچ تماشہ بننا اسے قطعی گوارہ نہیں تھا۔

ٹھیک اسی پل سفیر علی خان' پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر بکھراتے ہوئے تھوڑا سا جھکا تھا اور وہ جی جان سے کانپ کر اس کی سمت دیکھنے لگی تھی' جواب عین اس پر جھکے بظاہر اس کے برابر والی لڑکی سے سرگوشانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

''آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔''



''تھینک یو۔''

لڑکی تو گویا اتنے بڑے سنگر کے اس خصوصی التفات پر بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی' تب ہی حیرانی سے آنکھیں پھیلائے خوشی سے بے حال لہجے میں کہا تو سفیر نے ایک مسکراتی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے اپنا چہرہ پیچھے ہٹا لیا پھر بڑے اجنبی سے انداز میں شجاع آفندی کو قطعی اگنور کرتے ہوئے اس نے دھیمے سے خاموش اور ہراساں کھڑی ایمان سے ایکسکیوز کیا اور بڑے بڑے اسٹیپ اٹھاتا اگلے ہی پل اسٹیج کے اس پار غائب ہو گیا۔



تیرے درد سے دل آباد رہا
کچھ بھول گئے' کچھ یاد رہا' کچھ یاد رہا
جانِ وفا تجھ کو کیا دیں' دل کہہ رہا ہے دُعا دیں
ارماں بجھے ہیں سپنے' دھواں ہیں'
مرمر کے ہم تو زندہ یہاں ہیں
بے خودی میں ہم کھو گئے' پھر جدا تم سے ہو گئے
چاہت کا جہاں برباد رہا' کچھ بھول گئے کچھ یاد رہا
کچھ یاد رہا...... کچھ یاد رہا

دن کے تقریباً تین بج رہے تھے' جب سفیر علی خان کے دیدہ زیب بیڈ روم میں قدم رکھتے ہی اس کی دل چھو لینے والی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی اور وہ سر جھٹک کر اس کے بستر کے قریب چلی آئی جہاں وہ تیز بخار میں بے حال پڑا گنگنا رہا تھا اور ساتھ میں بری طرح سے رو بھی رہا تھا۔

''سیفی......'' ایمان کی مدھم سی پکار جونہی اس کی سماعتوں سے ٹکرائی' اس نے فوراً پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ پھر قطعی بے یقین لہجے میں پلکیں جھپک جھپک کر اس کی وہاں موجودگی کا یقین کرتا رہا اور جب نگاہوں کو اچھی طرح سے اس خوب صورت حقیقت کا یقین ہو گیا تو فرطِ مسرت سے بے حال' اگلے ہی پل ایک آسودہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔

''ایمان جی...... آ...... آپ یہاں......؟ میرے غریب خانے پر......؟ یہ کمال کیسے

ہو گیا آج......؟ بخدا مجھے تو اپنی بصارتوں پر یقین ہی نہیں آ رہا ہے۔''

خوشی اس کے روم روم سے ظاہر تھی' تاہم ایمان نے فقط پھیکی سی ایک مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے اجنبی انداز میں کہا۔

''آنا ضروری تھا سیفی' وگرنہ تمہیں میری خوشیوں میں شامل نہ ہونے کا ایک اور بہانہ مل جاتا۔'' اس کے عجیب سے لہجے پر نڈھال سے سفیر علی خان نے کسی قدر چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا' جو اس کے اس طرح حیران ہونے پر بے ساختہ ہی کھل کھلا کر ہنس پڑی تھی۔

''تم بھی ناں سیفی' بس ایک دم بدھو ہی ہو ارے پاگل میری شادی طے ہو گئی ہے۔ اگلے ہفتے تقریب ارینج کی جا رہی ہے' دیکھو تمہیں ہر حال میں آنا ہے۔ اگر تم نے کوئی عذر تراشا تو میں سچ مچ تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔'' نہایت سرشار لہجے میں شگفتگی سے کہتے ہوئے وہ کتنی پرسکون دکھائی دے رہی تھی' جیسے سارے جہان کی خوشیاں سمٹ کر اس کے پاؤں تلے آ گئی ہوں لیکن اسی پل نجانے کیوں سفیر علی خان کا دل بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گیا' پا لینے کی موہوم سی امید کا آخری دیا بھی گل ہو گیا' آنکھیں یکدم ہی دھندلا گئیں جب کہ ساعتوں میں جیسے سناٹے اتر آئے۔ اس روز پہلی مرتبہ اسے ایمان ہمدانی کے سامنے اپنا بھرم رکھنا دشوار ہو گیا اور وہ پھر سے بے آواز رو پڑا۔

''سیفی...... کیا بات ہے...... تم رو کیوں رہے ہو......؟ پلیز مجھے بتاؤ...... کیا تمہیں اپنے گھر والے یاد آ رہے ہیں؟ وہ پریشان ہی تو ہو گئی تھی' تب ہی سفیر نے فوراً اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں' پھر بمشکل مسکراتے ہوئے بولا۔

''یہ آنسو تو خوشی کے آنسو ہیں ایمان جی' آپ کو آپ کی محبت مل گئی' اس سے وابستہ ساری خوشیاں مل گئیں' تو بتائیے بھلا میں آپ کی خوشی میں خوش کیوں کر نہیں ہوں گا۔''

''واقعی یہ بات تو ہے' ویسے اب تم بھی جلدی سے اپنی محبت کو منا لو سیفی کیوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم فقط آنسو بہاتے ہی رہ جاؤ اور تمہاری محبت کسی اور کا نصیب بن کر تم سے بچھڑ جائے' تم سمجھ رہے ہو ناں میری بات۔'' قطعی پرخلوص لہجے میں اپنائیت سے اس نے کہا تھا' جواب میں درد سے بے حال سفیر علی خان نے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ارے ہاں' میں تو تمہیں بتانا ہی بھول گئی۔ وہ اس روز میں نے تمہاری ہی نوازش پر تمہارا جو شو دیکھا تھا ناں' بہت اچھا تھا' میرے ہونے والے میاں جی تو بہت



بڑے فین ہیں تمہارے' لیکن میں نے مصلحت کے تحت ان کو کبھی نہیں بتایا کہ میں تمہیں اتنا قریب سے جانتی ہوں اور تو اور' میرے انکل کے دونوں بچے' جو نیویارک پڑھنے کے لیے گئے ہوئے ہیں اور خاصے نک چڑھے ہیں' وہ بھی تمہیں بہت پسند کرتے ہیں سیفی...... تم نے تو واقعی آکاش کو چھو لیا۔''

اس کے سادہ سے لہجے میں سفیر علی خان کے فن کے حوالے سے حد درجہ ستائش تھی' تب ہی ایک بے جان سی مسکراہٹ سفیر علی خان کے افسردہ لبوں پر رینگ گئی۔

''او کے...... اب میں چلتی ہوں' تم اپنا خیال رکھنا اور شادی میں ضرور آنا' او کے۔''

اگلے ہی پل اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے اس نے مصروف انداز میں کہا تھا' پھر ایک پرخلوص سی مسکراہٹ اس کے نڈھال سراپے پر ڈالتے ہوئے وہ اس کے بیڈروم سے باہر نکل آئی۔



وقت تیزی سے اپنی مسافتیں طے کر رہا تھا اور بالآخر وہ دن بھی آ پہنچا جب ''ہمدانی ہاؤس'' میں شجاع آفندی اور ایمان ہمدانی کی شادی کی شہنائیاں گونج اٹھیں۔

رنگا رنگ قمقموں اور خوب صورت پھولوں سے سجا شان دار ہمدانی ہاؤس دید کے قابل نظر آ رہا تھا۔ کوئی اس وقت ایمان ہمدانی کے دل سے پوچھتا کہ وہ کیسے سرشار تھا' کیسے دونوں جہاں کی خوشیاں سمٹ کر اس کے قدموں تلے آ گئی تھیں' وہ مسکراہٹیں' وہ زندہ ہونے کا احساس' جو احمد ہمدانی صاحب کی رحلت کے بعد مفقود ہو چکا تھا' اب پھر سے زندہ جاوید ہو گیا اور وہ بات بے بات مسکرانے لگی۔

تاہم اس کی ان خوشیوں میں پہلی مرتبہ سفیر علی خان نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور بیماری کا عذر تراش کر ایک انمول گفٹ کے ساتھ معذرت ارسال کر دی جس سے وہ دل بھر کر اس پر خفا ہوئی اور شادی کے فوراً بعد اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا پروگرام بنا لیا' پھر وہ خوابوں بھری رات بھی آ گئی کہ جس کے لیے ہر نوجوان لڑکی نجانے اپنے من میں کیا کیا سوچتی ہے۔

شجاع آفندی دوستوں وغیرہ سے فارغ ہو کر تقریباً دو بجے مجلۂ عروسی میں داخل ہوا تھا' تب تک اس کی کمر تھک کر تختہ ہو چکی تھی لیکن وہ ہر قسم کے احساس کو پس پشت ڈالے یوں سر نیہوڑائے بیٹھی تھی گویا ابھی ابھی لا کر بٹھایا گیا ہوا سے' چند محبت سے بھرپور جملوں' تھوڑا سا سراہے جانے کا احساس' مچل مچل کر اس کے دل کی دھڑکنوں میں اودھم مچا رہا تھا'

پھر جب شجاع دروازہ لاک کرنے کے بعد اس کے قریب بیڈ پر آکر بیٹھا تو گویا اس کی تو جان ہی نکل گئی۔

شجاع کے ناروے جانے کے بعد اس نے تو یہ امید ہی چھوڑ دی تھی کہ وہ کبھی واپس پلٹ کر اس کی زندگی میں دوبارہ آئے گا۔ پھر یہ سوچ بھی دل کو مایوس کر ڈالتی تھی کہ اس کا پیار یکطرفہ ہے اور یکطرفہ پیار کی ناؤ قسمت سے ہی کنارے لگا کرتی ہے لیکن آج اس کے جذبوں کی جیت ہوگئی تھی۔ آج گیارہ سال انتظار کے بعد بالآخر اس نے اپنے محبوب کو پالیا تھا اور وہ اسی سرشاری میں مدہوش تھی۔ جب شجاع نے ہاتھ بڑھا کر اس کا گھونگھٹ الٹ دیا۔

''ویری نائس' سو بیوٹی فل...... مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ تم میری ہو چکی ہو ایمان۔'' پرشوق نگاہیں اس کے حسین سراپے پر جمائے وہ قطعی دیوانگی کے عالم میں کہہ رہا تھا اور ایمان کا دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہو گیا' ساعتوں میں جیسے امرت گھل گیا' ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔

''میں اپنے نصیب پر جتنا بھی رشک کروں' کم ہے ایمان...... کیوں کہ اتنا خوب صورت ہمسفر تو نصیب والوں کو ہی ملتا ہے۔'' بے حد قیمتی بریسلٹ اس کی حنائی کلائی میں پہناتے ہوئے اس نے پھر مدہوش سُروں میں سرگوشی کی تھی۔ جواب میں ایک شرگیں سی مسکراہٹ ایمان کے احمریں لبوں پر بکھر گئی اور اس نے بے حد شرما کر اپنا نازک سا ہاتھ شجاع کے لبوں پر رکھ دیا جسے اس نے فوراً اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیا اور ایمان کی ایک مرتبہ پھر جان پر بن آئی۔

''ایمان! تم کافی تھک گئی ہو ناں' پلیز لیٹ جاؤ۔ زندگی میں ایسی راتیں اور بہت آئیں گی' سو پلیز آرام کرلو تب تک میں واش لے کر آتا ہوں۔''

عین عالم مدہوشی میں ایمان کی روشن پیشانی پر مہر محبت ثبت کرتے ہوئے کہا' پھر قریب ہی وارڈ روب سے اپنے لیے ایک نیا سوٹ نکال کر اس نے ہنستی مسکراتی ایک نظر حسن کا پیکر بنی ایمان ہمدانی کی طرف اچھالی اور اگلے ہی پل واش روم میں مقید ہوگیا۔



وقت اپنی مخصوص رفتار سے رینگ رہا تھا اور وہ شجاع آفندی کے پیار میں پاگل اسی کے سنگ سنگ گویا ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ بات بات پر اس کے منہ کی طرف دیکھنا' اپنے



ہاتھوں سے اس کی پسند کے کھانے بنانا' اس کے کپڑے خود پریس کرنا' اس کے جوتوں' موزوں اور ٹائیوں کا پورا پورا خیال رکھنا' اسے کتنا اچھا لگتا تھا' یہ صرف اس کا دل جانتا تھا۔

اس کے چچا توصیف ہمدانی صاحب اپنے شیڈول کے مطابق ایمان کی رخصتی کے اگلے ہی ہفتے پاکستان میں اپنی ساری پراپرٹی سمیٹ کر اپنے بچوں کے پاس نیویارک شفٹ ہو گئے اور وہ محل جیسے ہمدانی ہاؤس میں شجاع کے ساتھ بالکل اکیلی رہ گئی۔

اس روز شجاع کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی' پچھلے دو' تین روز سے شام ڈھلتے ہی اسے ہلکا سا ٹمپریچر ہو جاتا اور وہ کچھ کھائے پیے بغیر ہی کمرے میں بند ہوکر رہ جاتا' جس سے ایمان کو بے حد پریشانی لاحق ہو جاتی' چنانچہ دو' تین دن شجاع کی ضد کی نذر کرنے کے بعد چوتھے دن وہ بالآخر اسے ہسپتال لانے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

ڈاکٹر میمونہ سے اس کی اچھی خاصی سلام دعا تھی لہٰذا ہوسپٹل پہنچنے کے بعد وہ سیدھی انہی کے روم میں چلی آئی جو غالباً ابھی ابھی کسی کیس سے فارغ ہوکر اپنے کمرے میں آئی تھیں تاہم ایمان کو دیکھ کر ان کے لبوں پر بڑی پرخلوص مسکراہٹ ابھری تھی اور انہوں نے ایمان کو گلے لگا کر پرمحبت انداز میں ویلکم کرنے کے بعد شجاع سے دعا سلام کی' پھر اس کا تفصیلی چیک اپ کرنے کے بعد مسکرا کر بولیں۔

یہ تو بالکل ٹھیک ہیں ایمان' تم بھی ناں سدا کی وہمی ہو۔ انکل کے لیے بھی ایسے ہی پریشان رہتی تھیں۔ اور اب شجاع بھائی کے لیے بھی تمہاری فکریں دیکھنے کے لائق ہیں۔ تھوڑا بیلنس رکھو یار...... اس طرح تو تم اپنا نقصان کر بیٹھو گی۔

''بالکل' میں بھی پچھلے تین روز سے ان کو یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں مگر یہ ہیں کہ سمجھتی ہی نہیں۔'' ڈاکٹر میمونہ کے فوراً بعد ہی اس نے اپنی صفائی پیش کر ڈالی تھی۔

جواب میں سر جھکائے بیٹھی' پریشان سی ایمان' بس دھیرے سے مسکرا کر رہ گئی کہ واقعی وہ اپنے پیاروں کو معمولی سی تکلیف میں مبتلا بھی نہیں دیکھ سکتی تھی اور ابھی وہ اپنی طرف سے نجانے کیا کہتی کہ اسی اثناء میں ڈاکٹر میمونہ کے روم کا دروازہ کھلا اور وائٹ یونی فارم میں ڈریس اپ ایک خوش شکل سی نرس کمرے کے اندر چلی آئی۔ پھر ڈاکٹر میمونہ سے ڈائریکٹ مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''میڈم...... وہ کمرہ نمبر 48 کے پیشنٹ سفیر علی خان کو ہوش آ گیا ہے۔''

نرس کے الفاظ نے جہاں ڈاکٹر میمونہ کو اطمینان بخشا تھا' وہیں ایمان ہمدانی اور شجاع آفندی کو بری طرح سے چونکا دیا' تب ہی شجاع نے فوراً بے قرار کے عالم میں پوچھا۔

''سفیر علی خان ......کہیں وہ معروف سنگر تو نہیں......؟''

گم صم سی ایمان ہمدانی کی جان اس سوال میں اٹک گئی تھی' جب ڈاکٹر میمونہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔

''بالکل ...... یہ وہی سفیر علی خان ہیں' عرصے سے اسی ہوسپٹل میں ایڈمٹ ہیں' ایکچولی بہت زیادہ ڈرنک کرنے کی وجہ سے پرسوں رات ان کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ وہ تو صد شکر کہ ان کے کسی مداح نے انہیں اس حال میں دیکھ لیا اور اٹھا کر ہوسپٹل لے آیا وگرنہ عین ممکن تھا کہ پرسوں رات سڑک کے کنارے ہی ان کی ڈیتھ ہو جاتی۔''

کتنے نشتر تھے میٹھے لہجے والی ڈاکٹر میمونہ کے لہجے میں کہ اس کا پور پور گھائل ہو گیا۔ وہ جو کبھی اسے بہت عزیز رہا تھا' وہی آج زندگی اور موت کی دہلیز پر کھڑا لڑکھڑا رہا تھا اور اسے اس کی کوئی خبر ہی نہیں تھی۔

کتنی خود غرض ہو گئی تھی وہ......؟

ڈاکٹر صاحبہ......کیا ہم ان سے مل سکتے ہیں' صرف تھوڑی دیر کے لیے۔'' اگلے ہی پل شجاع نے بے قراری سے کہا تھا' جواب میں ڈاکٹر میمونہ نے اطمینان کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا اور وہ متوحش سی ہو کر خالی خالی سے ذہن کے ساتھ ان دونوں کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''وہ مجھے اپنے سامنے دیکھے گا تو کیا سوچے گا کہ میں کتنی خود غرض ہوں' جسے اپنی خوشیوں میں کھو کر اس کا کوئی خیال' کوئی خیر خبری ہی نہیں رہی' اس نے ہمیشہ میرا خیال رکھا لیکن میں نے...... میں نے کیا کیا؟''

خالی خالی سے ذہن کے ساتھ سوچتے ہوئے وہ شکستہ انداز میں چلتی شجاع آفندی اور ڈاکٹر میمونہ کے پیچھے پیچھے ہی سفیر علی خان کے کمرے تک چلی آئی جہاں وہ نگاہوں کے سامنے ہی سفید بستر پر پڑا' بہت بیمار دکھائی دے رہا تھا' خوب صورت غلافی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ کمزوری حد درجہ بڑھ گئی تھی اور اس کے دونوں گردے تیزی سے ناکارہ ہو رہے تھے جب کہ ہر روز اسے معمولی سا ٹمپریچر بھی رہنے لگا تھا۔ اس وقت وہ جس حال میں تھا اسے دیکھ کر ایمان کا دل بری طرح سے تڑپا تھا اور وہ اس کی



سمت دیکھتے ہوئے بے آواز سسک پڑی تھی۔

''یہ تمہیں کیا ہو گیا سیفی' کون سا روگ لگا لیا تم نے خود کو...... کیوں زندگی سے دور بھاگ رہے ہو تم؟'' مچلتے آنسوؤں کو خاموشی سے پیتے ہوئے اس نے من ہی من میں اس سے سوال کیا' پھر پلکیں موند کر رو پڑی تھی جب کہ شجاع اس کے بستر کے قریب رکھی کرسی پر براجمان اس سے اپنی عقیدت کا اظہار کر رہا تھا اور ڈاکٹر میمونہ اپنے لبوں پر پُرخلوص سی مسکراہٹ سجائے اسے اپنا خیال رکھنے کی تلقین کر رہی تھیں۔ عین اسی پل اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور وہ کھانس کھانس کر بے حال ہو گیا' یہاں تک کہ غلافی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر گئیں تب ایمان کا شدت سے دل چاہا کہ وہ لپک کر آگے بڑھے اور اسے اپنی موجودگی کا احساس دلائے لیکن افسوس کہ وہ چاہنے کے باوجود بھی ایسا نہیں کر سکی اور وہیں کمرے کی دہلیز سے لپٹی دروازے کو پکڑے بے حال کھڑی رہی۔

شجاع اسے کندھوں سے پکڑے سنبھال رہا تھا۔ ڈاکٹر میمونہ فوراً پانی لینے کے لیے لپکی تھیں لیکن وہ اپنے نڈھال سراپے کے ساتھ وہیں کھڑی سب کچھ دیکھتی رہی تب ہی شدت سے کھانستے ہوئے سفیر علی خان کی نگاہ بالکل اچانک ہی اس پر پڑی تھی اور اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا تھا' تب وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کمرے کے اندر آئی پھر بمشکل اپنے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

''ٹھیک ہوں' مجھے کیا ہونا ہے۔'' اداس لبوں پر بڑی مدھم سی مسکراہٹ بکھری تھی' تب ہی وہ نگاہیں چراتے ہوئے بولی۔

''میمونہ بتا رہی تھیں کہ آپ ڈرنک بہت کرنے لگے ہیں' جس کی وجہ سے آپ کے گردوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ پھر آپ اپنا خیال بھی نہیں رکھتے جب کہ لاکھوں لوگ شب و روز آپ کی زندگی کے لیے دعائیں مانگتے ہیں' خود میرے شوہر' آپ کو بہت پسند کرتے ہیں پھر آپ اپنا خیال کیوں نہیں رکھتے' کیوں خود پر درد کو اتنا حاوی کر رکھا ہے آپ نے؟''

نہایت محتاط لہجے میں گلہ کرتے ہوئے وہ کتنی عجیب لگ رہی تھی' کس قدر بے بس اور مجبور' جو اپنے شوہر کے سامنے اس سے اپنائیت کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی۔

''سوری...... میں آئندہ خیال رکھوں گا۔''

سر جھکائے وہ ہمیشہ کی طرح تابعدار لہجے میں بولا تھا۔ جواب میں ایمان کے افسردہ لبوں پر مطمئن سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''تھینک گاڈ کہ انہوں نے تمہاری بات مان لی ایمان' وگرنہ یہ تو کسی کی نہیں سنتے' یہاں تک کہ میری بھی نہیں۔'' اگلے ہی پل ڈاکٹر میمونہ نے مسکراتے ہوئے فریش لہجے میں کہا تھا' جس پر شجاع نے کس قدر فخریہ انداز میں ایمان کی طرف دیکھا۔

''سفیر صاحب' آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ آج یہاں ہم دونوں میاں بیوی کو آپ سے مل کر کس قدر خوشی ہو رہی ہے۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں زندگی میں ایک بار ضرور آپ سے ملوں اور خدا کے فضل و کرم سے آج میری یہ خواہش پوری ہوئی جس پر میں از حد خوش ہوں لہٰذا اسی خوشی میں' میں آپ سے ریکویسٹ کرتا ہوں کہ کبھی موقع ملے تو پلیز آپ اپنا ایک شو ناروے میں ضرور کیجیے گا کیوں کہ میں اور میری وائف اگلے ہی ہفتے ناروے کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔''

خبر تھی یا کوئی طوفان کہ جس نے پل میں ہی نڈھال سے سفیر علی خان کی پوری شخصیت کو ہلا کر رکھ دیا۔ خالی خالی سے انداز میں کس قدر بے یقینی کے ساتھ اس نے ایمان کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

''شجاع! بہت دیر ہو گئی ہے' میرے خیال میں اب ہمیں گھر چلنا چاہئے۔''

سفیر علی خان کی نگاہوں سے کنفیوز ہو کر اس نے فوراً شجاع سے کہا تھا' پھر میمونہ سے مل کر قدم واپسی کے لیے بڑھا دیئے جب کہ وہ گم صم سی نگاہوں میں کچھ پل مزید رک جانے کی التجا لیے بے بسی سے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو دیکھتا رہ گیا۔

زندگی بہت بے رحم ہو گئی تھی' اب تو ایک ایک پل کا بار اٹھانا اس کے لیے دشوار ہو رہا تھا نجانے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ہی ایمان نے اس کا شہر چھوڑا' اس کی سانسیں بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی۔

اگلے سات دن چٹکیوں میں گزر گئے۔ شجاع کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں لہٰذا اسے واپس ناروے جانا تھا' پھر ایمان ہمدانی سے اس کی اچانک شادی بھی صرف اور صرف اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ اس میں اس کے گھر والوں کی قطعی کوئی مرضی شامل نہیں تھی' یہاں تک کہ اس نے اپنی شادی کے متعلق انہیں کوئی اطلاع ہی نہیں دی تھی اور ایمان کو یہ سب کچھ معلوم تھا کیوں کہ شجاع کو' جس کے لیے اس نے اپنے گھر والوں کی مرضی کی پروا کیے بغیر' ایمان کو اپنی زندگی میں



شامل کر لیا تھا اور اب اس کا ارادہ تھا کہ وہ پاکستان میں ایمان کی ساری پراپرٹی سمیٹ کر اسے ہمیشہ کے لیے ناروے ہی لے جائے' جہاں اس کی پرکشش جاب کے ساتھ' اس کی فیملی بھی آباد تھی اور ایمان کو اس نے بتایا تھا کہ اس کی مما اس سے بہت پیار کرتی ہیں' لہٰذا وہ اس کی خوشی کے لیے ضرور ایمان کو قبول کر لیں گی' لیکن اس سب میں تھوڑا سا وقت لگے گا' تب تک ایمان کو شجاع کے ساتھ اس کے دوست کے گھر رہنا ہو گا اور ایمان نے اس کی محبت کے لیے یہ سب کچھ قبول کر لیا تھا۔ کیوں کہ احمد ہمدانی صاحب کی رحلت کے بعد وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگی تھی اور اب اس کی سب سے بڑی خواہش ایک بھری پری فیملی کے ساتھ رہنا ہی تھا۔ تب ہی وہ ناروے جانے کے لیے از حد خوش دکھائی دے رہی تھی۔

اس روز اتوار تھا اور پیر کو انہیں ناروے کے لیے فلائی کر جانا تھا لہٰذا وہ شجاع کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر زندگی میں آخری بار سفیر علی خان سے ملنے کے لیے چلی آئی تا کہ وقتِ رخصت وہ اسے ہنسی خوشی اپنی زندگی بسر کرنے کی تنبیہ کر سکے اور اس کی بے پروائیوں پر اسے خوب ڈانٹ سکے۔

سو گیٹ پر چوکیدار سے سفیر علی خان کی گھر موجودگی کے بارے میں جان کر وہ سیدھی اس کے بیڈ روم میں چلی آئی کہ سفیر گھر پر اپنا زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتا تھا اور آج کل تو ویسے بھی اس کی طبیعت خراب تھی لیکن وہ اس وقت بے حد حیران رہ گئی جب وہ اپنے کمرے میں بھی موجود نہیں تھا۔ خالی لان' خالی راہداری' خالی لاؤنج اور اب خالی اس کا کمرہ بھی' اس کا منہ چڑا رہے تھے جب کہ چوکیدار اس کی گھر موجودگی کا بتا رہا تھا۔

بے حد حیرانی کے عالم میں وہ واپسی کے لیے پلٹی تھی اور پھر جیسے وہیں پتھر کی ہو گئی۔ پھٹی پھٹی نگاہوں کے ساتھ کس قدر بے یقینی کے عالم میں وہ ٹیبل پر پڑی اس تصویر کو دیکھ رہی تھی جو اس کے ڈیڈ نے خود اپنے ہاتھوں سے ہمدانی ہاؤس کے لان میں اس کے کھل کھلاتے ہوئے پوز میں کھینچی تھی۔ بعد میں وہ پوری ریل دھلوانے کے لیے سفیر علی خان کے سپرد کر دی تھی اور اس نے اگلے ہی روز دھلوا کر پورا البم ایمان کے سپرد کر دیا تھا۔

اور اس البم میں اپنے نیگیٹو کے ساتھ آج بھی یہ تصویر جوں کی توں موجود تھی' تو پھر یہ یہاں کیسے پہنچ سکتی ہے؟ نہایت حیرانی کے عالم میں غائب دماغی کے ساتھ صرف ایک پل کے لیے اس نے سوچا تھا اور پھر اگلے ہی پل جیسے ساری کتھا اس کی سمجھ میں آ گئی۔ مارے غم و

غصے کے وہ بری طرح سے کانپ اٹھی تھی کہ اسی پل سفیر نے اپنے کمرے کی دہلیز پر قدم رکھا اور وہ بپھری ہوئی شیرنی کی مانند شدید غصے کے عالم میں اس کی طرف بڑھی' پھر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ایک زبردست طمانچہ اس کے گال پر جڑتے ہوئے درشتگی سے بولی۔

"یہ سب کیا ہے مسٹر سفیر علی خان...... بولو' جواب دو...... تمہارے کمرے میں میری تصویر کا کیا کام؟ کیسے آئی میری تصویر یہاں...... مجھے بتاؤ گے تم......؟" حلق پھاڑ لہجے میں بھرپور شدت کے ساتھ وہ اس پر چلائی تھی جبکہ اپنے بائیں گال پر ہاتھ رکھے ہونق سے سفیر علی خان کا سر اپنے انتہائی قیمتی راز کے یوں افشا ہو جانے کے بعد آپ ہی آپ مجرمانہ انداز میں جھک گیا۔

"ذلیل' گھٹیا انسان' میرے ڈیڈ نے تمہیں اپنے گھر میں پناہ دی' تم پر رحم کھایا' اعتماد کیا' لیکن تم نے کیا کیا' ہاں...... تم نے ان ہی کی بیٹی کے ساتھ محبت کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔ ارے میں بھی کہوں کہ تم ہر وقت میری تابعداری کا دم کیوں بھرتے رہتے تھے لیکن اب سمجھ میں آیا کہ وہ تمہاری عقیدت نہیں بلکہ غرض تھی' تم ہر وقت مجھے اپنے قریب دیکھنا چاہتے تھے' کتنی بے وقوف تھی میں' تمہاری شرافت سے دھوکا کھا کر تمہارے اندر کا میلا پن' تمہاری گندی نیت' دیکھ ہی نہیں پائی میں اور ہمیشہ تمہیں اچھا ہی سمجھتی رہی لیکن پاگل تھی میں...... تم جیسے لاوارثوں کو ان کی اوقات میں ہی رکھنا چاہئے ورنہ انگلی کا سہارا پا کر سر پر چڑھ جاتے ہو تم لوگ......"

نہایت متنفر لہجے میں چلاتے ہوئے وہ سفاکی کی آخری حد کو بھی چھو گئی۔ مارے اشتعال کے اس کی چھوٹی سی ناک کی پھنگیں پھول گئی تھیں جب کہ چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا تب ہی گم صم سے کھڑے سفیر علی خان کے لبوں پر دھرنا دیئے بیٹھی' خاموشی کا قفل ٹوٹا اور اس نے صرف ایک نظر ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ' اس کی طرف دیکھا' پھر سر جھکا کر دھیمے لہجے میں بولا۔

"سوری۔"

"شٹ اپ...... تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تم سے کوئی بھی تعلق رکھا جائے۔"

اس کے ایکسکیوز کہنے پر پھر سے چلا کر وہ اپنی ہی تصویر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے منہ پر مارتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی جب کہ غم سے نڈھال سفیر علی خان تھکے تھکے سے انداز میں وہیں دہلیز پر بیٹھ کر ان بکھرے ہوئے کاغذی ٹکڑوں کو چننے لگا۔ دل کا درد حد سے سوا ہو گیا تھا جب کہ آنکھیں ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں' اس رات اپنی معصوم



محبت کا راز افشا ہو جانے پر ایمان ہمدانی کے نہایت سخت ری ایکشن نے اسے شدید ہرٹ کیا تھا۔ ذہن کے اندر اس کے نوکیلے لفظوں کی بازگشت سے جیسے تیز آندھیاں چل پڑی تھیں۔ اس کے دل کا ٹکڑا ٹکڑا لہولہان ہو کر رہ گیا تھا لیکن کوئی نہیں تھا جو اس کے آنسو چنتا اور اسے بکھرنے سے سمیٹ پاتا۔

کب یہ سوچا تھا اس نے کہ تقدیر ایک دن اسے یوں رسوا کر دے گی۔ کب ایمان ہمدانی کو آنکھوں اور دل میں بسانے پر اس کا کوئی اختیار رہا تھا' نافرمان دل نے تو اس سلسلے میں اس کی ایک بھی نہیں سنی تھی اور وہ جو اسے کھو دینے کے ڈر سے کبھی اس پر اپنی خاموش محبت کا راز افشا نہیں کر پایا تھا' آج اسی کے ہاتھوں کس قدر رسوا ہو گیا تھا۔ ایمان کی وہ تصویر جو ہمدانی صاحب نے اپنے کیمرے سے خود بنائی تھی اور جسے دھلوانے کے لیے اس کے سپرد کیا تھا' اس نے کیسے منہ زور محبت سے مجبور ہو کر اس کے دو پرنٹ نکلوا لیے تھے تا کہ جب بھی موقع ملے وہ جی بھر کر اس پیاری سی صورت کو دیکھ سکے پھر اس کے سامنے تو وہ نگاہ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا کہ کہیں وہ اس کی آنکھیں پڑھ نہ لے' چنانچہ اس موقع کو گولڈن چانس سمجھتے ہوئے اس نے بے حد خوشی کے ساتھ وہ تمام تصویریں جو ایمان ہمدانی کی اس کی فیملی کے ساتھ تھیں' دھلوا کر اس کے حوالے کر دیں تاہم وہ تصویر جو صرف ایمان کی تھی اور جس میں وہ خوب کھل کھلا کر ہنس بھی رہی تھی' وہ اس نے اپنے پاس محفوظ کر لی تھی اور آج تک اسی ایک تصویر نے اس کا ضبط قائم رکھا تھا۔ یہ تصویر اسے بے حد عزیز تھی' اس وقت بھی وہ تصویر کو ڈائری لکھنے کے بعد ٹیبل پر ہی بھول کر اوپر ٹیرس پر چلا آیا تھا کہ ایمان ہمدانی کی بے وقت اور اچانک آمد نے اسے ایک مرتبہ پھر عرش سے فرش پر لا پٹخا۔

اس پوری رات وہ جاگتا رہا تھا' ایک لمحے کے لیے بھی نیند آنکھوں کے قریب نہیں آئی تھی اور ٹھیک اسی رات ایمان ہمدانی اپنے شوہر شجاع آفندی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے سرزمین پاکستان سے اپنا ہر ناتا توڑ کر ناروے فلائی کر گئی۔ ناروے میں ایک بالکل مختلف زندگی اس کی منتظر تھی۔



شجاع نے اسے اپنے جس دوست کے گھر ٹھہرایا تھا' وہ گھر تو بہت اچھا تھا پر سکون بھی تھا لیکن پھر بھی ایک عجیب سی بے کلی ہمہ وقت اس کا احاطہ کیے رہتی۔

وہ پاکستان اور پاکستان سے وابستہ ہر یاد کو فراموش کر دینا چاہتی تھی لیکن صد افسوس کہ جتنا وہ پاکستان میں بیتے دنوں کو بھلانے کی کوشش کرتی، اتنا ہی وہ لمحے عود عود کر اس کے تصورات میں چلے آتے۔

پھر شروع کے ایک دو دن تو شجاع نے اسے بھرپور کمپنی بھی دی تھی لیکن چند ہی روز کے بعد وہ بھی اپنی مصروفیات میں الجھ گیا اور یوں وہ اتنے خوب صورت ملک میں جیسے بالکل اکیلی ہو کر رہ گئی۔ ایسے لمحات میں اس کی شدید خواہش تھی کہ اس کے پیارے پیارے بچے ہوں، جن میں مصروف ہو کر وہ کسی یاد کو قریب بھٹکنے نہ دے لیکن افسوس کہ شجاع نے اس سلسلے میں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا کیوں کہ وہ ابھی بچے افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ پہلے وہ اپنے ملک جا کر اچھی طرح سے سیٹل ہو جائے، پھر نئی ذمہ داریوں کو قبول کرے گا اور ایمان کے لیے بھلا اس کی کسی بھی بات سے انکار کہاں ممکن تھا۔ سو چپ چاپ اس کا یہ ستم بھی سر آنکھوں پر رکھ دیا۔

اس روز بہت عجیب سا واقعہ ہوا۔ وہ مسلسل گھر میں رہ کر شدید بوریت محسوس کر رہی تھی جب شجاع کی غیر موجودگی میں گھر لاکڈ کر کے وہ باہر روڈ پر نکل آئی۔ یہاں کے راستوں سے اسے تھوڑی بہت آشنائی تو ہو ہی چکی تھی لہٰذا بھٹکنے کا ڈر اب نہیں رہا تھا۔

تب ہی نجانے کتنی دیر تک وہ اکیلی یونہی چلتی رہی، سردی کا احساس اسے بری طرح سے کپکپا رہا تھا لیکن وہ جیسے خود سے ہی بے نیاز بنی چل رہی تھی جب ایک اسٹاپ پر اس نے شجاع ہمدانی کو دیکھا، ہنستے کھل کھلاتے ہوئے وہ ایک لاغر سی عورت اور ایک چھوٹے سے بچے کے ساتھ شاید کچھ خرید رہا تھا، اس وقت ایمان ہمدانی کا دل کیسے سناٹوں کی زد میں آیا تھا۔ یہ کرب صرف وہی عورت جان سکتی ہے کہ جو خود اس مرحلے سے گزری ہو۔

آنکھیں بن بادل برسات برس رہی تھیں۔ قدموں میں جیسے بالکل سکت ہی نہیں رہی تھی، تب ہی گھر واپسی کا راستہ اس نے پورے ایک گھنٹے میں طے کیا اور گھر آتے ہی بستر میں گھس کر سسک پڑی۔

جو منظر اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ اسے جھٹلا نہیں سکتی تھی لیکن شجاع آفندی کی محبت پر شک کرنا گویا خود پر شک کرنا تھا اس کے لیے۔ تب ہی اس نے اس شک کے ناگ کو کچل دیا اور اس عورت کو شجاع کی کوئی رشتہ دار جان کر بالآخر ذہن سے نکال دیا۔



اس روز اس واقعے کو جھٹلانے کی ہمت تو اس نے کر لی تھی لیکن اس کے اعصاب وہ منظر بھلا نہیں پائے تھے جس کی وجہ سے وہ تیز بخار میں مبتلا ہو گئی اور اسی حالت میں کب وہ نیند کی وادی میں پہنچ گئی، کچھ خبر نہ ہو سکی اگلے روز صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو شجاع اس کے قریب ہی بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا اور اخبار پڑھ رہا تھا جب کہ وہ ابھی تک حرارت محسوس کر رہی تھی، تب ہی اٹھ کر بیٹھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

''شجاع! آپ مجھے اپنے گھر والوں سے کب ملوائیں گے۔ بی لیومی، میں یہاں بہت تنہائی محسوس کر رہی ہوں۔'' وہ بات جو وہ پچھلے بہت سے دنوں سے اس سے کہہ رہی تھی، آج پھر سے زبان پر آ گئی جس پر شجاع نے اخبار سمیٹ کر سائیڈ پر رکھتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھا پھر دونوں بازو گردن کے پیچھے باندھ کر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔

''بس تھوڑا سا انتظار اور میری جان، پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہیں بھی تمہاری منزل مل جائے گی اور مجھے بھی، میرا مطلب ہے کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو پالیں گے...... پھر تمہیں بھری پری فیملی مل جائے گی اور مجھے میری زندگی......''

''لیکن وہ دن کب آئے گا شجاع......؟'' قدرے زچ ہو کر اس نے پوچھا تھا۔

''آئے گا میری جان، بہت جلد آئے گا۔''

شجاع کی آنکھوں میں عجیب سی مسرت ہلکورے لے رہی تھی تاہم ایمان نے نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹا کر بند کر لیں کہ اب ایک اجنبی دیس میں تنہائیوں کے ساتھ انتظار کی صلیب پر لٹکتے لٹکتے بھی تو تھکنے لگی تھی۔

وقت اپنی روٹین کے مطابق یونہی گزر رہا تھا اور وہ جیسے زندگی کو بے دلی سے گھسیٹ رہی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ شجاع کی اندھی محبت کا جنون اس کے دل سے اتر رہا تھا، پچھلے کئی دنوں سے اس کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ ہلکا ہلکا سا ٹمپریچر جیسے ہڈیوں میں رچ گیا تھا۔ تھوڑا سا چل کر ہی بری طرح سا ہانپ جاتی، گھر میں کوئی کام بھی کرنے کو من نہیں چاہتا تھا، سونے پر سہاگہ کہ شجاع کو بھی اس پر توجہ دینے کی بالکل فرصت نہیں رہی تھی۔

دو دو تین تین دن وہ گھر سے باہر رہتا اور پیچھے وہ کڑھتی رہ جاتی لیکن اس کے

باوجود اس بندھن کو نبھانا چاہتی تھی کیوں کہ اس نے شجاع کو چاہا تھا' خدا سے رو رو کر مانگا تھا' تو پھر اب اس کی بے نیازی سے ہار مان کر کیسے گنوا دیتی اسے؟

اس روز موسم بے حد سہانا ہو رہا تھا' ٹھنڈی سرد ہوائیں موسم کو عجیب سا سرور عطا کر رہی تھیں تب ہی وہ گھر کو لاک کر کے کچھ شاپنگ کرنے کی غرض سے مارکیٹ چلی آئی اور ابھی سبزی وغیرہ ہی خریدی تھی کہ ٹپا ٹپ بارش شروع ہو گئی لہٰذا اسے باقی کی شاپنگ ملتوی کرتے ہوئے فوری طور پر ہی گھر واپس لوٹنا پڑا۔

سبزی کی بھاری ٹوکری اٹھا کر بیس' پچیس سیڑھیاں طے کرنے کے بعد جس وقت وہ زینے تک پہنچی' تھکن سے بے حال تھی اور اس سے پہلے کہ وہ پسینہ خشک کر کے اپنے کمرے کا دروازہ کھولتی' اندر شجاع آفندی کی تیز آواز نے اس کے قدم وہیں جکڑ دیئے۔

''تم سمجھتے کیوں نہیں ہو یار......؟ یہ سب میں اپنی بیوی' بچے اور گھر والوں کے لیے ہی تو کر رہا ہوں ورنہ اس ناٹک کو طویل تر کرنے کا مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے' لیکن مجبوری ہے میں ابھی اس کی تمام پراپرٹی حاصل نہیں کر پایا ہوں اور پھر میں نے جو ڈائیورس پیپرز سائن کیے ہیں ابھی ان پر ایمان ہمدانی کے سائن نہیں لے سکا ہوں میں' تم لوگ پلیز مجھے تھوڑا سا وقت اور دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری پائی پائی ادا کر دوں گا۔''

الفاظ کیا تھے کوئی بم تھا' جو ایمان ہمدانی کے دل پر گرا تھا اور اندر کی ہر چیز کو ریزہ ریزہ کر گیا تھا۔ پاؤں تلے سے زمین نکلنا کسے کہتے ہیں' یہ اسے آج پتہ چلا تھا۔ دھواں دھواں سی آنکھوں میں' بے یقینی کی راکھ اڑ رہی تھی اور وہ پتھر بنی وہیں زینے پر دوزانوں ہو کر بیٹھ گئی۔

چہرہ ایسے سفید ہو گیا تھا گویا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ عین اسی پل شجاع نے اپنے دوست کو رخصت کرنے کے لیے دروازہ کھولا تھا لیکن اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایمان ہمدانی مارکیٹ سے اتنی جلدی لوٹ آئے گی اور اس کا تمام راز جان بھی لے گی تب ہی اسے سو وولٹ کا جھٹکا لگا تھا اور وہ اپنے دوست کو جلدی سے رخصت کرنے کے بعد تیزی سے ایمان ہمدانی کی طرف بڑھا تھا۔

''ایمان! تم اتنی جلدی لوٹ آئیں...... اور...... اور یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ اندر چلو پلیز......'' محبت کی چاشنی میں ڈوبا شہد آگیں لہجہ لیکن اب ایمان ہمدانی ایسے سحر میں ڈوبنے والی نہیں تھی' تب ہی خالی خالی سی پر شکوہ نگاہیں اسی متفکر چہرے پر جماتے ہوئے دھیمے لہجے



میں بولی۔

''تم نے مجھے دھوکہ کیوں دیا شجاع......؟ میں نے تو تم سے پیار کیا تھا' تم پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی ایک ایک سانس تمہیں دان کر دی تھی لیکن تم نے کیا کیا شجاع......؟ تم نے صرف میری دولت کے حصول کے لیے میری محبت کا تماشہ لگا دیا' کیوں......؟''

دکھ کی شدت سے چلاتے ہوئے وہ زخم زخم ہو گئی تھی تب ہی بوکھلائے ہوئے شجاع آفندی نے گھبرا کر ارد گرد دیکھا' صد شکر کہ قرب و جوار میں سبھی کمرے بند تھے' تب وہ ایمان کو بازو سے پکڑ کر زبردستی اٹھاتے ہوئے بولا۔

''کم آن ایمان' تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے...... چلو اندر چلو......''

''شٹ اپ...... مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے' میں نے سب کچھ اپنے کانوں سے سنا ہے اور کتنا جھوٹ بولو گے شجاع اور کتنا فریب کرو گے میرے ساتھ......'' نہایت درشتگی سے کہتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے آزاد کروا لیا۔

شجاع کے مفاہمتی لہجے پر زلزلوں کی زد میں چکراتی ہوئی ایمان ہمدانی نے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا' پھر چپ چاپ اٹھ کر اندر کمرے میں چلی آئی کہ اب اپنی بربادی کی داستان تو اسے سننی ہی تھی۔

''میں تمہیں کوئی دھوکہ دینا نہیں چاہتا تھا ایمان' اور نہ ہی پاکستان سے ناروے شفٹ ہونے کے بعد تمہارے متعلق کچھ جانتا تھا کیوں کہ ناروے کی چکا چوند زندگی میں کھوکر کھر مجھے کبھی پاکستان کے موسم یاد نہیں آئے' یہاں کے سمندر کے کنارے ڈوبتے ہوئے سورج کا دلکش منظر دیکھتے ہوئے میں نے کبھی تمہیں یاد نہیں کیا کیوں کہ میں ثمن سے پیار کرتا تھا' بچپن ہی سے' صرف اسی کے متعلق سوچا تھا اور اسی کے لیے مما' پاپا کو مجبور کر کے ناروے لایا کیوں کہ وہ یہیں رہتی ہے۔ میں اسے کتنا چاہتا ہوں' یہ تم کبھی نہیں جان سکو گی اور اس کے لیے کسی کو دھوکہ دینا تو کیا' مجھے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جان بھی لینی پڑے تو میں انکار کا تصور نہ کروں' وہ میری ماموں زاد ہے ایمان' پچھلے تین سال سے ہم ازدواجی رشتے میں بندھے ہیں' ہمارا ایک پیارا سا بیٹا بھی ہے' جو ہم دونوں کو ہی بہت عزیز ہے۔ بہت پرسکون زندگی تھی ہماری لیکن گزشتہ سال سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ میری محبوب بیگم جسے میں اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتا ہوں' وہ زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑی ہے آج۔ ڈاکٹرز کے مطابق اسے

معدے کا کینسر ہے' جو ابھی خطرناک اسٹیج تک نہیں پہنچا ہے لہٰذا میڈیکل ٹریٹ منٹ سے وہ صحت یاب ہوسکتی ہے اسی لیے میں نے یہ کھیل رچایا کیوں کہ ڈیڈ جب تک زندہ تھے' وہ خود ہی ثمن کا علاج کرواتے رہے لیکن ان کی ڈیتھ کے بعد ہمارا بزنس بری طرح سے فیل ہوگیا اور مختلف لوگ ان سے قرضہ لینے کے حق دار بن کر ہمارے در پر چلے آئے یوں ہاتھ میں جتنا پیسہ تھا' وہ سب قرض خواہوں کی نذر ہوگیا اور اس سچویشن سے ثمن کی حالت مزید بگڑ گئی۔ میرے گھر والے بھوکوں مرنے لگے' میرے بچے کو اسکول سے اٹھالیا گیا۔ میں نے اچھی جاب کے لیے اپلائی کیا مگر میری بدنصیبی کہ میرے پاس کوئی تجربہ نہ ہونے کے باعث مجھے پرکشش جاب نہیں مل سکی۔ زندگی کا دائرہ دن بدن مجھ پر تنگ ہوتا جارہا تھا جب ایک دن مجھے احمد انکل سے مدد لینے کا خیال آیا اور میں نے ایک دوست کے گھر سے انہیں فون کرڈالا لیکن احمد انکل کی جگہ توصیف انکل نے فون ریسیو کیا اور میرے پوچھنے پر احمد انکل کی ڈیتھ اور تمہارے گھریلو حالات تفصیلاً میرے گوش گزار دیئے تب اچانک ہی میں نے سوچا کہ تم اپنے ڈیڈ کی اکلوتی اولاد ہو' سو اگر میں تم سے شادی کرلوں تو ڈائریکٹ تمہاری ساری دولت میری ہوجائے گی اور یوں میں اپنے گھر والوں کو زندگی دان کرسکوں گا۔ بعد میں مناسب موقع پر تمہیں ساری سچائی بتا کر تم سے معافی مانگ لوں گا لیکن تم نے تو بہت پہلے ہی ساری حقیقت جان لی ایمان' سمجھ میں نہیں آتا کہ اب میں کیا کروں......؟''

''واہ...... ویری انٹرسٹنگ مسٹر شجاع آفندی' کہانی تو بہت دل چسپ سنائی آپ نے۔ لیکن صد افسوس کہ میں آپ کی اصلیت جاننے کے بعد اب مزید آپ کے ہاتھوں کٹھ پتلی نہیں بنوں گی۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم اپنی محبت کو بچانے کے لیے میرے جذبات سے کھیلو گے اور میں چپ چاپ تماشہ دیکھتی رہوں گی۔ نیور مسٹر شجاع آفندی! میں اپنے پاپا کی محنت سے کمائی ہوئی دولت کی ایک پائی بھی تمہیں چھیننے نہیں دوں گی۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم نیلے سمندروں کے مسافر ہو' پانیوں سے کھیلتے ہو اور ہواؤں سے باتیں کرتے ہو' لیکن میں غلط تھی کیوں کہ تم تو سراسر ایک سراب ہو' محبت کا جھانسہ دے کر معصوم دلوں کو لوٹنے والے لٹیرے ہو تم' لہٰذا میں ابھی اور اسی وقت تمہاری زندگی سے نکل رہی ہوں......'' شجاع کی تفصیلی داستان پر نہاتے طیش کے عالم میں اس نے کہا۔ پھر تھوڑی سی تلاش کے بعد ڈائیورس پیپرز ڈھونڈ کر ان پر اپنے سائن کردیئے۔ ان پیپرز پر سائن کے دوران دل پر کیسے آرے چلے تھے' نازک انگلیاں کیسے کپکپائی



تھیں' یہ صرف اس کا دل جانتا تھا' تاہم پیپرز کو سائن کرنے کے بعد وہ شجاع آفندی کی سمت پلٹی پھر درشت لہجے میں بولی۔

''یہ لیجیے مسٹر شجاع آفندی' میں نے آپ کو اپنی اندھی محبت سے آزاد کیا' لیکن آپ نے جو میرے ساتھ کیا ہے ناں' اس کے لیے میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی مسٹر شجاع آفندی' تم دیکھنا اب میں تمہارے ساتھ کیا کرتی ہوں۔''

چٹانوں جیسے سخت لہجے میں اسے تنبیہ کرتے ہوئے وہ ابھی پلٹی ہی تھی کہ خاموش کھڑے شجاع آفندی نے مضبوطی سے اس کی کلائی تھام لی' پھر قدرے چیختے ہوئے بولا۔

''تم بات کو اتنا بڑھا کیوں رہی ہو؟ جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں تمہارے سارے پیسے واپس لوٹا دوں گا تو تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کررہیں......؟''

''کیوں کہ تم اپنا بھروسہ خود کھو چکے ہو شجاع آفندی۔ اب مجھے پولیس میں تمہارے خلاف کمپلین کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور ہاں' میں آج ہی تمہارے گھر والوں کا سراغ لگا کر انہیں یہ ساری حقیقت بتا دوں گی' پھر میں دیکھوں گی کہ وہ اپنے فریبی بیٹے کا ساتھ دیتے ہیں یا ایک بے سہارا لڑکی کا......''

اس کے لہجے کی مضبوطی بتارہی تھی کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہی ہے' اس پر کسی بھی حال میں عمل کرنے کا ارادہ بھی رکھتی ہے۔ تب ہی وہ ایک مرتبہ پھر گھٹی گھٹی سی آواز میں چلایا تھا۔

''تم ایسا کچھ بھی نہیں کرو گی' انڈر اسٹینڈ......''

''تو...... میں اپنے کہے پر عمل کرکے دکھاؤں گی تمہیں' ناؤ جسٹ ویٹ اینڈ واچ......''

درشتگی سے دوبدو کہنے کے ساتھ ہی اس نے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی شجاع کی مضبوط گرفت سے آزاد کروائی تاہم اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے باہر نکلتی' مکمل طور پر بے بس سے شجاع آفندی نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا پھر اس کے گرد اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس نے آناً فاناً ہی نازک سی ایمان ہمدانی کو قریبی بیڈ پر دھکیل دیا۔ ارادہ اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے کا تھا لیکن خدا کو شاید ابھی اس کی زندگی منظور تھی' سو اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور شجاع چونک کر پلٹ گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب بری طرح سے ہانپتے ہوئے ایمان ہمدانی نے اپنی ناہموار سانسیں درست کیں اور اگلے ہی پل

موقع سے فائدہ اٹھا کر شجاع کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اس نے باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔ اس وقت نہ تو اسے دوپٹے کا ہوش تھا نہ اپنی دولت کی کوئی پروا' فکر تھی تو صرف اور صرف اپنی جان کی' جسے وہ ایک بے وفا کے ہاتھوں ہرگز گنوانا نہیں چاہتی تھی۔

دروازے پر کھڑے شجاع کے دوستوں نے اسے پکڑنے کی بجائے حیرانی سے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا پھر جب شجاع نے چلا کر ان سے ''کم آن موو' پکڑو اسے......'' کہا تو وہ دونوں بھی شجاع کے ساتھ اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔

کبھی کبھی زندگی کی حفاظت بھی کس قدر دشوار ہو جاتی ہے۔ اس کا تجربہ اسے آج ہوا تھا' گو تھکن سے برا حال تھا' سانس پھولی ہوئی تھی' پاؤں میں دو قدم کا فاصلہ طے کرنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی لیکن وہ زندگی بچانے کے لیے سرپٹ بھاگ رہی تھی۔

کوئی نہیں تھا جو اس اجنبی دیس میں اسے سہارا دیتا' اسے سنبھالتا' ان بے درد لٹیروں سے محفوظ رکھتا' ماسوائے خدا کی پاک اور بابرکت ذات کے' جس کی مدد کے سہارے وہ اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔

بھاگتے بھاگتے اس کا سانس بری طرح سے پھول گیا۔ ایک پاؤں سے تو خون بھی نکل پڑا تھا' تب اچانک ہی اس کی نگاہ سامنے لوگوں کے ہجوم پر پڑی جو غالباً کسی میوزک ہال کے باہر کھڑے ٹکٹ خرید رہے تھے۔ ایمان نے جو ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کر دیکھا تو گویا اپنی جگہ گم صم ہوگئی کیوں کہ میوزک ہال سے باہر بڑے بڑے بینرز پر لکھا ہوا نام یقیناً سفیر علی خان کا ہی تھا۔

ایک پل کے لیے تو وہ ٹھٹھک گئی' رگوں میں نئے سرے سے زندگی کا احساس دوڑنے لگا۔ سفیر علی خان کی وہاں موجودگی اسے نعمت خداوندی لگی۔ اجنبیوں کی بھیڑ میں کسی ایک اپنے کا احساس اسے حوصلہ تھما گیا لیکن اگلے ہی پل جب اسے سفیر علی خان سے کیے گئے اپنے سلوک کے متعلق یاد آئی تو اس کی امید کا تار ٹوٹ گیا۔ آنکھوں میں آپ ہی آپ ڈھیروں آنسو بھر آئے' اسی پل اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا شجاع اور اس کے دوست تا حال اسے ڈھونڈ رہے تھے' تب سب کچھ بھلاتے ہوئے وہ لوگوں کے ہجوم میں دھکے کھاتی' گیٹ تک پہنچی جہاں دو شخص ڈیوٹی پر کھڑے ٹکٹ جمع کر رہے تھے۔ وہ کوئی راہ نہ پا کر بے بسی کے عالم میں انہی کی منت کرنے لگی۔



''دیکھیے پلیز مجھے اندر جانے دیجیے' مجھے سفیر علی خان سے ملنا ہے' بہت ارجنٹلی' پلیز مجھے اندر جانے دیجیے۔''

''لائیے ٹکٹ......'' اس کی منت سے متاثر ہو کر ایک شخص نے مصروف انداز میں کہا تاہم وہ اس کی ڈیمانڈ پر گم صم سی ہوگئی۔

''ٹ......ٹکٹ نہیں ہے میرے پاس۔'' پھنسی پھنسی سی آواز میں اس نے کہا۔

''ٹکٹ نہیں ہے تو یہاں لینے کیا آئی ہو' چلو پیچھے......'' ان دونوں میں سے ہی ایک آدمی نے غصے سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے کرختگی سے کہا تو وہ رو پڑی۔

''م......مجھے سفیر علی خان سے ملنا ہے' تم...... میں انہیں قریب سے جانتی ہوں' دیکھیے میری زندگی اس وقت خطرے میں ہے' اس لیے پلیز مجھے ان سے مل لینے دیجیے پلیز......''

اس کی عاجزانہ ریکویسٹ پر جہاں سامنے کھڑے وہ دونوں اشخاص بے ساختگی سے ہنس پڑے تھے' وہیں کچھ اور لوگ بھی دلچسپی سے اس کا تماشہ دیکھنے لگے۔

''یار یہ تو کوئی بہت بڑی فین لگتی ہے سیف صاحب کی' دیکھو کیسے رو رہی ہے لیکن بی بی آپ کو شاید معلوم نہیں کہ سفیر علی صاحب کوئی معمولی ہستی نہیں ہے جن سے ہرا ایرا غیرا بلا روک ٹوک مل سکے' ان کا آج ناروے میں پہلا کامیاب شو ہے اور اس شو کی ٹکٹ پانچ ہزار روپے ہے' سمجھیں آپ......''

گیٹ پر الرٹ کھڑے اس شخص نے ظرافت کے انداز میں اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے پھر اسے ضروری معلومات بہم پہنچائیں تو وہ بے حد پریشانی کے انداز میں ان دونوں کی طرف ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔ لوگ جوق در جوق اپنے ٹکٹ کنفرم کروا کے ہال کے اندر جا رہے تھے اور وہ باہر کھڑی سوکھے پتے کی مانند کانپ رہی تھی۔

''م......مگر میرے پاس تو اس وقت ایک روپیہ بھی نہیں ہے۔'' نہایت متوحش سی ہو کر اس نے پھر سے وضاحت دی تھی جس پر اس کے قریب کھڑے سبھی لوگ بے ساختگی سے ہنس پڑے۔

''بی بی اگر ایک روپیہ بھی پاس نہیں ہے تو یہاں سے چلتی پھرتی نظر آؤ' خواہ مخواہ میں وقت برباد مت کرو ہمارا۔'' گیٹ پر موجود شخص نے پھر خاصے کرخت انداز میں کہا تو وہ سچ

مچ گڑ بڑا کر رہ گئی۔ اسی پل اس کی نگاہ اپنے گلے میں پڑی چین پر گئی تو اس نے فوراً وہ چین اتار کر اس شخص کے حوالے کر دی پھر التجائیہ لہجے میں بولی۔

''میرا سفیر علی خان سے ملنا بہت ضروری ہے' پلیز...... اب تو مجھے اس کے پاس جانے دیجیے۔''

''بالکل جانے دیں گے لیکن کیا ہے کہ آپ کی یہ چین کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے اس لیے یہ دونوں انگوٹھیاں بھی دے دیجیے' تب ہی کوئی بات بن سکے گی۔''

اس کی دیوانگی دیکھ کر وہ دونوں شخص بہت ہوشیار ہو گئے تھے جب ہی اس کی ہزاروں مالیت کی وزنی چین کے ساتھ ساتھ اس کی دونوں رینگز بھی ہتھیالیں' پھر اس سے پہلے کہ وہ اسے ٹکٹ کاٹ کر دیتے' شجاع اور اس کے دونوں دوست وہاں پہنچ گئے اور اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

''او ایمی تم یہاں ہو اور ہم نے تمہیں ڈھونڈنے کے لیے پورا شہر چھان مارا' کم آن چلو گھر تمہاری دوا کا وقت ہو گیا ہے۔''

''اس پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے شجاع بلند آواز میں بولا تو لوگوں نے کسی قدر حیرانی کے عالم میں سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''سوری فرینڈز...... ایکچولی میری وائف تھوڑی سی ایب نارمل ہیں' ان پر کبھی کبھی پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں تو گھر سے بھاگ کر یونہی تماشہ کرتی ہیں' ونس اگین ویری سوری......''

شجاع کے الفاظ پر لوگوں نے ایمان کی حالت دیکھتے ہوئے فوراً یقین کر لیا جب کہ وہ چلا چلا کر سب کو اپنے نارمل ہونے کے متعلق بتاتی رہی' اپنی زندگی خطرے میں ہونے کی صدائیں دیتی رہی لیکن کسی نے اس کا یقین نہیں کیا اور شجاع اپنے ساتھیوں کی مدد سے اسے گھسیٹتے ہوئے دور لے گیا۔

پھر عین اسی پل کہ جب وہ چلا چلا کر سفیر علی خان کو پکار رہی تھی' وہ قطعی بے خبری کے عالم میں پروگرام ختم کر کے میوزک ہال سے باہر نکلا اور لوگوں کے جم غفیر میں پھنس کر رہ گیا۔ شور اور ہلچل اس قدر تھی کہ ایمان کی صدائیں اس کی سماعتوں تک نہ پہنچ سکیں اور وہ لمحہ بہ لمحہ دور ہوتے چلا چلا کر اسے پکارتی رہی' یہاں تک کہ اس نے اسے خود لوگوں کے درمیان



گھرے ہوئے دیکھ لیا' تب یکایک اپنی ساری قوت جمع کر کے اس نے اپنے آپ کو شجاع کی مضبوط گرفت سے آزاد کروایا اور اندھا دھند بھاگتی ہوئی لوگوں کے ہجوم تک پہنچ گئی۔

حلق سے اب بھی صرف سفیر علی خان کا ہی نام نکل رہا تھا لیکن لوگ اسے آگے آنے نہیں دے رہے تھے' پھر اس سے پہلے کہ شجاع اور اس کے ساتھی اس تک پہنچ کر اسے دوبارہ اپنی گرفت میں لیتے' لوگوں کے ہجوم میں گھرے خوبرو سے سفیر علی خان تک اچانک ہی ایمان کی پکار پہنچی اور وہ چونک کر اس کی سمت دیکھتے ہوئے پھر لوگوں کے ہجوم کو پیچھے دھکیلتا اس کی سمت دوڑ پڑا۔

ادھر ایمان اسے اپنی طرف متوجہ پا کر لہولہان پاؤں کے ساتھ اس کی سمت لپکی اور جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچا وہ اس کے قدموں میں گر پڑی' پھر اس کی ٹانگوں سے لپٹے ہوئے سسک کر بولی۔

''سیفی...... سیفی میری مدد کرو' وہ...... وہ لوگ مجھے مار دیں گے...... پ...... پلیز مجھے بچا لو......''

وہ جو اسے اپنے سامنے اپنا نام پکارتے پا کر ہی بے حد حیران ہو رہا تھا' اب اس کے الفاظ پر اور بھی شاکڈ رہ گیا۔ تب ہی فوراً زمین پر گھٹنے ٹیکتے ہوئے وہ اس کے مقابل بیٹھ گیا' پھر اپنے ہاتھوں سے اس کے بکھرتے آنسو پونچھ کر اسے نہایت بے قراری سے اپنی بانہوں میں چھپا لیا۔ لوگوں کی پھٹی پھٹی حیران نگاہیں ایک شہرہ آفاق سنگر کو ایک معمولی سی پاگل لڑکی پر اس قدر مہربان دیکھ کر ساکت رہ گئیں جب کہ شجاع اور اس کے ساتھی اسے سفیر علی خان کی مضبوط پناہ میں دیکھ کر الٹے پاؤں واپس بھاگ گئے۔

شدید بارش کے بعد ٹھنڈی سرد ہوائیں جسم میں عجیب سی کپکپی دوڑا رہی تھیں تب ہی وہ اس کے نڈھال وجود کو سنبھالتے اپنا گرم کوٹ اس پر اچھی طرح سے لپیٹتے ہوئے اسے اپنی گاڑی تک لے آیا اور اگلے ہی پل ڈرائیور کو گاڑی ہوسپٹل کی طرف لے جانے کا حکم دے دیا جہاں ایمان کے ضروری ٹیسٹ کرنے کے بعد ڈاکٹرز نے انکشاف کیا کہ ایمان ہمدانی کو ہر روز کسی نہ کسی چیز میں معمولی پوائزن دیا جاتا رہا ہے جس کی وجہ سے اس کا معدہ بری طرح سے متاثر ہوا ہے۔ اگر حالات اسی طرح سے جاری رہتے تو عین ممکن تھا کہ وہ اگلے پندرہ بیس دنوں میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی کیوں کہ کھانے میں زہر ہر گزرتے دن کے ساتھ مقدار

بڑھا کر اسے کھلایا جاتا رہا تھا۔

ڈاکٹرز کا یہ انکشاف جہاں ایمان ہمدانی کے لیے شدید اچنبھے کا باعث تھا' وہیں سنجیدہ سے سفیر علی خان کا دل دکھ سے کٹ کر رہ گیا۔ وہ تو ایمان کے کانٹا چبھنا بھی گوارہ نہیں کرتا تھا' کجا کہ وہ پچھلے کئی دنوں سے زہر کھا رہی تھی۔

لوگ شاید سچ ہی کہتے ہیں کہ زندگی میں پیار ہمیشہ انہی لوگوں سے کرنا چاہیے جو آپ کو چاہتے ہیں۔ دلوں کے یہ بندھن ان لوگوں سے کبھی نہیں باندھنے چاہئیں کہ جن کو محض آپ چاہتے ہیں کیوں کہ بعض اوقات ہماری ہی اندھی خواہشیں ایک طمانچے کی مانند ہمارے منہ پر لگتی ہیں اور ہم ان لوگوں کے انتظار میں جن کو ہماری پروا ہی نہیں ہوتی' کھڑے کھڑے پتھر کے ہو جاتے ہیں اور چاہتوں کے حسین موسم گزر جاتے ہیں' مسکراہٹوں کی بیل پر پھر آس کا کوئی ایک پھول بھی نہیں کھلتا اور ہمارے ہاتھ سے گزرتا وقت ہمارے چاہنے والوں کی پر خلوص محبتیں بھی چھین کر لے جاتا ہے۔

وہ بھی اسی حال میں بے بس' جب تین دن مسلسل بے ہوش رہنے کے بعد ہوش میں واپس آئی تو بے حد گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا لیکن خوب صورتی سے سجے ہوئے پر سکون کمرے میں کہیں بھی شجاع یا اس کے دوست نہیں تھے' تب ہی اس نے پر سکون ہو کر سر واپس تکیے پر رکھ لیا' پھر ذرا کی ذرا جو اپنے بائیں طرف نگاہ کی تو بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر فکر مند سے سفیر علی خان کو آنکھیں موندے نیند میں ڈوبا پایا' کمرے میں سردی کا احساس حد سے سوا تھا اور وہ کسی بھی قسم کی شال سے بے نیاز پینٹ شرٹ میں ملبوس کرسی پر بیٹھا سو رہا تھا۔

بند غلافی آنکھیں پیشانی پر بکھرے ریشمی بال' ہونٹوں پر جمی خشکی اور سلوٹوں بھری پینٹ' اس بات کی چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ اس کے لیے بہت پریشان رہا ہے۔ تب ہی ایک عجیب سا درد اس کے دل کو تڑپا گیا اور وہ پلکیں موند کر سسک پڑی۔ سفیر علی خان کی دیوانگی کبھی اس سے مخفی نہیں رہی تھی لیکن وہ جان کر بھی کبھی اس کے جذبات کو حقیقت نہ سمجھ سکی پھر جب وہ نیند سے جاگا تو ایمان کو ہوش میں دیکھ کر ایک دم سے اس کا کملایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔

''اب کیسی ہیں آپ؟''

لبوں پر دھیمی سی مسکان پھیلا کر اس نے نہایت اپنائیت کے انداز میں پوچھا تھا۔

جواب میں ایمان کی پلکوں پر اٹکے آنسو ٹوٹ کر گالوں پر بہہ نکلے اور وہ سر کو ہلکی سی جنبش دے



کر قدرے بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''مجھے معاف کر دو سیفی' میں نے تمہارے ساتھ بہت غلط کیا۔ تمہارے جذبات کو غلط سمجھا۔ اپنی سراب محبت کے پیچھے بھاگتے بھاگتے میں نے تمہاری محبت کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا اور تمہارا دل دکھایا' پلیز مجھے معاف کر دو۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ایمان جی......؟ میں نے تو کبھی آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانا' کبھی یہ نہیں سوچا کہ آپ نے میرے ساتھ کچھ غلط کیا ہے' ہاں آپ کی سرد مہری اور لاپروائی نے مجھے ہر پل بے کل کیا' آپ کے ایک ایک آنسو نے میرے جگر کو تکلیف پہنچائی لیکن آپ اپنے عمل میں درست تھیں اور میں اپنے عالم میں...... پتہ ہے ایمان جی' اس دنیا میں چھوٹا یا بڑا کوئی بھی نہیں ہوتا' ہر انسان قابل تحسین ہے' اگر اسے تھوڑا سا پیار' تھوڑی سی اپنائیت اور تھوڑا سا ساتھ ملے' بہر حال میں نے کبھی آپ سے کسی غرض کے تحت محبت نہیں کی اور نہ ہی کبھی یہ سوچا ہے کہ آپ بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کریں کہ کتنی محبت میں آپ سے کرتا ہوں بلکہ میں نے جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہیں ہمیشہ آپ کی سلامتی' صحت مندی اور دائمی خوشیوں کی بھیک ہی مانگی ہے۔''

''ت......تم بہت عظیم ہو سیفی' لیکن میں' کبھی اتنی عظیم نہیں رہی۔ میں نے ہمیشہ چھوٹے پن کا مظاہرہ کیا' ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر شعلوں کو ہاتھ میں لے بیٹھی میں اور آج دیکھ لو' ان شعلوں نے جلا کر مجھے راکھ کر دیا۔'' آنسو ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے' تب ہی سفیر علی خان نے لب بھینچ کر نگاہ اس کے چہرے سے ہٹا لی۔

''فار گاڈ سیک ایمان......اب اس رونے سے کچھ حاصل نہیں' تاہم شجاع آفندی کو میں نے اس کے کیے کی سزا دلوا دی ہے اور اس کے پاس آپ کا جتنا بھی روپیہ محفوظ تھا وہ سب واپس آپ کے پاکستانی اکاؤنٹ میں ڈلیور کروا دیا ہے اب آپ کو کسی بھی بات کو لے کر پریشان یا خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں......''

قطعی بے غرض لہجے میں وہ کہہ رہا تھا اور ایمان کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر اظہار تشکر سے چھلک پڑیں۔

''تھینک یو سیفی' تھینک یو سو چ۔ اب پلیز مجھ پر ایک آخری احسان اور کر دو' مجھے فوراً پاکستان پہنچا دو' پلیز......''

"اوکے..... لیکن اب آپ قطعی آنسو نہیں بہائیں گی۔"

"ہاں سیفی! میں نے زندگی سے ہمیشہ آنسو ہی کشید کیے ہیں، ہنستی مسکراتی اس زندگی میں ادھیڑ ادھیڑ کر غموں کو ہی کھوجا ہے، میں نے کبھی مسکرانا تو سیکھا ہی نہیں لیکن اب میں مسکراؤں گی سیفی! اپنے اکیلے پن پر، اپنی تنہائیوں پر، اپنی نادانیوں پر اور اپنے گھر کے سونے درودیوار پر۔"

"نہیں ایمان! اب آپ خدا کی ذات سے مایوس نہیں ہوں گی، ویسے بھی رمضان المبارک کی مقدس ساعتیں قریب ہیں، آپ کو اس مقدس ماہ میں اللہ بزرگ و برتر کے حضور سربسجود ہو کر رمضان المبارک کو پورے خضوع وخشوع کے ساتھ خوش آمدید کہنا ہے اور پھر ہمیشہ کی طرح ہنستے مسکراتے ہمدانی ہاؤس کے خوب صورت درودیوار میں عیدالفطر کی خوشیوں کو سیلبریٹ کرنا ہے...... اور اس کے بعد میری ہونے والی، خوب صورت وائف سے مل کر میرے انتخاب پر ریمارکس دینے ہیں۔" وہ قطعی فریش لہجے میں کہہ رہا تھا جبکہ ہونق سی ایمان ہمدانی چونک کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اس کی بات پر سماعتوں کو یقین ہی نہ آیا ہو، دل میں نجانے کیوں درد کی ایک ٹیس سی اٹھی اور وہ نگاہیں جھکا کر رہ گئی۔



پھر وہ لوگ پاکستان واپس پہنچ گئے، اپنے وطن کی خوب صورت فضاؤں میں گھلی مسرور سی خوشبو نے اسے بے تاب کر دیا اور وہ پیاسی نگاہوں سے ہزاروں بار دیکھے مناظر کو بغور دیکھتے ہوئے پھر سے رو پڑی۔ اردگرد مقدس ماہ کی پورے جوش وخروش کے ساتھ تیاریاں ہو رہی تھیں، بازاروں کو دلہنوں کی طرح سجا دیا گیا تھا، روشن قمقموں نے دکانوں کی خوب صورتی کو چار چاند لگا دیئے تھے اور وہ ایک ایک منظر کو دیکھ کر مسرت سے بے حال ہو رہی تھی۔ سفیر علی خان نے فوری طور پر اسے ہمدانی ہاؤس بھیجنے کی بجائے اپنے بنگلے میں ہی ایک کمرہ دے دیا۔ پورے دن وہ اپنی مصروفیات میں الجھا رہتا، پھر رات کو بہت دیر سے گھر واپس لوٹتا تو ایمان نماز تراویح پڑھنے کے بعد سو چکی ہوتی، وہ کبھی روزے نہیں رکھتا تھا لیکن ایمان کو دیکھ کر رکھنے لگا پھر ایمان نے ہی اسے نماز باقاعدگی سے پڑھنے کی عادت ڈلوائی اور مسجد میں نمازِ تراویح پر بھی اس نے ہی اصرار کیا تھا۔ نتیجتاً اب وہ پانچ ٹائم کی نماز وقت پر ادا کر رہا تھا اور اس پر بے پناہ خوش بھی تھا۔



پہلے وہ سحری کے وقت اس کے ملازم کے ہاتھ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے کے باوجود بھی روزہ رکھنے کے لیے نہیں اٹھتا تھا اور سو بہانے بنا کر سویا رہتا لیکن اب وہ اس کے کچن سے نکلنے سے پہلے ہی اٹھ کر کچن میں چلا آتا اور ایمان کے ساتھ سحری کھا کر روزے کی نیت باندھتا۔

زندگی ایک دم سے بہت پرسکون ہو گئی تھی جب ایک روز سفیر علی خان نے اس کے دل میں پھر سے ہلچل مچا دی۔ سفیر نے اسے بتایا کہ وہ عین عید کے دن اپنی ہونے والی بیگم کو اس سے ملوانے کے لیے لا رہا ہے اور اس کے انہی الفاظ نے اسے بے کل کر دیا تھا۔ عید میں فقط دو ہی تو دن رہ گئے تھے اور وہ پورے دن بے اختیار ہی بات بے بات روتی رہی اور سجدے میں جا کر خدا سے اپنے دل کے سکون اور صبر کی دعائیں مانگتی رہی۔ اس پورے دن اس نے بے ارادہ ہی سفیر علی خان سے بھی کوئی بات نہیں کی اور لبوں پر چپ کا قفل لگائے رکھا، پھر چاند رات کو وہ زبردستی ہی اسے عید کی شاپنگ کے لیے لے گیا اور خوب شاپنگ کروائی۔ عیدالفطر کا پررونق دن بھی اپنی تمام تر دلکشیوں کے ساتھ طلوع ہوا لیکن وہ پورے دن اداس رہی اور پھر نماز عید کے بعد جب سفیر نے اسے زبردستی تیار ہونے پر مجبور کیا تو وہ رو ہی تو پڑی، تب ہی سفیر نے اس کی سرخ آنکھوں کو بغور دیکھتے ہوئے مسکرا کر فریش لہجے میں کہا۔

"یہ کیا ایمان جی، آپ ایسے موڈ کے ساتھ میری بیگم سے ملیں گی تو وہ آپ کے بارے میں کیا سوچیں گی۔ پلیز تھوڑا سا تو فریش ہو جائیں اور ہاں، میری ہونے والی بیگم میری پہلی محبت، یعنی کہ ایمان ہمدانی کی مانند کھلتا ہوا گلاب تو نہیں ہے لیکن وہ میری زندگی ہے ایمان جی، اس لیے وہ اگر آپ کو اچھی نہ بھی لگے تو پلیز اس کا اظہار مت کیجیے گا۔"

وہ اس کے ضبط کا مسلسل امتحان لیتے ہوئے اسے ذہنی طور پر ٹارچر کر رہا تھا جب کہ ایمان چاہے جانے کا غرور کسی اور کی جھولی میں گرتے دیکھ کر دکھ سے کٹ رہی تھی پھر جس وقت وہ مکمل تیار ہو گئی تو اس کے حسین سراپے کو پرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ اس کا نازک سا ہاتھ تھام کر کمرے سے باہر لے آیا اور اس سے پہلے کہ وہ ضبط کھو کر رو پڑتی، وہ اسے ٹی وی لاؤنج سے ہوتے ہوئے اپنی پرسنل لائبریری میں لے آیا جہاں جگہ جگہ صرف ایمان کی ہی تصویریں پینٹ کر کے لگائی ہوئی تھیں۔ کہیں کھل کھلاتے ہوئے تو کہیں آنسو بہاتے ہوئے، ہر تصویر اتنی خوب صورت تھی کہ وہ حیرانی سے دیکھتے ہوئے ششدر رہ گئی۔

''سیفی...... یہ...... یہ سب کیا ہے......؟'' قطعی گم صم سے لہجے میں اس نے کہا تھا' جواب میں بے پناہ خوش سفیر علی خان دھیمے سے مسکرا اٹھا۔

''یہی میری ہونے والی وائف ہیں ایمان جی' اسی کی آنکھوں میں دیکھ کر میں اپنے زندہ ہونے کا احساس پاتا ہوں۔''

''ت ......تم نے جان بوجھ کر مجھے ستایا' دھوکے باز' بے ایمان......'' سفید کملایا ہوا چہرہ پل میں رنگین ہوگیا جب کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اپنا پیار بھی تو آزمانا تھا ناں ایمان' وگرنہ آپ بھلا مجھے کہاں لفٹ دینے والی تھیں۔'' روشن آنکھوں میں اس کا حسین سراپا بھرتے ہوئے وہ متبسم لہجے میں بولا تو ایمان گھور کر خفگی سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے پھر اسی کے کندھے سے لگ کر رو پڑی کہ خدا کی پاک ذات نے واقعی اس عید کو اس کے لیے یادگار اور انعام بنا دیا تھا جب کہ مسرور سے سفیر علی خان نے مکمل استحقاق سے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا کہ اب سچی خوشیاں واقعی اس سے بہت دور نہیں تھیں۔

